گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اکتوبر 2011
معراج جمیل
عید نمبر 2
PDFBOOKSFREE.PK
عمیرہ احمد
کا ناول عکس اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار ........ معاون: آمنہ حماد


## اداریہ


مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15


## سلسلے وار ناول


عکس — عمیرہ احمد 18

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں — شیریں حیدر 88

ایک تھی نیناں — راحت وفا 130

خوشبو کا سفر — عالیہ بخاری 206


## ناولٹ


قربتوں کی دوری — رضوانہ پرنس 168

عید مبارک — ناہید سلطانہ اختر 53

محبت کی شام — سدرۃ المنتہیٰ 248


## افسانے


پھیکی نہیں میٹھی عید — بشریٰ نثار 49

جہاں ہم ہیں — نصرت شمشاد 83

تم ملو تو عید ہو — تحسین اختر 119

دیوانگی کے صحرا میں — عروسہ وحید 159

روگ — سعدیہ رئیس 195

چلیں گے ساتھ مل کر ہم — عروسہ عالم 229

جینا ہے — ثریا انجم 235


## مستقل عنوانات


دین کی باتیں — ادارہ 16

بہنوں کی محفل — مدیرہ 269

پاکیزہ ڈائری — عظمیٰ آفاق سعید 287

میں اکثر گنگناتی ہوں — صغریٰ زیدی 291

میرا انتخاب — آمنہ حماد 293

جلترنگ — انجم انصار 296

کون کیا کر رہا ہے — مہتاب خان 300



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

سندیسے — پاکیزہ بہنیں 304

خوش ذائقہ — پاکیزہ بہنیں 306

روحانی مشورے — ادارہ 308

ہومیو کلینک 310



شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد ... 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رضوان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور فرزند علی ... 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528

ٹائٹل ڈیزائن: شاہد فوٹوگرافر: موسیٰ رضا ماڈل: مہوش

جلد 39 • شمارہ 07 • اکتوبر 2011 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# عکس

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خود کشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے۔ جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں گنگ کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔

نئے صاحب یعنی شیر دل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا کبھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔

اب آگے پڑھیں۔

### قسط نمبر 3

ایبک اس شیول مرر کے سامنے کھڑا اپنا ریکٹ گھماتے گھماتے رک گیا تھا۔ یہ آئینے میں ابھرنے والا ایک عکس تھا جس نے اسے روکا تھا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ چہرہ ساری عمر ہر بار سامنے آنے پر اسی طرح فریز کر دیا کرے گا۔ اس نے چڑیا کو پہلی بار اسی آئینے میں دیکھا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ چڑیا پچھلے کئی دنوں سے اسے کئی بار دیکھ چکی تھی۔ ٹینس کورٹ پر صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلتے لان میں صاحب کی بیٹی اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلتے Frisbee پکڑنے میں ناکامی پر اپنے چھوٹے بہن بھائی پر چلاتے اور خفا ہوتے ہوئے وہ صاحب کے گھر آئے ہوئے مہمان تھے اور صاحب کے گھر ویک اینڈ پر مہمانوں اور ان کے ساتھ ان کے بچوں کا آنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر یہ صاحب کے ہاں لمبی چھٹیاں گزارنے کے لیے آئے ہوئے مہمان تھے۔

صاحب کے گھر کا سناٹا ان تین، بہن بھائیوں کی سرگرمیوں سے ٹوٹنے لگا تھا جن میں سے ایبک سب سے بڑا تھا..... آٹھ سالہ وہ بچہ اپنے قد و قامت سے دس سال کا لگتا تھا وہ جب بھی گھر سے باہر نظر آتا اس کے ہاتھ میں زیادہ تر ٹینس ریکٹ ہی ہوتا جسے وہ بے مقصد گھماتا، ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرتا رہتا کبھی کبھار اس کی چھ سالہ بہن اس کے ساتھ ٹینس کھیلتی لیکن وہ کسی بھی اعتبار سے ایبک کا مقابلہ نہیں کر پاتی تھی۔ وہ جسمانی طور پر بہت مضبوط تھا لڑکا تھا بہن سے عمر میں دو سال بڑا تھا اور ٹیکنیک کے اعتبار سے بہت Sound تھا اور پانچ سال کی عمر سے ٹینس ریکٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ ٹینس جیسے ان کا خاندانی



کھیل تھا، ان کی ننھیالی اور ددھیالی فیملی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ٹینس نہ کھیلتا ہو مگر ان میں سے کسی میں بھی ٹینس کے لیے ایک جیسا پیشن نہیں تھا وہ سوئمنگ کرتا تھا یا پھر ٹینس کھیلتا تھا اور اس گھر میں آنے کے ایک ہفتے میں ہی چڑیا یہ جان چکی تھی۔

ایبک کے آنے کے بعد صاحب باقاعدگی سے شام کے وقت اس کے ساتھ لان میں ٹینس کھیلا کرتے کبھی کبھار ایبک کی ممی، بہن، بھائی اور صاحب کی بیوی اور بیٹی بھی وہاں موجود ہوتے لیکن عام طور پر صرف صاحب اور ایبک ہی کھیل رہے ہوتے اور صاحب مسلسل ایبک کو ہدایات دے رہے ہوتے۔ ایبک صاحب سے کبھی جیت نہیں پاتا تھا لیکن کبھی کبھار وہ کوئی اچھا شاٹ مار دیتا اور صاحب اس شاٹ کو Miss کر دیتے اور تب کورٹ میں فاتحانہ انداز میں چلانے والا صرف ایبک نہیں ہوتا تھا کسی پودے یا درخت کے پیچھے چھپی ہوئی چڑیا بھی اتنی ہی مسرور ہوتی تھی اور اس کے سات بونے بھی وہ انھوں اس کے اس اتفاقی شاٹ کو بھی اس طرح سلیبریٹ کرتے جیسے وہ ایک پوائنٹ نہیں میچ جیت گیا ہو۔ ایبک چڑیا کو کیوں اچھا لگا تھا؟ اس وقت اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ Awe میں تھی۔ اس وقت تک وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کا ہم عمر تھا..... اس کے لیے متاثر ہونے کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ ٹینس کھیلتا تھا اور بہت اچھی کھیلتا تھا اور جب وہ فریزبی پھینکتا تھا تو کوئی نوکر بھی اس کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ ان تین بچوں کا سردار تھا جو اس وقت اس گھر میں تھے اور وہ جس طرح ان تینوں بچوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ایک آٹھ سالہ بچہ نہیں لگتا تھا۔

چڑیا، صاحب کے ریکٹ کو دیکھ کر ہمیشہ فیسینیٹ ہوتی تھی لیکن وہ کبھی خواہش کے باوجود اس ریکٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکی۔ اس کے ساتھ کھیلنا تو خیر بہت دور کی بات تھی۔ اس وقت تک اسے وہ ٹینس ریکٹ بہت ہلکی پھلکی کوئی چیز لگتا تھا کیونکہ اس نے صاحب کو اسے ایک ہلکی پھلکی چیز ہی کی طرح اٹھائے اور کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ اس ریکٹ کو موقع مل جانے پر اٹھا کر گھما بھی نہیں سکے گی۔

ایبک اپنا ریکٹ اکثر لان میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور موقع ہونے کے باوجود چڑیا اس ریکٹ کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتی تھی، اسے خوف ہوتا تھا کہ ایبک کسی بھی وقت دوبارہ نمودار ہو سکتا تھا اور چند بار واقعی ایسا ہوا تھا کہ وہ ہمت کر کے اس ٹیبل کے پاس جانے کی تیاری کر رہی ہوتی جہاں ایبک اپنا ریکٹ چھوڑ کر گیا تھا اور ایبک کھانے پینے کی کوئی چیز لیے یک دم دوبارہ لان میں آ جاتا۔ وہ ہمیشہ اتنے دبے قدموں آتا تھا کہ چڑیا اس سے خائف رہنے لگی تھی اسے لاشعوری طور پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ جب بھی اس کے ریکٹ کو پکڑنے کے لیے اس ٹیبل کے پاس جائے گی۔ ایبک وہاں آ جائے گا۔

وہ اب پہلے کی طرح کیاریوں میں سے ٹینس بالز بھی نہیں نکال پاتی تھی کیونکہ ایبک کھیل ختم ہونے کے بعد تمام بالز خود ڈھونڈھ کر ٹینس بالز کے ڈبے میں بالز پوری کر کے ہی لان سے روانہ ہوتا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کی ایک سب سے پسندیدہ سرگرمی چھین لی تھی لیکن اس کے باوجود چڑیا کو ایبک اچھا لگتا تھا۔ وہ اکیلے ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرتے ہوئے کورٹ پر خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا چڑیا اور اس کے سات بونے اس کی ان خود کلامیوں سے محظوظ ہوتے رہتے۔ چڑیا نے پہلی بار اپنے علاوہ کسی دوسرے کو خود سے گفتگو کا شوقین پایا تھا اور ایبک کے لیے اس کی پسندیدگی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار اس کی باتیں سنتے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے اس کا دل چاہتا وہ ان کی باتوں کا جواب دے اور وہ دیتی بھی لیکن سرگوشی میں اپنے بونوں کو۔ لیکن ایبک کی وہ ساری باتیں، جھلاہٹیں، خودکلامیاں چڑیا کے لیے جیسے ایک شاندار تفریح تھی۔ وہ اس کی Vocabulary بڑھا رہا تھا...... ایبک کے منہ سے سننے والا ہر نیا لفظ وہ خیر دین کے سامنے رکھ دیتی تھی اور ان میں سے زیادہ تر لفظ خیر دین کے لیے بھی نئے تھے۔ چڑیا خیر دین کو یہ نہیں بتاتی تھی کہ اس نے وہ لفظ کہاں سنا تھا لیکن وہ خیر دین کی لاعلمی اور کم علمی کو کسی اعتراض کے بغیر قبول کر لیتی تھی۔

بعض دفعہ ایبک کو اپنے بہن بھائیوں یا اکیلے کھیلتے ہوئے دیکھ کر چڑیا کا بے تحاشا دل چاہتا تھا کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ جا کر کھیلنے لگے۔ ایبک کی اچھالی ہوئی ہوا میں اڑتی اس فریزبی کو جسے کوئی پکڑ نہیں پاتا وہ پکڑ لے۔ ایبک کی ٹینس Serve کو وہ دوسرے کورٹ سے اتنی ہی طاقت کے ساتھ Return کرے جس قوت سے وہ پھینکی گئی تھی اور اسے یقین تھا وہ ایسا کر سکتی تھی۔ ایک بچے کی معصومیت اور خوش فہمی اسے یہ بتا ہی نہیں پا رہے تھے کہ کھیل کھیلنے اور اچھا کھیلنے کے لیے صرف خواہش اور موقع نہیں Skill کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹینس کا وہ ریکٹ جسے ایبک بڑی آسانی سے گھماتا اور ہلاتا نظر آتا تھا اس کے پیچھے Will نہیں Skill ہی اس کے تین سالوں کا تجربہ تھا۔ فریزبی کی وہ ڈسک تھی جو ہوا میں تیرتی کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے بھی اسی طرح چھوٹ کر گرتی جس طرح دوسروں کے ہاتھوں سے...... لیکن بچے آدھی زندگی اور آدھی خواہشات خوابوں اور فینٹسی میں پوری کرتے ہیں...... نہ پولین کی ڈکشنری میں ناممکن کا لفظ تھا نہ اس کی زندگی میں ہوتا ہے...... اور چڑیا کے ساتھ تو سات دوست ہونے بھی تھے۔

''نانا جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں ٹینس کی پلیئر بنوں گی۔'' ایبک کے آنے کے چند دنوں کے بعد ایک دن چڑیا نے خیر دین سے ریکٹ کی فرمائش کرتے ہوئے اسے اپنے کیریئر میں تبدیلی کا عندیہ دیا۔

''نہیں بیٹا لڑکیاں ٹینس نہیں کھیلتیں۔'' خیر دین نے فوراً اسے ٹوکا۔

''ٹی وی پر تو کھیلتی ہیں...... وہ جو ومبلڈن ہوتا ہے۔'' چڑیا نے پی ٹی وی پر دیکھے جانے والے کسی میچ اور ٹورنامنٹ کی اسے یاد دلائی۔

''ہاں پر وہ تو انگریزوں کے ملک میں ہوتا ہے اور انگریز عورتیں کھیلتی ہیں۔'' خیر دین جواب دیتے ہوئے صاحب کی بیوی اور اب ایبک کی ممی کو بھول گیا تھا چڑیا نہیں، اس نے خیر دین کو یاد دلانے میں دیر نہیں کی۔

''بیٹا وہ صاحب لوگ ہیں، وہ کھیل سکتے ہیں ہم نہیں کھیل سکتے۔'' خیر دین نے بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ چڑیا کو اب بار بار صاحب اور اپنی کلاس کا فرق سمجھاتا اور بتاتا خیر دین کو بڑا مشکل لگتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے کیونکہ ساری عمر وہ چڑیا کے سامنے ایک ''بڑا آدمی'' بنا رہا تھا اور اب اس بڑے آدمی کو اس بچی کے سامنے یہ خول اتارنا پڑ رہا تھا اور یہ آسان نہیں تھا مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے اپنی استطاعت سے بڑھ کر کھلا پلا رہا تھا۔ اسے انگلش میڈیم اسکول بھی بھیج رہا تھا۔ اس انگلش میڈیم اسکول میں جہاں اس جیسا آدمی اپنی اولاد کو بھیجنے کے صرف خواب دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ چڑیا کے پاؤں زمین پر بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اس کو پرواز سے روکنا چاہتا تھا۔

''بہت سارے کام صاحب لوگ کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں۔'' ...... چڑیا کو اس فلاسفی کی سمجھ آ گئی تھی یا



نہیں لیکن یہ ایک جملہ اس نے کسی طوطے کی طرح اپنے سسٹم میں بغیر بحث کے فیڈ کیا تھا۔

خیر دین نے اسے کیریئر بدلنے کی اجازت تو نہیں دی تھی لیکن اگلے دن اس کو ایک ریکٹ لا دیا تھا...... وہ بیڈمنٹن ریکٹ تھا۔ لکڑی کا ایک معمولی سا...... کم قیمت...... پہلی نظر میں ہی چڑیا نے اس ریکٹ کو ناپسند کر دیا تھا...... لیکن اس نے اپنی ناپسندیدگی خیر دین تک نہیں پہنچائی تھی...... بھاری دل کے ساتھ اس نے وہ ریکٹ اٹھا لیا تھا اور اس نے اس کے ساتھ چند بار اس گیند کو ہٹ کرنے کی کوشش کی تھی جو خیر دین ریکٹ کے ساتھ لے کر آیا تھا...... تیسرے یا چوتھے شاٹ پر ریکٹ کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ چڑیا نے بوجھل دل کے ساتھ وہ بیٹ اٹھا کر کمرے میں پڑی اکلوتی سیف کے اوپر رکھ دیا۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ بعض چیزیں صرف صاحب لوگ کیوں کر سکتے ہیں وہ کیوں نہیں۔

اس شام اس آئینے میں دیکھے جانے سے پہلے ایبک نے کبھی چڑیا کو اس گھر میں نہیں دیکھا تھا اور اب یہ دم اس آئینے میں ابھر آنے والے ایک ہم عمر کے عکس نے اسے حیران کیا تھا۔ اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ریکٹ کے ساتھ ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرنا اس کا روز کا معمول تھا اور اسے پریکٹس کرتے دیکھنا چڑیا کا۔ پہلی بار اس نے اتفاقی طور پر ایبک کو اس وقت شام کو اس آئینے کے سامنے موجود پایا تھا جب وہ ہمیشہ اپنے معمول کے مطابق شام کے وقت اس آئینے میں ''کچھ'' دیکھنے آئی تھی اور جو کچھ اسے نظر آیا تھا اس نے چڑیا کو بے حد محظوظ کیا تھا۔ ایبک آئینے کے سامنے کھڑا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ریکٹ کو گھماتا پھر رہا تھا۔ وہ آئینے میں کسی کھلاڑی کے کھیل کے انداز کی نقل اتار رہا تھا نہ صرف کھیل کے انداز کی بلکہ اس کھلاڑی کے کھڑے ہونے، سر جھٹک کر اور کندھے اچکا کر بات کرنے کی بھی...... وہ ریکٹ کو ایک کپ کی طرح پکڑے جیسے ومبلڈن سینٹر کورٹ پر کھڑا چیمپئن شپ جیتنے کے بعد تقریر کر رہا تھا۔ وہ کس کھلاڑی سے متاثر تھا اور کس کی نقل کر رہا تھا چڑیا کو کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن ایبک کے اس ڈرامہ کے ''Skit'' یا ''رول پلے'' کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اور ایبک کو اگر یہ پتا چل جاتا کہ اس کی وہ ونرز اسپیچ کسی کو اس طرح گدگدا رہی تھی تو وہ شرم سے ڈوب کر مر جاتا، بونوں کو دیکھنے کی خواہش کے علاوہ اب چڑیا اس آئینے کے سامنے ایبک کے ''Acts'' دیکھنے بھی آتی تھی۔ وہ ہر روز وہاں نہیں ملتا تھا لیکن اکثر وہاں مل جاتا تھا۔

اور آج اس آئینے میں پہلی بار ایبک نے چڑیا کو دیکھ لیا تھا۔ برآمدے میں رکھے گئے اس آئینے کی پوزیشن صفائی کے دوران کچھ تبدیل ہوئی تھی اور برآمدے کے ایک ستون پر چڑھی بوگن ویلیا کے ساتھ چھپی اندر جھانکتی چڑیا جو آئینے کی پہلی پوزیشن میں نظر نہیں آ سکتی تھی اب بڑی آسانی سے نظر آ گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ پلٹ کر اپنے عقب میں اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اور اس آئینے میں فاصلہ بے حد کم تھا۔ چڑیا کچھ دیر کے لیے جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑی جا سکتی ہے اور پکڑی گئی کیسے تھی وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایبک اب اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ مُتجسس...... حیران...... مسکراتی ہوئی نظریں...... چڑیا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ فوری طور پر کیا کرے...... برآمدے کے ستونوں کی آڑ میں بھاگتی ہوئی فرار ہو جائے...... ایبک کے سامنے آ جائے یا آہستہ سے اپنی کسی چڑیا کی طرح نکلی ہوئی گردن کو اسی آہستگی کے ساتھ واپس کھینچ کر ستون کے عقب میں چھپ جائے...... یہاں تک کہ ایبک وہاں سے چلا جاتا۔ اسے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیصلہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ یہ کام ایبک نے کیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھ آیا تھا۔ اب وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چڑیا اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اپنی گردن ستون کے پیچھے سے نکالے ہوئے تھی۔ اب ایبک کے بالکل سامنے آجانے پر وہ گھٹنوں سے ہاتھ اٹھا کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی اور کفا، مفامنتوں میں کہیں غائب ہوگئے تھے حد تھی ویسے یہ بھی۔

''ہیلو۔'' ایبک نے دوستانہ انداز میں اس کو مخاطب کرنے میں پہل کی اور چڑیا کو اس سے ہیلو سننے کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے حیران ہو کر ایبک کو دیکھا پھر اس نے جواباً ہیلو کہا۔ بھاگنے کا ارادہ اس نے فی الفور ترک کر دیا تھا۔

''تم کون ہو؟'' ایبک نے فوراً سے پیشتر کہا۔ چڑیا کے حلیے سے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی نوکر کی بیٹی ہوسکتی ہے اور کسی ملازم کے بچے میں ایبک دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ یہ اس کے پیرنٹس کی ہدایات تھیں۔ اس کے پیرنٹس ملازمین کو ہی فاصلے پر نہیں رکھتے تھے، ان کی فیملیز کو بھی اپنی فیملیز سے فاصلے پر رکھنے میں یقین رکھتے تھے اور ایبک اسی طرح کی ویلیوز کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا۔

چڑیا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنا تعارف کیسے کروائے۔ ''میرے نانا کک ہیں۔'' چند لمحے الجھ کر اس نے بالآخر کہا۔

''اوہ خیر دین۔'' ایبک نے بے ساختہ کہا۔ چڑیا کو اس کے منہ سے یوں اپنے نانا کا نام اچھا نہیں لگا تھا۔ خیر دین کو دوسرے ملازمین چاچا کہتے تھے اور آفیسرز نام سے پکارتے تھے لیکن اس نے آج تک کسی بچے کو خیر دین کا نام لیتے نہیں سنا تھا۔

''چاچا خیر دین۔'' اس نے جیسے برا منا کر ایبک کو جتانے والے انداز میں بتایا۔ ایبک نے اس کی خفگی نوٹس نہیں کی تھی۔ چڑیا میں اس کی دلچسپی فوری طور پر کم ہوئی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ایبک نے ریکٹ گھماتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ وہاں کیا کر رہی تھی، یہ تو چڑیا ایبک کو مر کر بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟'' ایبک نے اسے ڈانٹا۔

''میں یہ مرر دیکھنے آئی تھی۔'' چڑیا نے بے ساختہ کہا۔ ایبک نے حیرانی سے پلٹ کر مرر کو دیکھا۔

''کیوں؟''

''یہ پسند ہے مجھے۔'' جواب سادہ تھا لیکن ایبک پھر بھی حیران ہوا تھا۔

''کیا کرتی ہو تم؟'' ایبک نے جواباً اس سے پوچھا۔

''پڑھتی ہوں۔''

''کس کلاس میں؟''

''4th۔''

''کس اسکول میں؟'' اور اسکول کے نام نے ایبک کو چند لمحوں کے لیے کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ نوکروں کے بچے کانونٹ میں نہیں پڑھتے تھے اور چڑیا پڑھ رہی تھی۔ اس کی اپنی بہن بھی ایک کانونٹ اسکول میں ہی تھی۔ ایک بچہ ہونے کے باوجود وہ ایک ''اچھے'' اور ''برے'' اسکول کا فرق جانتا تھا ...... اردو میڈیم اور انگلش میڈیم کی تفریق اور ریٹنگ سے بخوبی واقف تھا۔

''میں بھی 4th میں ہوں...... ایچی سن میں۔'' اس نے اب اپنے بارے میں چڑیا کو بتایا۔

''اوہ...'' چڑیا حیران ہوئی۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ بھی کلاس فور کا اسٹوڈنٹ ہوگا اور اس نے یہ کہنے میں تامل بھی نہیں کیا۔ ایبک پہلے خجل ہوا پھر بلش۔

''کتنا بڑا لگتا ہوں میں؟'' اس نے جیسے اپنے کسی خدشے کو جھٹلانے کے لیے چڑیا سے پوچھا۔

''پتا نہیں لیکن تم مجھ سے بڑے لگتے ہو..... جیسے 5th، 6th اسٹینڈرڈ میں ہو۔'' چڑیا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''That,s because I,m a boy۔'' ایبک نے اپنی خفت مٹانے کی کوشش میں بڑی رکھائی سے کہا۔ وہ اب چڑیا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ آئینے کے سامنے جا کر اپنے ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرنے لگا تھا۔ چڑیا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے ...... لیکن اس کی موجودگی سے پوری طرح باخبر ...... چڑیا دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے باندھے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی ...... اب چھپنے کی ضرورت نہیں رہی تھی ...... اور کیا طمانیت محسوس کی تھی اس نے۔

''You Play Very Well۔'' چند منٹ کی خاموشی کے بعد چڑیا نے اس تک اپنی ستائش پہنچانا ضروری سمجھا۔ ریکٹ گھماتا ایبک کا ہاتھ چند لمحوں کے لیے رکا۔

''Thank You'' وہ دوبارہ پریکٹس کرنے لگا۔ وہ چڑیا کی نظریں آئینے میں بھی خود پر جمی نوٹس کر رہا تھا اور اس احساس نے جیسے اس کی پریکٹس کے انہماک کو بڑھا دیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک فین مل گیا تھا اسے ...... اور یہ اپنے خاندان سے باہر ملنے والا اس کا پہلا فین تھا۔ اس آٹھ سالہ بچے کے لیے فوری طور پر یہ تعریف ہضم کرنا تھوڑا مشکل ہوگیا تھا۔

''تم نے کبھی کورٹ میں دیکھا ہے مجھے؟'' اس نے یک دم چڑیا کے ساتھ گفتگو جاری رکھنا ضروری سمجھا۔

''بڑا نظر آنے'' کا غم تھوڑی دیر کے لیے ہلکا پڑ گیا تھا۔

''روز دیکھتی ہوں جب تم کورٹ میں کھیلنے کے لیے جاتے ہو۔'' چڑیا نے روانی سے کہا۔ ایبک کے سر پر اچانک نمودار ہونے والے سرخاب کے پروں میں ایک اور پر کا اضافہ ہوگیا تھا۔

''میں نے کورٹ میں کبھی نہیں دیکھا تمہیں ...... تم کہاں سے دیکھتی ہو مجھے کھیلتے ہوئے۔'' ایبک نے بے حد لوجیکل سوال پوچھا تھا۔ اس نے واقعی اتنے دنوں میں ایک بار بھی چڑیا کو نہیں دیکھا تھا۔ اس بار بلش ہونے کی باری چڑیا کی تھی۔

''ہمارا کوارٹر ہے پیچھے ...... میں وہاں سے دیکھتی ہوں۔'' وہ پہلے ہکلائی پھر اس نے گول مول انداز میں کہا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ جھاڑیوں اور پودوں میں اپنے ساتھی بونوں کے ساتھ چھپ کر وہ سارے میچز اور ایبک کی سرگرمیاں دیکھتی تھی۔

''سرونٹ کوارٹرز تو پیچھے ہیں اور بہت دور ...... وہاں سے کیسے نظر آجاتا ہے؟'' ایبک نے حیران ہو کر کہا تھا۔ اس بار چڑیا جواب نہیں دے سکی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم کہیں اور سے دیکھتی ہو۔'' ایبک نے پورے یقین سے کہا۔ ''اور چھپ کر۔'' چڑیا کا چہرہ رنگین ہو گیا اسے اندازہ نہیں تھا ایبک کا اگلا اندازہ یہ ہوگا۔ وہ چیس کے Knight کی چال تھی سیدھے سے الٹی بے حد اچانک اور بظاہر سادہ پر انتہائی کاری اور چیس کا Knight چڑیا کا پسندیدہ ترین مہرہ تھا کوئین کے بعد خیردین کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ سب سے پہلے خیردین کے Knight پکڑنے کی کوشش کرتی تھی باقی مہروں سے اس کو نہ اتنا شغف تھا نہ خوف لیکن Knight سے اس کی عجیب Love - Hate Relationship تھی تو اس دن چڑیا نے ایبک کو چیس کا Knight بنا لیا تھا۔

''کہاں سے چھپ کر دیکھتی ہو؟'' Knight نے ایک اور مہلک چال چلی۔

''پودوں کے پیچھے چھپ کر۔'' کوئین نے ہتھیار ڈالے۔ ایبک فخریہ انداز میں مسکرایا۔

''چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ویسے بھی دیکھ سکتی ہو۔'' اس نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔ چڑیا کا چہرہ چمک اٹھا..... وہ یہ بھول گئی تھی کہ یہ ایبک کا گھر نہیں تھا۔ یہ اس کے انکل کا گھر تھا اور وہ پابندیاں جو اس پر لگی تھیں، وہ وہی اٹھا سکتے تھے۔

''تم کو ٹینس کھیلنا آتا ہے؟'' ایبک نے یک دم اگلا سوال کیا۔ یہ جیسے ایک پارٹنر کی تلاش تھی۔ اس کے انکل کے پاس وقت نہیں تھا۔ چھوٹے بہن بھائی اس کے مقابلے کے نہیں تھے اور گھر میں کوئی دوسرا ایسا بچہ نہیں تھا جو اس کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ ٹینس کورٹ میں اپنا وقت ضائع کر سکے۔ اب اگر ایک ہم عمر نظر آ گیا تھا تو کیا پتا ایک ٹینس پارٹنر ہی مل جاتا۔ چڑیا اس کے سوال پر گڑبڑائی۔

''میں سیکھ رہی ہوں۔'' انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہ جھوٹ نہیں تھا کہ وہ سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی بیڈمنٹن کے ریکٹ سے ہی سہی..... اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

''کون سکھا رہا ہے؟'' اگلا سوال آیا۔

''میں خود دیکھ رہی ہوں۔'' ایبک نے بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھا پھر کھلکھلا کر ہنسا۔ چڑیا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''خود کیسے سیکھ سکتے ہیں؟'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''تم بھی تو خود سیکھتے رہتے ہو۔'' جواب اسی انداز میں ملا..... جس انداز میں سوال کیا گیا تھا۔ اس بار ایبک گڑبڑایا۔ بات ٹھیک تھی۔ وہ بھی آئینے کے سامنے کھڑا یہی کر رہا تھا۔

''اگر تم چاہو تو میں سکھا سکتا ہوں تمہیں۔'' چڑیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایبک سے اس آفر کی توقع وہ نہیں کر سکتی تھی۔

''او کے۔'' اپنے بلیوں اچھلتے دل کو سنبھالتے اس نے ایبک سے کہا۔

''کون سا ریکٹ ہے تمہارے پاس؟'' ایبک اب ایک تجربے کار کوچ کی طرح بولنے لگا تھا۔ چڑیا کا رنگ زرد پڑا۔ وہ یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ اس کے پاس ریکٹ نہیں تھا۔

''ریکٹ تو نہیں ہے۔'' بے حد مدھم آواز میں اس نے جیسے اعترافِ ندامت کیا۔

''تو پھر تم سیکھ کیسے رہی ہو؟'' ایبک حیران ہوا تھا۔



''تمہیں دیکھ کر۔'' چڑیا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''خالی دیکھنے سے ٹینس کھیلنا تھوڑی آتا ہے۔'' ایبک نے اس بار جھنجلا کر کہا۔ لڑکیاں ہمیشہ اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں۔ اس نے ساتھ ہی سوچا۔ چڑیا نے چہرہ جھکا لیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر وہ اس کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اپنے کوارٹر کی دیوار کے ساتھ بیڈمنٹن ریکٹ کے ساتھ ٹینس کھیلنے کی پریکٹس کی تھی۔ ایبک نے آئینے میں اس کے لٹکے ہوئے منہ کو دیکھا وہ اداس اسے اچھی نہیں لگی تھی۔

''اچھا چلو، میرے پاس ایک اور ریکٹ ہے تم اس کے ساتھ کھیل لینا۔'' اس نے بے ساختہ اسے آفر کی اور چڑیا کا چہرہ سیکنڈز میں چمک اٹھا۔

☆☆☆

وہ بالکل پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کمرے میں جس کے بارے میں وہ اتنا بہت کچھ سن چکی تھی کی طرف جانے سے پہلے..... سو بار سوچتی اور خاص طور پر رات کے اس پہر لیکن فی الحال وہ حواس باختہ تھی..... شیر دل کی طرف سے جواب نہ آنا اس کے حواس کو ماؤف کرنے کے لیے کافی تھا۔

ایک ہی وقت میں دو، دو، تین تین زینے پھلانگتی وہ اوپر آ گئی اور اس کے اوپر آتے ہی اس نے کاریڈور میں اس ماسٹر بیڈروم کے دروازے کی جھری سے آتی روشنی کو بند ہوتے دیکھا۔ کاریڈور روشن تھا لیکن وہ کمرا ایک بار پھر تاریک ہو چکا تھا۔ شہر بانو ٹھٹکی تھی۔ کمرے میں کوئی تھا اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کمرے کی لائٹس کو آف ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ شیر دل وہاں بھی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ بے اختیار اس کمرے کے دروازے کے سامنے آئی..... اور تبھی کمرے کا دروازہ یکدم کھل گیا۔ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کی سانسیں، دھڑکن اور خون کی گردش بیک وقت تھمی اور پھر جیسے ایک الیکٹرک شاک کے ساتھ وہ اپنے حواس میں واپس آئی گئی۔ اندر سے نکلنے والا شیر دل تھا۔ مطمئن انداز میں نائٹ ڈریس پر ایک سیاہ جرسی چڑھائے بے حد Casual انداز میں وہ اس طرح باہر نکلا تھا جس طرح کوئی اپنے گھر کے ایک کمرے سے اچانک نکل آتا ہے۔ شہر بانو ننھے بچوں کی طرح ایک لمحے کے توقف کے بعد اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس کی زندگی میں شیر دل اور مثال کے علاوہ اور کوئی قیمتی چیز نہیں تھی ایسی چیز جس کو کھونے کے خدشے سے اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی یا وہ کھانا پینا بھول جاتی۔ مثال، شیر دل کے بہت بعد آئی تھی اور شیر دل یہ بات جانتا تھا شہر بانو کے کہے بغیر جتائے اور بتائے بغیر بھی..... شیر دل نے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹتے ہوئے کسی بڑے کی طرح اس کی پشت کو تسلی دینے والے انداز میں نرمی سے رگڑا۔

''تم پھر بیڈ سے گری ہو؟'' شیر دل اس کے اس طرح اٹھ کے آ جانے کی وجہ یہی سمجھا تھا۔ اس کے سینے میں سر چھپائے شہر بانو اس کو یہ نہیں بتا سکی کہ چند منٹوں میں وہ خدشات کے کتنے جنگل پار کر آئی تھی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تم نے وعدہ کیا تھا اس کمرے کو بند رکھنے کا۔'' اس کی پشت پر اس کی جرسی کو دونوں مٹھیوں میں بھینچے سر اٹھائے بغیر اس نے بے حد خفگی کے عالم میں اپنی سانس کو بحال کرنے کی کوشش میں کہا۔

''کام تھا۔'' شیر دل نے بے حد گول مول انداز میں اس کے سر کو چومتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اب پلٹ کر اس دروازے کے باہر لگے ہوئے بولٹ کو چڑھا کر تالا بند کر رہا تھا۔

''مجھے آپریٹر نے جگایا ہے..... اس کمرے میں لائٹ دیکھ کر انٹر کام کر رہے تھے وہ تمہیں۔'' شہر بانو نے اسے اطلاع دی۔

''اوہ..... مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اوپر والے فلور پر اچانک لائٹس دیکھ کر.....'' شیر دل بات کرتے کرتے رک گیا۔ وہ شہر بانو کو اس کی نیند کے دوران ہونے والے کسی واقعے کے بارے میں کوئی کلیو نہیں دینا چاہتا تھا۔

''ایسی کسی چویشن میں تمہیں گارڈ کو بلا کر اسے اوپر بھیجنا چاہیے تھا، تم بے وقوفوں کی طرح خود اوپر آ گئیں۔'' اس کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے شیر دل نے اسے ڈانٹا۔

''لیکن تم اوپر آئے کیوں تھے؟'' شہر بانو نے اس کی ڈانٹ کا برا منائے بغیر کہا۔

''کام تھا کوئی یار۔'' شیر دل نے اس کے ماتھے، چہرے پر بکھرے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اسے ایک بار پھر ٹالا۔

ہال کمرے سے باہر نکلتے ہی شیر دل نے بھی برآمدے نما کاریڈور کی کھڑکیوں سے باہر اکٹھے ہوئے گارڈز کو دیکھ لیا تھا۔

''تم بیڈ روم میں جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ شہر بانو سے کہتے ہوئے خود بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شہر بانو اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ مثال اسی طرح اپنے بستر میں گہری نیند سو رہی تھی۔ شہر بانو کو بیڈ روم میں آ کر پہلی بار سردی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اوپر تک پھر آئی تھی۔ وہ کمبل ہٹاتے ہوئے دوبارہ بستر میں گھس گئی۔ بستر میں چت لیٹے وہ کچھ دیر تک شیر دل کا انتظار کرتی رہی۔ اسے نیند آ رہی تھی لیکن وہ شیر دل کو واپس کمرے میں موجود دیکھے بغیر سونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ شیر دل تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا۔ اور وہ تب بھی جاگ رہی تھی۔

''سو جاؤ یار..... کیوں جاگ رہی ہو؟'' شیر دل نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے جاگتے دیکھ کر کہا۔

''تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' شہر بانو نے کچھ مطمئن انداز میں جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''میں واپس آ گیا ہوں..... تم سو جاؤ۔'' شیر دل نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ وہ اب سائڈ ٹیبل پر پڑا اپنا لائٹر اور سگریٹ پیک اٹھا رہا تھا۔ شہر بانو آنکھیں بند کیے چند لمحے جیسے اس کے بستر پر لیٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بیڈ سائڈ ٹیبل لیمپ کو آف کر رہا تھا لیکن بستر میں نہیں تھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو اب؟'' شہر بانو نے کچھ ہڑبڑا کر کہا۔

''میں مثال کے بیڈ روم میں ہوں ایک دو سگریٹ پی کر واپس آ جاؤں گا۔'' شیر دل نے دھیمی آواز میں اس سے کہا اور برابر والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شہر بانو نے کچھ الجھ کر کمرے کی نیم تاریکی میں اس کے ہیولے کو برابر والے کمرے میں غائب ہوتے دیکھا۔۔۔ وہ کیوں سو نہیں پا رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پائی تھی اور وہ آدھی رات کو کس کام سے اوپر والی منزل پر گیا تھا وہ اس سے یہ بھی پوچھ نہیں پائی تھی..... وہ بہت دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رکھ پائی۔

برابر والے کمرے میں شیر دل بیٹھا ایک کے بعد ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ بہت زیادہ تھکن ہونے کے باوجود نیند اب بھی اس سے کوسوں دور تھی اور جو کچھ وہ اوپر والے بیڈ روم میں دیکھ آیا تھا اس کے بعد اسے نیند



آ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ گھر کسی نہ کسی حد تک Haunted تھا اسے اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا لیکن وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ اثرات کس حد تک تھے..... اور کیا اس سے اس کی فیملی کے متاثر ہونے کے امکانات تھے؟ کسی آسیب زدہ گھر میں اپنی بیوی اور کم سن بیٹی کو رات کے وقت اکیلے چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا..... اس کی فرض شناسی اور دلیری اس ایک چیز پر آ کر ختم ہو جاتی تھی اور صرف اسی کی نہیں کسی بھی آفیسر کی ہو جاتی..... وہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ شام ہوتے ہی ہر روز گھر بھاگ آتا۔ کئی بار اسے گھر آ کر رات کو پھر آفس جانا پڑتا تھا..... اور کئی بار وہ آج رات کی طرح کسی وزٹ سے رات گئے واپس آتا..... اور کئی بار وہ چند دنوں کے لیے کسی نہ کسی کام سے گھر سے غیر حاضر بھی ہوتا۔ وہ اس غیر حاضری کے دوران اپنی فیملی کو لاہور اپنے پیرنٹس کے پاس بھجوا سکتا تھا لیکن وہ روزمرہ امور کی انجام دہی کے دوران ہونے والی تاخیر کا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ کرے کیا۔ اس کا سر بری طرح چکرایا ہوا تھا۔

☆☆☆

''سر، آپ پریشان نہ ہوں۔'' خانساماں نے شیر دل کو تسلی دی۔ اگلے دن ویک اینڈ تھا اور شیر دل نے کچھ دیر پہلے ناشتے کے بعد خانساماں کو اپنی اسٹڈی میں بلوایا تھا۔ وہ اب اس گھر کے بارے میں اس سے تفصیلی بات چیت کرنا چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ گفتگو کا آغاز کرتا خانساماں نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا تھا۔ رات کے واقعات صبح ہونے تک تمام ملازمین کے علم میں آ چکے تھے اور شیر دل کو اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیئر ٹیکر اور لوئر اسٹاف کی نیٹ ورکنگ آفیسرز کی نیٹ ورکنگ سے کہیں زیادہ مؤثر اور تیز ہوتی ہے۔

''یہ دروازے وغیرہ کھل جانا تو عام چیز ہے اس گھر میں اور آج تک اس سے کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔'' وہ اب شیر دل کو بتا رہا تھا۔ ''بلکہ آج تک اس گھر میں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا کسی بھی صاحب کا، بس چھوٹی موٹی چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھار کچھ آوازیں آنے لگتی ہیں۔ دروازے خود ہی بند اور کھلتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار گھر میں پڑی مشینیں خود ہی چل پڑتی ہیں بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔'' خانساماں اسے تفصیل سے بتا رہا تھا۔

''ابھی ''یہ'' بس ہے؟'' شیر دل نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا۔ ''میری بیوی نے اگر ایک بھی چیز دیکھ لی ان میں سے ہوتے ہوئے تو وہ زندگی میں دوبارہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے پہلے والے آفیسر کے ساتھ بھی ہوا تھا یہ سب کچھ؟'' شیر دل نے اچانک پوچھا۔

''سب کے ساتھ ہوتا ہے جو بھی آ کر یہاں رہتا ہے لیکن آہستہ آہستہ سب کو عادت ہو جاتی ہے، میں نے آپ کو بتایا نا کہ یہاں آج تک کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔'' خانساماں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''شہر بانو کو کل رات کے واقعات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔'' شیر دل نے اسے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''جی سر۔''

''اور گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کرواؤ..... کسی مسجد یا مدرسے سے مولوی صاحب اور طلبہ کو بلواؤ ختم قرآن کے لیے۔'' شیر دل نے مزید ہدایات دیں۔ اسے یہ ہدایت دیتے ہوئے حیرانی ہوئی کہ اسے پہلے اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیز کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ خانساماں کو ہدایات دے کر فارغ کرنے کے بعد اس نے آپریٹر سے اس گھر سے پوسٹ آؤٹ ہونے والے آفیسر سے رابطہ کروانے کا کہا تھا۔ وہ خانساماں کی تسلیوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا لیکن وہاں اس سے پہلے پوسٹڈ رہنے والے آفیسر کا بیان بھی خانساماں کے بیان سے مختلف نہیں تھا۔ اس گھر میں کچھ اثرات تھے لیکن وہاں رہنے والے ہر آفیسر کے لیے وہ قابلِ قبول تھے۔ شیر دل کچھ مطمئن ہونے لگا۔ اس نے ایک کے بعد ایک کتنے ہی آفیسرز کو کال کی تھی۔ ان سے سوال و جواب کرتے ہوئے اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ وہ ان سے یہ پوچھتا کہ اس گھر میں رہائش کا ان کی ازدواجی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ نہ ہی اس نے یہ چیک کرنے کی کوشش کی کہ ان میں سے کتنے ابھی تک اپنی پہلی شادی نبھا رہے ہیں اور کتنے لائف پارٹنر تبدیل کر چکے ہیں اگر وہ یہ تحقیق کر لیتا تو اسے پتا چل جاتا کہ اس گھر میں رہنے والے تمام آفیسرز.....

''شیر دل تم ویک اینڈ بھی کام کرتے گزارو گے؟'' شہر بانو نے اسٹڈی میں داخل ہو کر شیر دل کا انہماک توڑا۔ شیر دل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور واپس رکھ دیا۔ وہ آپریٹر کو ایک اور آفیسر سے رابطے کا کہتے کہتے رک گیا تھا۔

''بس ختم ہو گیا ہے کام۔'' اس نے مسکراتے ہوئے شہر بانو سے کہا۔ یہ اس کے گھر کا ایک Unsaid rule تھا کہ ویک اینڈ پر کام نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کئی بار یہ Rule توڑتا آ رہا تھا اور اس میں اس کی اپنی نیت سے زیادہ ملکی حالات کا قصور تھا۔ شہر بانو اس کی پروفیشنل مجبوریوں اور مصروفیات سے واقف ہونے کے باوجود اس ایک چیز کو بے حد ناپسند کرتی تھی۔ وہ خود جتی المقدور اس لائف اسٹائل سے بچتی آ رہی تھی جو ایک انتظامی آفیسر کی بیوی کا ہو جاتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے طور پر یہ شیر دل کی پہلی پوسٹنگ تھی اور شہر بانو اب بھی بڑی محدود سوشل سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھی۔ اسے ایک عام ڈپٹی کمشنر کی بیوی کی طرح اسکولز اور کالجز کے فنکشنز میں مہمان خصوصی بن کر جانے، فیتے کاٹنے اور بے مقصد تقریریں کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ نہ وہ مزاجاً ایسی تھی نہ شیر دل اس کا ایسا سوشل پروفائل چاہتا تھا کہ جس میں گھر آنے پر اسے وہ نظر نہ آتی۔ اس کے باوجود پہلے کی نسبت اب شہر بانو کو بہت سے ایسے فنکشنز میں جانا پڑتا تھا جہاں پر انتظامی آفیسر کی بیوی کی موجودگی ناگزیر تھی۔

''کیا پروگرام ہے آج کے لیے؟'' شیر دل نے اس سے پوچھا۔ پچھلے تین ویک اینڈز سے وہ اتنا مصروف تھا کہ کسی ذاتی سیر و تفریح کے پروگرام پر عملی جامہ پہنانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ایک آدھ بار ویک اینڈ پر انہوں نے باہر کھانا کھایا تھا اور شہر بانو کے لیے شیر دل کے ساتھ اتنا وقت گزارنا بھی غنیمت تھا۔ آج تین ہفتوں کے بعد شہر بانو نے کہیں جا کر دن گزارنے کا پروگرام بنایا تھا اور شیر دل پھر صبح سے اسٹڈی میں بند تھا۔

''تم فارغ ہوتے تو کوئی پروگرام بنے گا۔'' شہر بانو نے شکایتاً کہا۔

''I'm totally free now۔'' شیر دل نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''مثال کہاں ہے؟''

''باہر Swings پر ہے شیر دل رات کو کیا ہوا تھا؟'' شہر بانو نے اسے بتاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' شیر دل نے جواباً پوچھا۔

''تم اوپر اس کمرے میں کیوں گئے تھے؟'' شہر بانو نے گفتگو کا سلسلہ پچھلی رات سے جوڑنے کی کوشش کی۔

''میں سوچ رہا ہوں اس کمرے کو بند نہ رکھا جائے، میں اپنی اسٹڈی وہاں شفٹ کرنے کا سوچ رہا



ہوں۔'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے، تم اب روز رات کو اس کمرے میں جا کر بیٹھا کرو گے۔'' شہر بانو نے بے اختیار تلملا کر کہا۔

''کیا حرج ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کمرا بند ہی رہے گا۔'' شہر بانو نے جیسے اسے یاد دلایا۔

''میں نے کل کہیں پڑھا ہے کہ جن جگہوں پر اثرات ہوں انہیں ویران اور غیر آباد نہیں رکھنا چاہیے۔'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ، ریئلی.....'' شہر بانو نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور اس کمرے کو آباد کرنے کے لیے تم اپنی خدمات پیش کر رہے ہو..... واہ کیا بات ہے، اس سے وہاں اثرات ختم ہو جائیں گے؟ شیر دل تم واقعی احمق ہو یا اس گھر میں آ کر ہو گئے ہو؟'' شیر دل کا دل بے ساختہ چاہا تھا وہ کہے کہ اس گھر میں آ کر ہو گیا ہوں۔ پچھلی رات اگلی کئی راتوں تک اسے یاد رہنے والی تھی۔ خاص طور پر اس کمرے میں دیکھا جانے والا مثال کا وہ ٹیڈی جسے بری طرح ادھیڑ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا کر رہی ہو چڑیا؟'' خیر دین سوتے سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ چڑیا نے اسے باہر آتے نہیں دیکھا وہ یک دم اس کی آواز سن کر ڈر گئی تھی۔

''کچھ نہیں نانا، میں ٹینس کی پریکٹس کر رہی ہوں۔'' چڑیا نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ تختی کے ساتھ گیند کو وارٹر کی بیرونی دیوار پر مار مار کر ٹینس کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی اور خیر دین اسی آواز سے جاگا تھا۔

''تم نے وقت دیکھا ہے؟'' خیر دین نے خفگی کے ساتھ اس سے کہا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ پتا نہیں چڑیا کب اٹھی تھی اور کب گیند اور تختی لے کر باہر آ گئی تھی۔ کوارٹر کے سامنے دس فٹ لمبا ایک صحن تھا جس کے ایک حصے میں ایک کچن باتھ روم اور دوسرے میں ایک چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس صحن کے گرد چھ فٹ اونچی چار دیواری تھی اور اب اسی چار دیواری کے اندر صحن میں جلتے بلب کی روشنی میں چڑیا پریکٹس میں مصروف تھی۔ وہ اگلے دن ایک کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ اسے کھیل کی الف بے بھی نہیں آتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے بچوں کی جس دنیا میں وائلڈ کارڈ انٹری ملی تھی، وہ موقع اس سے چھن جائے۔ بچکانا سوچ تھی اور بچکانا ہی کوشش تھی لیکن صرف لگن تھی جو بچکانا نہیں تھی۔

''نانا ابا آپ سو جائیں میں ابھی آ کر سو جاؤں گی۔'' اس نے گیند کو ایک اور ہٹ کرتے ہوئے خیر دین سے کہا۔ تختی کے ساتھ ٹینس بال کو ہٹ کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ نہ وہ ہموار طریقے سے تختی پر لگ کر اچھل رہی تھی اور نہ ہی دیوار سے لگنے کے بعد ٹھیک سے تختی پر آ رہی تھی لیکن چڑیا کوشش ترک کرنے پر تیار نہیں تھی یہ ایک کے ساتھ پہلے پریکٹس سیشن کی تیاری تھی۔

''بیٹا صبح کھیلنا ابھی بہت رات ہو گئی ہے۔'' خیر دین نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں نانا مجھے ابھی کھیلنا ہے۔'' وہ نہیں مانی تھی۔ خیر دین چند لمحوں میں ہی ہار مان کر اندر واپس سونے چلا گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد بالآخر تختی ٹوٹ گئی تھی۔ مایوسی اور صدمے سے چڑیا کا برا حال ہو گیا۔ کھیلنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے اب اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بے حد رنجیدہ کوارٹر میں سونے گئی اور نیند کی وادی میں بھی وہ اس رات ٹینس ہی کھیلتی رہی تھی۔

''ریکٹ پکڑنا آتا ہے نا؟'' اگلی سہ پہر ایبک نے کورٹ پر اسے ریکٹ پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' چڑیا نے بڑے اعتماد سے ریکٹ پکڑ لیا۔

''تو پھر ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں تمہارے؟'' ایبک نے اس کے ہاتھوں کی Grip کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ چڑیا اسے کیا بتاتی کہ وہ ایکسائٹمنٹ کی وجہ سے تھا۔ وہ ریکٹ جسے ہاتھ لگانے کے لیے وہ کئی مہینوں سے ترس رہی تھی اب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس سے کھیلنے جا رہی تھی۔

''اس طرح نہیں...... یہاں سے پکڑتے ہیں۔'' ایبک نے ریکٹ پر اس کے ہاتھوں کی پوزیشن کو ٹھیک کیا۔ چڑیا نے میکانیکی انداز میں اس کی ہدایات کے مطابق اپنے ہاتھ کی پوزیشن تبدیل کی۔

اس دن وہ دونوں ایک گھنٹے کھیلتے رہے اور ایک گھنٹے کے اختتام پر چڑیا کی Serve جو شروع میں Net کے دوسری طرف جا ہی نہیں رہی تھی وہ اب دوسرے کورٹ تک پہنچنے لگی تھی۔ ایبک کسی ایکسپرٹ کوچ کی طرح اسے ٹینس سکھا اور کھلا رہا تھا، یہ اندازہ تو اسے بھی بخوبی ہو گیا تھا کہ چڑیا کی ٹینس پریکٹس اور نالج واقعی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی لیکن وہ بہت اسمارٹ تھی اس کا اندازہ ایبک کو ہو گیا تھا۔

''you are a quick learner'' اس نے اپنی ستائش کھیل کے دوران ہی چڑیا تک پہنچا دی تھی۔ ایبک کی ستائش چڑیا کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ کھیل میں اس کی لگن اور انہماک کچھ اور بڑھ گیا تھا، ایک گھنٹے میں انہوں نے صرف ٹینس نہیں کھیلی تھی انہوں نے بہت ساری باتیں بھی کی تھیں۔ ایبک اس کی کمپنی انجوائے کر رہا تھا۔ وہ باتونی تھا اور وہ بہت اچھی سامع تھی۔ عام بچوں کے برعکس وہ زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی لیکن دلچسپ باتیں کرتی تھی اور ایبک کو وہ ''لڑکی'' نہیں لگی تھی۔ وہ Talkative، Loud، Silly، Goofy گرلز جن سے اس کی جان جاتی تھی جو ہر بات میں رونے بیٹھ جاتی تھیں یا پھر جھگڑا کرنے۔ چڑیا کے ساتھ وہ اس طرح اور اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا جو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا تھا All the boy talk اور چڑیا اس کی باتوں کو سمجھ رہی تھی جواب دے رہی تھی۔ تبصرہ کر رہی تھی اور اختلاف کر رہی تھی اور یہ صرف آغاز تھا ان کی دوستی کا، ان کی پارٹنرشپ کا ان کی Compatability اور Understanding کا۔ وہ دونوں عجیب طریقے سے ایک دوسرے کے قریب ہوئے تھے۔

ایک گھنٹا آنے والے دنوں میں کئی گھنٹوں میں بدلتا چلا گیا اور ٹینس کورٹ کے علاوہ بھی اب وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایبک نے اسے بتایا تھا کہ وہ ٹینس پلیئر بننا چاہتا ہے لیکن ساتھ سول سروس بھی جوائن کرے گا کیونکہ اس کے فادر سول سرونٹ تھے اور اسے بھی بنانا چاہتے تھے اور وہ باہر جا کر Plane اڑانا بھی سیکھے گا اور کسی باہر کی یونیورسٹی سے پڑھے گا Most probably harvard کیونکہ اس کے فادر بھی وہاں سے پڑھے تھے اس نے اس کے علاوہ بھی اپنے تمام عزائم اور ارادے چڑیا کو بتائے تھے۔ جن میں ایک پولو پلیئر بننا، پیانو سیکھنا اور نوبل پرائز جیتنا بھی شامل تھا لیکن وہ کس فیلڈ میں نوبل پرائز جیتنا چاہتا تھا یہ ابھی اس نے طے نہیں کیا تھا۔



چڑیا نے اسے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور ڈاکٹر ہی بنے گی۔

''اور؟'' ایبک نے اسے خاموش ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''اور کچھ بھی نہیں بس ڈاکٹر۔'' چڑیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس صرف ڈاکٹر بنو گی تم...... اور کچھ بھی نہیں...... کوئی اور کام نہیں کرو گی...... کوئی اور پلان نہیں تمہارا۔'' ایبک کو جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ چڑیا ایسی بات کر سکتی تھی۔ وہ پہلی لڑکیوں والی بات تھی جو اس نے چڑیا کے منہ سے سنی تھی۔ Typical پروفیشن اور بس ایک ہی کام۔

''اتنی لمبی زندگی میں تم بس ایک کام کرو گی؟'' ایبک نے جیسے اس کا مذاق اڑا کر اسے Motivate کرنے کی کوشش کی۔

''میرے نانا کہتے ہیں ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہیے۔ اس طرح کام آسان بھی ہو جاتا ہے اور اچھا بھی ہوتا ہے۔'' چڑیا نے خیر دین کا گُر ایبک کو کسی طوطے کی طرح سادہ لہجے میں بتایا۔

''I don't agree with your nana'' ایبک نے سر جھٹک کر کہا۔ ''زندگی تو بڑی چھوٹی ہوتی ہے ایک وقت میں ایک کام کریں گے تو پھر تو زندگی میں تھوڑے سے کام ہوں گے بس۔'' چڑیا نے بغور اس کی بات سنی۔ ''تم بس ڈاکٹر بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتیں؟'' ایبک نے اس سے پوچھا۔

''کرنا چاہتی ہوں۔'' چڑیا نے کہا۔

''کیا کرنا چاہتی ہو اور؟'' ایبک نے دلچسپی لی۔

''میں دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔''

''Me too۔'' ایبک بے اختیار چلایا۔ ''یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا تھا۔'' چڑیا مسکرائی۔

''اور میں امی اور نانا کے لیے ایک گھر بنانا چاہتی ہوں...... بڑا اور خوب صورت۔''

''اور؟''

''اور میں ایک سنگر بھی بننا چاہتی ہوں۔''

''تمہیں گانا آتا ہے؟'' ایبک نے یک دم اس سے پوچھا۔ چڑیا بلش ہوئی لیکن اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''رئیلی؟'' ایبک کو جیسے یقین نہیں آیا۔

''یس۔''

''اچھا کل میں اپنا کی بورڈ لاؤں گا تم گانا۔'' وہ خوش ہوا۔

''او کے۔'' چڑیا نے بھی ایکسائٹڈ انداز میں سر ہلایا۔

''اور کیا کرنا چاہتی ہو تم؟'' ایبک نے مزید پوچھا۔

''اور میں ایک کھیل بنانا چاہتی ہوں چیس کی طرح کا۔ جس میں کوئین ہی کنگ ہو۔'' ایبک اس بار پھر چونکا۔

''یہ کیا بات ہوئی''

''ہاں تو جب کنگ اتنا ویک ہے تو پھر وہ کنگ کیسے ہو سکتا ہے کوئین پاورفل ہے تو کوئین کو کنگ بنا دینا چاہیے۔'' چڑیا نے اپنا Argument پیش کیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ کیا بات ہوئی؟" ایبک بالکل متفق نہیں ہوا۔ "کنگ، کنگ ہوتا ہے اور کوئین، کوئین۔"
"لیکن کوئین بھی تو کنگ بن سکتی ہے نا!"
"At least not in chess" ایبک نے حتمی انداز میں کہا۔ "تمہیں کو چیس کھیلنا آتا ہے؟" ایبک نے ساتھ ہی اس سے اگلا سوال کیا۔ چڑیا نے سر ہلا دیا۔
"جیسے تم کو ٹینس کھیلنا آتا تھا۔" ایبک نے اس کا مذاق اڑایا۔ چڑیا سرخ ہوگئی۔
"نہیں، چیس واقعی کھیلنا آتا ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔
"Favourite piece کون سا ہے تمہارا؟" ایبک نے پوچھا۔
"کوئین کے بعد Horse۔" چڑیا نے بے ساختہ کہا۔
"ہیں، یہ Horse کون سا Piece ہے؟" ایبک ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ "تم Knight کو horse کہہ رہی ہو۔" اس نے چڑیا کو تقریباً ڈانٹ دیا۔
"میں Horse ہی کہتی ہوں ہمیشہ۔" چڑیا نے کچھ شرمندگی سے کہا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس چیس Piece کا نام نہیں جانتی تھی لیکن وہ اس Piece کو Horse کہنے کی عادی تھی۔
"لیکن نہیں کہنا چاہیے تھا Horse اور Knight میں تو بڑا ڈیفرنس ہوتا ہے۔"
"کیا ڈیفرنس ہوتا ہے؟" چڑیا نے دلچسپی سے پوچھا۔
"Horse تو ایک Animal ہوتا ہے لیکن Knight تو ایک Soldier ہوتا ہے۔ Daring، Brave، Strong، Powerful وہ سنگل Handedly wars لڑ اور Win کر سکتا ہے کنگ کے لیے اور گھوڑا تو بس گھوڑا ہوتا ہے۔" ایبک نے اپنے لحاظ سے دونوں مہروں کی تعریف کی۔
"میرا فیورٹ چیس پیس ویسے صرف کوئین ہے۔" ایبک نے بے ساختہ کہا۔
"Knight بھی کوئین کی طرح پاورفل ہے۔" چڑیا نے اس کی تشریح سننے کے بعد تبصرہ کیا۔
"کوئین کی طرح کوئی نہیں۔ کوئین، کوئین ہوتی ہے۔" ایبک نے اپنا فیصلہ دیا۔ "اور اس کو Knight کی طرح کا کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ نہ Wars لڑنی پڑتی ہیں نہ Sword سے Fight کرنی پڑتی ہے نہ ہارس رائڈنگ کرنی پڑتی ہے But she is still powerful" ایبک اسے سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔
"اور ایسا کیوں ہے؟" چڑیا نے بے ساختہ پوچھا۔ ایبک ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑا۔
"Because she is the king's wife and king loves her" ایبک نے روانی میں کہا۔ چڑیا حیرانی سے ایبک کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی Love کا لفظ اس کی Vocabulary میں موجود تھا لیکن ایک دوسرے مفہوم کے ساتھ... جو فیلنگ وہ اپنے نانا، ماں، بونوں اور کتابوں اور اسکول اور کھلونوں کے لیے رکھتی تھی۔ وہ اس کے نزدیک Love تھا۔ اس نے فیری ٹیلز میں بھی شہزادوں اور شہزادیوں، بادشاہوں اور ملکاؤں کے درمیان محبت کا لفظ پڑھا اور سنا تھا مگر وہاں بھی اس لفظ نے اس سے کوئی مفہوم کوئی چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ ایبک کی Interpretation نے پہلی بار اسے اس لفظ کی طرف متوجہ کیا



تھا۔ کوئین پاورفل اس لیے ہوتی ہے کیونکہ وہ King کی وائف ہوتی ہے اور کنگ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے چند لمحوں کے لیے ایبک کے بیان کو اپنے لفظوں میں دُہراتے ہوئے اس پر غور کیا لیکن سوال اب بھی یہ تھا کہ King خود کیوں اتنا ویک تھا اور اس نے یہ بات ایبک سے پوچھ بھی لی تھی۔ ایبک خود بھی چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ چیس کھیلتے ہوئے آج تک اس نے ان مہروں اور ان کی پاورز کے بارے میں اتنا تھوڑی سوچا تھا جتنا چڑیا سوچتی رہتی تھی۔
"مجھے لگتا ہے کنگ نے اپنی ساری پاورز کوئین کو دے دیں اس لیے وہ پھر خود ویک ہوگیا۔" ایبک نے چند لمحوں کے غور و خوض کے بعد نتیجہ نکالا۔
"ہاں، پر کیوں دیں پاورز۔" چڑیا نے اعتراض کیا۔
"مجھے لگتا ہے وہ کوئین سے بہت پیار کرتا ہوگا...... اس لیے دی ہوں گی۔ جیسے میرے پاپا میری ممی سے بہت پیار کرتے ہیں تو سارا گھر ممی چلاتی ہیں...... سارے پیسے بھی ان کے پاس ہوتے ہیں ساری چیزیں بھی وہ لاتی ہیں...... سارے سرونٹس سے بھی وہی بات کرتی ہیں۔" ایبک اپنی طرف سے بڑی دور کی کوڑی لایا تھا چڑیا اس لوجک کو نہیں سمجھ سکتی تھی اس نے باپ نہیں دیکھا تھا نہ ماں کو ایک کوئین کی طرح پاورفل دیکھا تھا، اس نے صرف خیر دین دیکھا تھا ہر ذمے داری نبھاتا ہوا...... اس نے ایبک سے مزید سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اس کا عزم برقرار تھا۔ اگر کوئین سب سے پاورفل تو پھر بورڈ کوئین کا لیکن ایسا کون سا کھیل بن سکتا تھا جس میں یہ ہو پاتا یہ اس نے طے نہیں کیا تھا۔
"کسی دن کھیلیں گے چیس بھی...... میرے پاس بورڈ ہے نہیں لیکن انکل کے پاس ہے ایک Magnetic chess انکل سے مانگوں گا۔" ایبک نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔
"میرے پاس ہے ایک چیس بورڈ۔" چڑیا نے جلدی سے بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں کہا۔ کم از کم اس کے پاس کچھ تو تھا جو وہ ایبک کو آفر کر سکتی تھی۔
"اچھا، پھر کل لے کر آنا۔" ایبک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
کم از کم چیس وہ کھیل نہیں تھا جس میں ایبک کے ساتھ کھیلنے سے پہلے چڑیا کو پریکٹس کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اگر ایبک پانچ سال کی عمر سے ٹینس کھیل رہا تھا تو چڑیا اسی عمر سے خیر دین کے ساتھ چیس بورڈ پر مہروں کو اکھاڑتی، پچھاڑتی آرہی تھی۔ خیر دین نے کئی سالوں سے اکیلے کھیلتے کھیلتے پچھلے تین سالوں سے اکیلے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ جب بھی بورڈ لے کر بیٹھتا چڑیا میکانکی انداز میں آکر پاس بیٹھ جاتی۔ بورڈ پر مہرے سجانا اس کی پسندیدہ سرگرمیوں میں سے ایک تھا اور مہرے سجاتے سجاتے وہ ان مہروں کی اکھاڑ پچھاڑ میں بھی شریک ہوگئی تھی۔ اس نے خیر دین کو پہلی بازی ایک سال کھیلتے رہنے کے بعد ہرائی تھی۔ خیر دین اسے اتفاق سمجھا تھا اور ہار کا سبب اس نے اپنی بے دھیانی کو قرار دیا تھا لیکن پھر ہر تیسرے چوتھے دن ایسا ہونے لگا تھا کہ چڑیا چیک میٹ کی پوزیشن میں آجاتی اور خیر دین کو اپنا بادشاہ بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا پڑتے اور اب تین سال بعد خیر دین اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے اسی طرح محتاط اور مستعد رہتا تھا جس طرح اپنے کسی ہم عمر کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ جیت کا تناسب اب بھی خیر دین کے حق میں تھا لیکن ایک آٹھ سال کی بچی سے بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھار ہارنا بھی بڑا کٹھن کام تھا اور خاص طور پر اس بچی سے جس کو آپ نے خود کھیل سکھایا ہو۔ چڑیا سے ہار کے سارے لمحات خیر دین کے لیے فخر کے لمحات تھے، اپنی اگلی نسل سے ہارنا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔

چڑیا اگلے دن اپنا وہ ڈبا لے کر ایبک کے پاس پہنچ گئی تھی جس میں ایک سستا پلاسٹک کے مہروں والا چیس بورڈ تھا۔

"You know chirya" چیس مجھ کو کیوں زیادہ اچھی نہیں لگتی۔" ایبک نے اسے بورڈ پر مہرے سجاتے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟" چڑیا ٹھٹکی تھی۔ اسے یہ اندازہ تو تھا ہی نہیں کہ ایبک کو چیس زیادہ پسند نہیں تھی۔

"اس میں وقت بڑا لگتا ہے۔ بیٹھے رہو... سوچتے رہو... مجھے جلدی ہونے والے کام پسند ہیں۔" ایبک نے کہا۔

"نانا کہتے ہیں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔" ایبک لاجواب ہو کر گڑبڑایا۔

"نہیں، اتنی جلدی کی بات نہیں کر رہا میں۔" اس کو محاورے کی سمجھ آئی ہو نہ آئی ہو شیطان سے وہ اچھی طرح متعارف تھا۔

"پہلی بازی کا فیصلہ سات منٹ میں ہو گیا۔ دوسری کا آدھے گھنٹے میں تیسری کا 20 منٹ میں۔ چوتھی Stalemate تھی۔ 45 منٹ جاری رہی اور پانچویں کا فیصلہ ایک بار پھر 20 منٹ میں ہوا تھا...... اور یہ تمام بازیاں چڑیا نے جیتی تھیں۔ ایبک اس دن ٹینس کھیلنا بھول گیا تھا۔ وہ ایک بچے سے چڑیا کا گاڈ فادر بنا بیٹھا تھا۔ وہ Instruct کر رہا تھا، وہ Direct کر رہا تھا اور اب وہ ایک ایسے کھیل میں آ گیا تھا جہاں وہ اسی چڑیا کے ہاتھوں منٹوں میں چت ہوا تھا۔ شکست کا وار کاری پڑ رہا تھا پر بورڈ پر نہیں ایبک کے ذہن پہ... وہ ایک نرم اور ہمدرد طبیعت والا باتونی لیکن مدد کرنے والا بچہ تھا۔ خاندان کا بڑا اور فیورٹ بچہ تھا۔ لائم لائٹ میں رہنے والا اور فیورز ملنے کا عادی۔ اس یقین اعتماد کے ساتھ پرورش پانے والا بچہ کہ وہ جو بھی کرے گا ہمیشہ اچھا اور Above average ہی کرے گا کوئی کسی چیز میں اس سے بہتر نہیں ہو سکتا، اس کو Beat نہیں کر سکتا۔ وہ کھیل میں ہارنے والے کو جا کر خود گلے لگا سکتا تھا۔ اپنی ظرافی اس کو تھما سکتا تھا۔ اس کے ساتھ رو بھی سکتا تھا لیکن وہ جیتنے والے کے گلے میں ہار نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے لیے تالیاں نہیں بجا سکتا تھا اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو نہیں کھنچوا سکتا تھا۔ اس میں اسپورٹس مین اسپرٹ تھی لیکن وہ ایک بچہ تھا۔ ایک ایسا بچہ جو ہر چیز میں جیتتا تھا۔

"اب ہم کل کھیلیں گے۔" مسلسل پانچویں بازی میں سر دھڑ لگا دینے کے باوجود بھی ہارنے پر اس نے بالآخر کہا۔

"او کے۔" چڑیا فوراً مان گئی، اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کھیلتے کھیلتے اس دن انہیں بہت دیر ہو گئی تھی ابھی اسے ہوم ورک کرنا تھا اور ایبک کو بھی۔

وہ پہلا دن تھا جب ایبک کے سر پر چڑیا سوار رہی تھی۔ وہ باقی کا سارا دن بھی چڑیا اور چیس کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں سوچ نہیں سکا۔ شام کو اس نے اس دن ٹینس کے بجائے اپنے انکل کے ساتھ چیس کی



پریکٹس کی تھی۔

"یہ چیس میں بیٹھے بٹھائے تمہیں کیسے دلچسپی ہو گئی؟" اس کے انکل کو حیرت اور تجسس ساتھ ساتھ ہوا تھا۔

"بس ایسے ہی... دل چاہ رہا تھا کھیلنے کو۔" ایبک نے اگلی چال سوچتے ہوئے بورڈ پر نظریں جمائے گول مول جواب دیا۔ وہ اپنے انکل کو جو اس کے آئیڈیل تھے، یہ کیسے بتا دیتا کہ وہ ایک لڑکی سے ہارا تھا چیس میں... ایک بار نہیں کئی بار۔ ایک بچے کے طور پر بھی اس کی Ego بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

اگلے دن چڑیا سے مقابلے کے لیے وہ اگر چیس کی پریکٹس کرتا رہا تھا تو چڑیا اپنی نئی تختی سے ٹینس کی پریکٹس کرتی رہی تھی۔

"چیس ہی کھیلیں گے آج بھی۔" ایبک نے اس سے کہا۔

"ٹینس کیوں نہیں؟" چڑیا کچھ جز بز ہوئی...... دو دن ٹینس نہ کھیلنے کا مطلب تھا کہ اس کے بہتر ہوتے ہوئے شاٹس پھر پہلے جیسے ہونے لگتے Weak and wayward

"بس چیس کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے۔" ایبک نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اس کی سوئی اب تب تک چیس میں ہی اٹکنے والی تھی جب تک وہ اس کھیل میں اسے کم از کم ایک بار ہرا نہیں لیتا۔ چڑیا کو زیادہ اعتراض نہیں ہوا تھا۔ پاپ کارن کھاتے ہوئے وہ اس دن بھی چڑیا سے سات بازیاں ہارا تھا...... اور سات ہی کھیلی گئی تھیں۔ چڑیا نے ایبک کی الجھن اور ٹینشن نوٹس نہیں کی تھی۔ نہ ہی اسے یہ اندازہ ہو پایا تھا کہ مسلسل شکست ایبک کو کسی حد تک خفا کر رہی تھی۔ وہ دوسرے دن بھی رات گئے تک اپنے انکل کو مجبور کر کے ان کے ساتھ چیس کھیلتا رہا تھا لیکن تیسرے دن بھی ایک کے بعد ایک بازی ہارنے کے بعد اس نے بالآخر ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ چڑیا چیس میں اس سے بہت بہتر تھی اور اس اعتراف نے چڑیا سے اس کی مرعوبیت کا آغاز کیا تھا۔

"چڑیا تم بہت اچھا کھیلتی ہو۔" ایبک نے آخری بازی ہارنے کے بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے چڑیا سے کہا۔ تین دنوں میں یہ پہلی بار تھا کہ چڑیا کو ایبک سے داد ملی ہو۔ وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔ "اگر تم کھیلتی رہو گی تو اور بھی اچھا کھیلو گی۔" ایبک نے تین دن کے بعد بالآخر ٹینس ریکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"But I promise کہ Next year جب Summers میں آؤں گا تو تم سے زیادہ اچھا کھیلوں گا۔" ایبک نے اعلان کیا۔ چیس اس کے Work Sheet کا حصہ بن گئی تھی۔

"تم اگلے سال پھر آؤ گے؟" چڑیا نے بہت خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں، ہم ہر سال Summers میں انکل کے پاس ضرور آتے ہیں لیکن اتنا لمبا Stay شاید نہ کریں۔ اس بار تو پاپا کورس کے لیے امریکا میں ہیں اس لیے ہم ساری Vacations ادھر ہی گزار رہے ہیں۔" ایبک نے تفصیل سے بتایا۔ "ویسے تم اگر میرے انکل کے ساتھ کھیلو تو مجھے لگتا ہے You will beat him too" ایبک نے بات کرتے کرتے پھر موضوع بدلا۔ چڑیا مسکرا کر چیس بورڈ اور مہرے سمیٹنے لگی تھی۔ اس نے دانستاً اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے انکل اپنی بیٹی کے آس پاس بھی اس کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔

"نانا، ایبک کہتا ہے میں بہت اچھا کھیلتی ہوں۔" اس شام چڑیا نے بے حد خوشی کے عالم میں خیر دین کے ساتھ ایبک کی ستائش شیئر کی تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ تو تم کھیلتی ہو..... میں تو ہمیشہ بتاتا ہوں تمہیں۔'' خیر دین نے مسکرا کر اس کی بات سنتے ہوئے کہا۔

''اور ایک کہتا ہے اگر میں صاحب کے ساتھ کھیلوں تو ان کو بھی Beat کر سکتی ہوں۔'' چڑیا نے فخریہ انداز میں ایک کا اگلا جملہ دہرایا۔

''نہیں..... نہیں چڑیا۔ ہمیں صاحب کو ہرانے کا نہیں سوچنا چاہیے..... صاحب تو بڑا لائق ہے..... بہت بڑا افسر ہے..... اس کو ہرانا آسان تھوڑی ہوتا ہے..... اور پھر کیوں ہرائیں..... '' خیر دین نے فوراً چڑیا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''جی نانا۔'' وہ کچھ بجھ گئی۔ اس کا خیال تھا خیر دین ایک کی اس تعریف پر بہت خوش ہوگا۔

اس دن ایک نے بھی گھر میں چڑیا کا ذکر کیا تھا۔ اپنے انکل کے ساتھ چیس کھیلتے ہوئے اور وہی لفظ دہرائے تھے جو اس نے چڑیا سے کہے تھے۔

''انکل! وہ اتنا اچھا کھیلتی ہے کہ آپ کو بھی Beat کر سکتی ہے۔'' اس کے انکل اس کی بات پر ہنس دیے۔ وہ بچوں کی تعریفوں اور دعوؤں پر غور کرنے کے عادی نہیں تھے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں انکل۔'' ایک کو جیسے ان کا ہنسنا یا دوسرے الفاظ میں اس کا مذاق اڑانا اچھا نہیں لگا تھا۔

''وہ تم کو ہرا سکتی ہوگی لیکن مجھے نہیں ہرا سکتی..... سمجھے تم..... انا طولی کا ریوف نہیں ہے وہ..... اور نہ تم۔'' اس کے انکل نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''اچھا تو پھر آپ اس کے ساتھ کھیل کر دیکھیں۔'' ایک نے جیسے چیلنج کیا۔

''اور مجھے انا طولی پسند نہیں ہے۔ کیسپر وف پسند ہے۔'' اس نے اس پلیئر پر اعتراض کیا جس کے ساتھ اس کے انکل اسے اور چڑیا کو ملا رہے تھے۔

''چلو دیکھوں گا کسی دن فی الحال تو تمہارے لیے چیک میٹ ہے۔'' اس کے انکل نے اپنا مہرہ اس کے بادشاہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے وہ اس لیے نہیں جیتتی کہ وہ اچھا کھیلتی ہے، تم اس لیے ہارتے ہو کیونکہ تم اس سے زیادہ برا کھیلتے ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر ٹیبل چھوڑ گئے۔

☆☆☆

عقبی لان میں بڑی ایزی چیئرز کے درمیان پڑے ریڈیو پر برائن ایڈمز کا Summer of 69 بج رہا تھا جب شہر بانو باہر نکلی تھی۔ شیر دل کچھ دیر پہلے وہیں ایک ایزی چیئر پر برمودا شارٹس میں نیم دراز آج کے نیوز پیپرز دیکھتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ صبح ہلکی بارش ہوئی تھی اور آسمان پر ابھی بھی ہلکے بادل تھے اور ان دونوں چیزوں نے اس وقت باہر کے موسم کو بے حد خوشگوار کر دیا تھا اور اس موسم میں برائن ایڈمز کے اس Song نے شہر بانو کو بہت کچھ یاد دلایا تھا..... بہت سے خاص..... خوش گوار..... زندگی بھر نہ بھولنے والے لمحے یادیں..... جو برائن ایڈمز کے اس Song کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے قدموں کو باہر کھینچ لانے والی چیز بھی اس گانے کی آواز ہی تھی..... موسم نہیں..... وہ ویک اینڈ تھا اور وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی جاگی تھی اور اب انٹر کام کے کام نہ کرنے کی وجہ سے کچن میں ملازم کو ناشتے کے لیے ہدایات دے کر آئی تھی جب کار یڈور سے



گزرتے ہوئے اس نے لان میں بجتا ہوا یہ Song سنا تھا۔ شیر دل میوزک کا شوقین تھا اور ویک اینڈز پر فرصت میں پرانے انگلش Songs سننا اس کی ہابیز میں سے تھا۔ اس وقت بھی لان میں وہی ہو سکتا تھا۔

شہر بانو ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گئی..... سامنے ٹیبل پر پڑے چائے کے کپ کو اس نے ہاتھ بڑھا کر چھوا، وہ ہلکا سا گرم تھا۔ کپ میں ہمیشہ کی طرح چائے کی کچھ مقدار موجود تھی۔ وہ یقیناً ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ شیر دل کو عادت تھی ہمیشہ چائے کے کپ میں چائے چھوڑنے کی..... وہ چائے بہت پیتا تھا لیکن وہ چائے اسی طرح پیتا تھا۔ برائن ایڈمز کی آواز اور گنار ماحول کی خاموشی کو عجیب انداز میں رومینٹک کر رہے تھے یا یہ ہمارے اپنے دل کی کیفیت ہوتی ہے جو ایک عام گانے کو ہر بار بجنے پر یا کسی خاص گانے کو کسی خاص لمحے میں بجنے پر یادگار بنا دیتی ہے۔ شہر بانو نے زیر لب گانے کے بول گنگناتے ہوئے چائے کے مگ میں کچھ اور چائے بنائی۔ شیر دل کو اپنی چائے کپ میں چھوڑنے کی عادت تھی اور اگر وہ اکیلا چائے پی رہا ہوتا اور شہر بانو پاس ہوتی تو وہ ہمیشہ اس کے چھوڑے ہوئے وہ تین چار گھونٹ خود پی لیتی تھی۔ یہ عجیب سی عادت تھی اور اس کا آغاز ان کے ہنی مون کے دوران ہوا تھا۔ وہ چائے کی شوقین نہیں تھی اور امریکا میں اکٹھے تعلیم حاصل کرنے کے دوران وہ شیر دل کی اس عادت سے واقف تھی کہ وہ کپ میں بہت سی چائے چھوڑ دیتا تھا اور وہ جتنی چائے چھوڑتا تھا وہ چائے کی وہ مقدار تھی جو شہر بانو عام طور پر ایک وقت میں پی پاتی تھی اور ہنی مون کے دوران ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ کہیں باہر گھومتے پھرتے چائے کا ایک کپ لیتے۔ شیر دل عادتاً چائے چھوڑتا اور شہر بانو وہ چائے پی لیتی۔ اس عادت پر سب سے پہلا اعتراض شیر دل کو ہی ہوا تھا۔

''تم کیوں پی رہی ہو یار..... Leave it..... مجھے تو عادت ہے۔'' اس نے پہلی بار اس کی بقیہ چائے پینے کی کوشش پر کپ اس کے ہاتھ سے لے کر خفگی کے عالم میں پھینک دیا تھا۔

''کیا ہو گیا..... ویسے ایک دوسرے کی جھوٹی چیزیں نہیں کھا رہے کیا؟'' شہر بانو بھی جواباً خفا ہوئی۔

''پر یہ تو میری بچی ہوئی چائے ہے۔'' شیر دل نے اسے جتایا۔

''تو؟''

''یار میں عورتوں کی Equality پر Believe کرتا ہوں..... یہ شوہروں کا جھوٹا کھانے والی بات میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Digest نہیں کر سکتا۔ "You don't have to do this" شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"تم میرے شوہر نہیں ہو شیر دل اور میں اپنے شوہر کا جھوٹا نہیں کھا رہی۔ نہ میں جھوٹا کھانے والی لڑکی ہوں تم بس وہ مرد ہو جس سے میں دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں ٹرسٹ کرتی ہوں And I find it very romantic to sip your tea" شہر بانو نے جواباً اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو یار تم پہلے پی لیا کرو نا۔" شیر دل نے آفر کی۔

"تم پھر بھی کپ میں چائے چھوڑ دو گے۔" شہر بانو نے چیلنج کیا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ مجھے پینے دیا کرو اگر میں پینا چاہتی ہوں۔" شیر دل کچھ دیر الجھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"شمی لڑکیوں کے دماغ میں کسی نہ کسی حد تک خرابی ضرور ہوتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے خرابی نہ ہو تو ہم شادی کیوں کریں؟" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"On the way you held my hand
I knew that it was now or never
Those were the best days of my life
Back in the summer of 69"

چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرائی۔ وہ اب بھی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ شیر دل اردگرد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ بجتا ہوا ریڈیو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ آس پاس ہی کہیں تھا اور تھوڑی دیر میں واپس وہاں آ جاتا۔

دو مالی لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔ شہر بانو کی طرح متوجہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کی یا شاید شیر دل کی باہر موجودگی کی وجہ سے بڑی مستعدی سے کام کر رہے تھے۔

انگریزوں کے زمانے کی ہر سرکاری رہائش گاہ کی طرح وہ ڈی سی ہاؤس بھی وسیع و عریض رقبے پر شہر کی ایک پرائم لوکیشن پر تھا جو یقیناً انگریزوں کے زمانے میں شہر سے بہت ہٹ کر واقع ہوگا۔ عمارت کے چاروں طرف لان کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی اور عمارت کے عقب میں سرونٹ کوارٹرز کے لیے کچھ حصہ مختص تھا۔ شیر دل اور وہ کچھ مہینوں پہلے جب یہاں منتقل ہوئے تھے تو گھر کے سامنے والے لان اور عقب میں موجود کچن گارڈن کے علاوہ گھر کے چاروں اطراف میں موجود لان گھاس پھونس اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ سالوں پرانے درخت اور پودے تراش خراش سے محروم چلے آ رہے تھے۔ بیرونی دیواروں پر چڑھی بیلوں کے نیچے موجود دیواروں نے شاید صدیوں سے سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی اور نمی دیواروں کا جو حال کر سکتی تھی اس نے وہی کیا تھا۔ بہت سے پودے مناسب نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ عدم توجہی کی بنا پر اپنی جگہ پر اسی حالت میں موجود تھے۔ انہیں زمین سے اکھاڑ نکالنے کے لیے جس وقت اور محنت کی ضرورت تھی وہ گھر کے مالک کی ہدایات اور دلچسپی کے بغیر کسی مالی کی طرف سے ملنا مشکل تھا۔ عمارت کے عقب میں موجود کوارٹرز کے ساتھ ایک حصے میں پھل دار درختوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن میں سے کچھ درخت اب اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور پتوں کے ڈھیر سے زمین بھر دینے کے علاوہ کوئی اور خدمت کرنے سے قاصر تھے۔ اگر ان پھل دار درختوں سے گھر کے مکین مستفید ہو رہے ہوتے اور مسلسل لان کا جائزہ لیتے رہے ہوتے تو وہ درخت مناسب وقت پر Replace ہو جاتے مگر اتنے وسیع و عریض لان میں ہر طرف جانا اور خاص طور پر سرونٹ کوارٹرز والے حصے میں کبھی بھی کسی آفیسر یا اس کی فیملی کے لیے دلچسپی کا کام نہیں تھا۔ ان درختوں سے اترنے والا پھل وہیں سرونٹ کوارٹرز میں موجود ملازم استعمال کرتے یا پھر صاحب کے کچن میں اس کی تھوڑی بہت سپلائی جاری رکھتے۔ سرونٹ کوارٹرز کی اپنی حالت ان کے شفٹ ہونے پر بے حد مخدوش تھی۔ سفیدی یا رنگ روغن نام کی کوئی شے وہاں مستقبل قریب میں تو ایک طرف ماضی بعید میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ کوارٹرز کی سیلن زدہ دیواریں کئی جگہوں پر کائی اور بے ہنگم چڑھی ہوئی بیلوں سے بھری ہوئی تھیں جو ان سرونٹ کوارٹرز میں مقیم ملازمین کی کانٹ چھانٹ کے باوجود بار بار پھیل جاتی تھیں عمارت کے عقب میں کچن گارڈن وہ واحد جگہ تھی جہاں بے حد منظم انداز میں باغبانی ہو رہی تھی اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ کچن گارڈن اس عمارت میں مقیم تمام سرونٹس کے کھانے کی ضروریات پوری کر رہا تھا ورنہ شاید وہاں بھی موسمی سبزیوں کے بجائے وہی جھاڑ جھنکاڑ ہوتا جو عمارت کے باقی دو اطراف کے لان میں تھا۔

عمارت کے داہنی طرف کے لان میں کسی زمانے میں شاید ٹینس کورٹ بنایا گیا ہوگا۔ اس کا اندازہ شیر دل اور شہر بانو بھی نہ کر پاتے اگر وہ خود ٹینس پلیئرز نہ ہوتے اور گھاس پھونس کے اس جنگل سے گھاس کے نشیب و فراز کو جانچتے ہوئے ایک عدد گراس کورٹ کے Fossils نہ دریافت کر لیتے۔

عمارت اور اس سے ملحقہ لانز کی زبوں حالی کی اگر ایک وجہ اس میں رہائش پذیر آفیسر کی اس کی تزئین و آرائش میں عدم دلچسپی تھی تو دوسری وجہ مینٹیننس کے لیے مناسب فنڈز کی عدم دستیابی بھی تھی۔ اتنی بڑی عمارت کا انتظام و انصرام کسی کے لیے بھی خالہ جی کا گھر نہیں تھا خاص طور پر ایک ایمان دار آفیسر کے لیے اور وہ بھی ایسا آفیسر جو خاندانی اعتبار سے بھی خاصا سفید پوش ہو سرکاری خزانے کو ایک خاص حد اور بجٹ سے زیادہ ڈی سی ہاؤس پر خرچ کرنے کے لیے جس جرأت، چالاکی اور ہاتھ کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیر دل کے پیش رو





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نہیں تھی، شیر دل میں تھی۔ اس لیے عمارت اور اس کے لانز کے ساتھ ساتھ سرونٹ کوارٹرز کی حالت بھی دنوں میں بدلی تھی۔ شیر دل ہارڈ ٹاسک ماسٹر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ Workaholic بھی دوسرے آفیسرز کی طرح وہ صرف عمارت کے اس حصے تک خود کو محدود نہیں رکھتا تھا جو اس کی رہائش گاہ تھی۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاتا اور اس کی اس عادت نے جہاں عملے کو بے حد مستعد اور پریشان کر رکھا تھا وہاں دوسری طرف ڈی سی ہاؤس کے دن واقعی پھر گئے تھے۔ سرونٹ کوارٹرز میں تقریباً پندرہ سالوں بعد بڑے پیمانے پر مرمت کا کام ہوا تھا۔ ڈی سی کی اپنی رہائش تو خیر ہر سال ہی Renovate ہوتی تھی۔ شیر دل اپنے ماتحت عملے کے حوالے سے خاصا فیاضانہ رویہ رکھتا تھا اور وہ جہاں بھی پوسٹڈ رہا تھا اس نے اس معاملے میں اپنے لیے خاصی پسندیدگی اور نیک نامی کمائی تھی۔ جب تک سرونٹ کوارٹرز میں کام ہوتا رہا وہ تقریباً ہر روز آفس جانے سے پہلے یا واپس آنے کے بعد پیچھے کا ایک چکر ضرور لگا کر آتا۔ عمارت کے عقب میں وہ تمام پھل دار درخت کاٹ دیے گئے تھے جو اب اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور بہار کے موسم میں کچھ نئے پودوں کی قلمیں بھی لگائی گئی تھیں۔ صرف سرونٹ کوارٹرز اور عمارت کی ہی کایا کلپ نہیں ہوئی، لانز کی شکل صورت بھی بدل گئی تھی۔ چند مہینے پہلے بہار کے موسم میں لگائے ہوئے بیجوں کی پنیری اب ہر جگہ کو سرسبز اور رنگین کیے ہوئے تھی۔ گرمیوں کا موسم آجانے کے باوجود لان میں پھولوں کی ایک بڑی تعداد مختلف کیاریوں میں کسی نہ کسی حالت میں تھی۔ بہت سارے نئے دیسی اور بدیسی پودوں اور پھولوں کا اس ڈی سی ہاؤس میں اضافہ ہو گیا تھا اور ٹینس کورٹ ایک بار پھر ''معرضِ وجود'' میں آ گیا اور تمام تبدیلیوں میں شیر دل کے ساتھ شہر بانو کا بھی کلیدی کردار تھا۔ Horticulture اس کا سبجیکٹ نہیں تھا لیکن اسے اس میں دلچسپی تھی۔

وہ اب تک جہاں بھی پوسٹڈ رہے تھے شہر بانو گھر کی Renovation ضرور کرتی تھی اور جب تک اس کی Renovation ختم ہوتی ان کی اگلی پوسٹنگ کے آرڈرز آ جاتے۔ اسے یقین تھا کہ ان کے بعد آنے والوں کو اس سے Well maintained گھر زندگی میں نہیں ملے ہوں گے۔ شہر بانو کے لیے یہ ایکٹیوٹی جیسے اپنے پروفیشن کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے جڑے رہنے کی ایک کوشش بھی تھی جس کو وہ شیر دل کی جاب کی وجہ سے بالائے طاق رکھے ہوئے تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد ابتدائی طور پر چھوٹے موٹے پرابلمز ہونے کے بعد سب کچھ آہستہ آہستہ سیٹ ہوتا گیا تھا۔ وہ خوف اور عدم تحفظ کا احساس جس کا شکار شہر بانو وہاں آتے ہی ہو گئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا۔ شیر دل نے اگرچہ اسے پہلی بار خود بخود دروازے کھلنے کے بارے میں نہیں بتایا لیکن اس کے بعد اوپر نیچے ایسے کئی واقعات ہوئے کہ شیر دل کو ہر بات شہر بانو سے چھپانی مشکل ہو گئی تھی۔ شہر بانو نے بھی آہستہ آہستہ وہاں ایسی کئی چیزیں محسوس کی تھیں جنہیں وہ اگنور نہیں کر پائی لیکن کمروں کے دروازے خود بخود بند ہونا اور کھل جانا جیسے اب ایک معمول کی بات تھی اس کے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی چیزیں خود بخود غائب ہوتیں پھر کچھ دنوں بعد واپس آ جاتیں۔ استری کے لیے نکالے ہوئے کپڑے غائب ہو جاتے اور ایک بار تو استری ہی تین دن غائب رہی۔ مثال کے گم ہونے والے کھلونے واحد چیز تھی جو دوبارہ نہیں ملتے تھے۔ شہر بانو اور شیر دل شروع کے شاکس اور Set backs کے بعد آہستہ آہستہ ان تمام Experiences اور واقعات کے عادی ہوتے چلے گئے۔ خوف کی وہ کیفیت جو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## اردو کا جنازہ

''1900ء میں یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل نے اردو کے خلاف مہم شروع کی تو نواب محسن الملک نے اس کا جواب دینے کے لیے لکھنو میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ جس میں میں بھی شریک ہوا۔ محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش و خروش سے تقریر کی' اس کی نظیر میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یوں سمجھیے کہ الفاظ کا ایک لاوا تھا جو ابل ابل کر پہاڑ سے نکل رہا تھا۔ آخر میں نواب محسن الملک نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اردو کو مٹانے پر ہی تل گئی ہے تو بہت اچھا' ہم اردو کی لاش کو گومتی دریا میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اقتباس: نور احمد چشتی کی کتاب ''یادگار چشتی'' سے

شروع میں شہر بانو کے سر پر سوار رہتی تھی اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ لوگ وہاں باقاعدگی سے قرآن خوانی کروانے کے عادی تھے، ہفتے میں ایک بار ہونے والی قرآن خوانی کے اثرات چند ہی ہفتوں میں نظر آنا شروع ہو گئے۔ پہلے کی نسبت ان غیر معمولی واقعات کا تناسب بہت کم ہو گیا تھا خاص طور پر گھر میں کبھی کبھار رات کو آنے والی آوازوں کا، اوپر والا ماسٹر بیڈ روم اب شیر دل کے زیرِ تصرف ایک اسٹڈی روم کی شکل اختیار کر چکا تھا اور جب سے وہ کمرا آباد ہوا تھا اس گھر میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات بڑی تیز رفتاری سے کم ہوئے تھے۔ شہر بانو نے اسٹڈی بننے کے بعد شروع میں بہت عرصے تک شیر دل کو رات کو اکیلے اس اسٹڈی میں کام کرنے نہیں دیا۔ وہ خود بھی کام کے دوران اس کے پاس کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی تھی اور تب تک وہیں موجود رہتی جب تک شیر دل کام کر رہا ہوتا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ مطمئن ہوتی چلی گئی کہ اس گھر اور خاص طور پر اس کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے شیر دل کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا۔

گرمیوں کا سیزن شروع ہو چکا تھا اور اب اس سیزن کے آغاز کے ساتھ ہی ان کے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ شہر بانو کے اپنے ننھیالی رشتے دار زیادہ تر ملک سے باہر تھے۔ اس کے والدین اور دونوں بھائی بھی امریکا میں ہی تھے۔ شیر دل سے شادی کے بعد اتنے سالوں میں وہ بہت کم امریکا گئی تھی اور اس کی فیملی میں سے کوئی ایک بار بھی اس سے ملنے پاکستان نہیں آ سکا تھا لیکن شیر دل کی اپنی فیملی بہت لمبی چوڑی تھی۔ فرسٹ اور سیکنڈ کزنز کی ایک بڑی تعداد جن میں سے زیادہ تر سول سروس سے ہی منسلک تھے یا پھر مختلف انٹرنیشنل آرگنائزیشنز اور بارڈیز کے ساتھ اور وہ سب آپس میں بہت میل جول رکھے ہوئے تھے۔ خود شیر دل کو بھی اپنے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا بہت پسند تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور فیملی کے پسندیدہ ترین انکلز اور بچوں میں سے تھا اور اتنا پاپولر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یا وہ ہر وقت کہیں نہ کہیں انوائٹ ہوتے یا پھر کوئی نہ کوئی ان کو وزٹ کر رہا ہوتا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بھی اس کے رشتے داروں ہی کی طرح وسیع تھا۔ شہر بانو، شیر دل کے برعکس زندگی کا بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے بے حد محدود میل جول کی عادی تھی۔ اس کی فیملی زیادہ سوشل نہیں تھی اور وہ ان سے زیادہ Aloof..... اس کے گنتی کے چند دوست تھے اور شیر دل سے شادی کے بعد ان سے بھی اس کا رابطہ بہت محدود ہو گیا تھا..... تہواروں اور برتھ ڈے Greetings کے علاوہ وہ کم ہی کسی سے رابطہ رکھ پاتی تھی۔ اس کی زندگی شیر دل اور مثال سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو جاتی تھی اور بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ بھی شیر دل کے ذریعے اور اس کے ساتھ ہی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ شیر دل کے لائف اسٹائل اور فطرت کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کرنے میں شہر بانو کو وقت لگا تھا لیکن یہ تبدیلی اسے اچھی لگی تھی۔ سالوں لوگوں سے نہ ملنے کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں سے ملنا اور ان سے تعلقات بنانا مشکل سہی لیکن دلچسپ تھا۔

شیر دل کی بہن ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے ان کے ہاں آئی ہوئی تھی، آئزہ شیر دل سے بہت کلوز تھی اور اس کے بچے بھی... ہر سال Summers میں وہ ضرور کچھ دنوں کے لیے شیر دل کے پاس آتی تھی۔ آئزہ اور اس کے بچوں کی وجہ سے شہر بانو کے پاس ایک دم جیسے ایک نئی مصروفیت آ گئی تھی۔ وہ دونوں تقریباً روز ہی شہر کو Explore کرنے نکلی ہوتیں۔ وہ کام جو شہر بانو امریکا میں اکیلے کر سکتی تھی لیکن پاکستان میں نہیں خاص طور پر شیر دل کی بیوی ہونے کی وجہ سے

ریڈیو پراب کوئی اور Song چلنے لگا تھا جب شیر دل اور اس کا ناشتا ایک ہی وقت میں آئے تھے۔ ملازم ٹیبل پر ناشتا لگا رہا تھا جب شیر دل اس کے پاس آ کر بیٹھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''مجھے بھی ایک کپ چائے بنا دو۔'' شیر دل نے ملازم کو ہدایت دی اور ساتھ ہی ریڈیو اٹھا کر اس نے اس کی ٹیوننگ شروع کر دی۔

''Summer Of 69 چل رہا تھا ابھی۔'' شہر بانو نے مسکراتے ہوئے شیر دل سے کہا۔

''اوہ... اچھا۔'' وہ بھی چونک کر مسکرایا اپنی چپل اتار کر اس نے سینٹر ٹیبل کے ایک کونے میں اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے ٹکائی تھیں۔ ریڈیو پر دوبارہ وہی چینل ٹیون کرنے کے بعد اس نے ریڈیو ٹیبل پر رکھا اور ملازم سے چائے کا کپ تھام لیا۔ ملازم چائے کے پہلے برتن سمیٹ کر لے گیا تھا۔

''آئزہ سو رہی ہے ابھی؟'' شیر دل نے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا۔

''ہاں، میرا خیال ہے... نوریہ کو بخار تھا کل رات اس کی وجہ سے کافی لیٹ ہی سوئی... تم کہاں تھے، میں بہت دیر سے یہاں آ کر بیٹھی ہوں۔'' شہر بانو نے دلیے کا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔

''گیٹ تنگ گیا تھا یار... اب مجھے پتا تھوڑی تھا کہ تم بھی باہر آ جاؤ گی۔'' شیر دل نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ شہر بانو کچھ کہتی ٹیبل پر پڑا شیر دل کا فون بجنے لگا۔ شیر دل چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھانے کے لیے سیدھا ہوتا شہر بانو نے فون اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔

''اب کوئی لمبی کال کر کے مت بیٹھ جانا۔'' اس نے ساتھ ہی شیر دل کو وارننگ دی۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے مسکرا دیا۔ پھر اس نے فون پکڑتے ہوئے چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ہیلو... وعلیکم السلام فیاض... کیسے ہو یار؟'' وہ اب کسی سے بات کرنے لگا تھا۔ شہر بانو نے پیالے میں موجود دلیہ تقریباً ختم کر لیا تھا جب اس نے شیر دل کو کہتے سنا۔

''اچھا، پوسٹنگ آرڈرز آ گئے ہیں تمہارے... کہاں پوسٹنگ آئی ہے... Great... تو تمہاری جگہ کون آ رہا ہے؟... عکس؟... Is she back?'' شیر دل کے انداز میں کچھ تھا کہ وہ بے ساختہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے شیر دل کو ٹیبل سے بے اختیار اپنی ٹانگیں ہٹاتے اور سیدھے ہو کر بیٹھتے دیکھا تھا۔ شہر بانو نے یہ بھی نوٹس کیا تھا۔

(جاری ہے)



# پھیکی نہیں میٹھی عید

بشریٰ نثار

کراچی شہر کا ٹریفک، اس کا شور، گرمی، روزہ اور پھر کام کی تھکاوٹ، احمد علی کا دل کر رہا تھا کہ بائیک کو اڑا کر گھر پہنچ جائیں اور پھر اپنی حرم جس کی طرف دیکھ کر ہی ان کی ساری تھکاوٹ اتر جایا کرتی ہے، اسے ڈھیر سارا پیار کریں۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنیں۔

حرم کا خیال آتے ہی انہیں اس کا رمضان کے ساتھ شروع ہونے والا عید کے لیے نئے جوڑے کا روزانہ کیا جانے والا معصومانہ مطالبہ بھی یاد آ گیا۔ جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو آج سولھواں روزہ ہونے کے باوجود بھی وہ پورا نہیں کر پائے تھے۔ باقی تینوں بچے تو بڑے ہونے کی وجہ سے کافی سمجھداری کا مظاہرہ کیا کرتے.....

آٹھ سالہ حرم گھر میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی حیثیت سے گھر میں ان کے داخل ہوتے ہی ٹانگوں سے لپٹ کر اپنی میٹھی اور معصومی توتلی زبان میں نہ صرف سارے محلے کے بچوں کی شکایتیں کیا کرتی بلکہ اپنی فرمائشیں بھی بتایا کرتی اور آج کل اس کی فرمائش عید کے لیے نئے کپڑے تھے۔ جسے پورا کرنا ان کے لیے مشکل کیا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن اتوار کا تھا، وہ گھر پر تھے اور ذہن مسلسل سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ کسی طرف سے کچھ پیسے آنے کی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ادھار لینے پر بیگم رضامند نہیں تھیں تو پرانے کپڑے پہننے پر حرم خوش نہیں تھی۔

وہ کریں کیا؟ انہی سوچوں میں گم تھے کہ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح ان کے ذہن میں کوندا۔

وہ اپنے طالب علمی کے زمانے سے لے کر شادی کے بعد تک کچھ عرصہ بہت اچھا لکھتے رہے تھے۔ ان کے کئی افسانے شہر کے مشہور پرچوں میں لگا کرتے تھے اگرچہ اس کام کو چھوڑے انہیں ایک لمبا عرصہ بیت چکا تھا مگر آج بھی ان پرچوں کے ایڈیٹر صاحبان ان سے کچھ لکھنے کی فرمائش اکثر کیا کرتے .....تو آج انہیں خیال آیا کہ وہ دوبارہ کچھ لکھتے ہیں، اس سے اتنے پیسے تو آ ہی سکتے ہیں کہ حرم کے لیے بہت اچھا نہیں تو مناسب سا ایک جوڑا ہی بن سکے۔

وہ اسی وقت کاغذ اور پینسل لے کر بیٹھ گئے۔

لکھنے کا تجربہ بہت خوشگوار رہا۔ تقریباً سارا دن آدھی رات سے زیادہ دیر تک لکھنے کے بعد وہ ایک مختصر سا افسانہ لکھ چکے تھے اور پھر اگلے ہی دن وہ یہ افسانہ لے کر ایک مشہور ماہوار پرچے کے ایڈیٹر کے آفس میں موجود تھے۔ ایڈیٹر صاحب خوش تو بہت ہوئے کہ ان کا پرانا رائٹر دوبارہ سے ان کے سامنے بیٹھا ہے مگر افسانے کو بغور پڑھ کر بولے۔

''احمد علی صاحب لکھا تو آپ نے کمال ہے، ہمیں اپنے عید کے شمارے کے لیے تحریروں کی ضرورت بھی ہے مگر آپ کا افسانہ قدرے پُرآشوب ہے، آپ کی تحریر میں وہ پہلے جیسی شگفتگی چاشنی اور تازگی نہیں ہے، عید کا موقع ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اردگرد، ملک میں، ملک سے باہر شہر اور دوسرے شہروں میں مہنگائی، بے روزگاری سے لے کر دہشت گردی تک جیسے مسائل میں پھنسے قارئین کو کچھ تفریح فراہم کی جائے۔ آپ کوشش کریں اور کوئی نمکین میٹھی یا چلبلی سی تحریر لکھ کر لائیں۔ اس تحریر کے لیے تو معذرت۔''

ایڈیٹر صاحب کا جواب سن کر وہ چپ کے چپ ہی رہ گئے کہ پُرآشوب دور میں جہاں ہر طرف مسائل کا انبار ہے وہ کیسے ان سب مسائل سے نظریں چرا کر کوئی میٹھی، نمکین سی تحریر لکھ کر لائیں۔ انہیں تو اپنی حرم کی عید کو میٹھا بنانا تھا کیونکہ بقول اس کے نئے کپڑوں کے بغیر اس کی عید بہت پھیکی ہوگی۔

آج شام جب وہ پہلے سے بھی زیادہ تھکے ہوئے گھر پہنچے تو خلاف توقع حرم نے ان سے نئے کپڑوں کی فرمائش نہیں کی، باقی ساری باتیں کیں محلے کے بچوں کی، فرینڈز کی لیکن کپڑوں کا ذکر کرنا شاید وہ بھول گئی یا شاید کر، کر کر تھک گئی..... اور یہ خیال ان کے دل کو اور سوگوار کر گیا۔

جوں جوں عید کے دن نزدیک آ رہے تھے انہیں وہ ہنگامہ نظر آ رہا تھا جو حرم نئے کپڑے نہ ہونے پر کرے گی دل کر رہا تھا ابھی جا کر کسی بھی طرح سے نیا جوڑا لا دیں مگر کیسے؟ انہی سوچوں میں گم جب نماز عشا



سے فارغ ہو کر وہ بستر پر گئے تو سوچا ایڈیٹر صاحب نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ کیوں نہ ایک دفعہ پھر کوشش کی جائے.....اور پھر کاغذ اور پینسل لے کر بیٹھ گئے۔

تمام رات کی کوشش کے بعد وہ ایک اور مختصر سا افسانہ لکھ چکے تھے مگر اس دفعہ انہوں نے ایڈیٹر صاحب کی فرمائش کا خیال رکھتے ہوئے تحریر کو اچھا خاصا نمکین بلکہ چٹپٹا بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی رہے تھے۔ اگلے دن آفس سے واپسی کے بعد انہوں نے وہ افسانہ ساتھ لیا اور اسی ایڈیٹر کے پاس جانے کے بجائے راستے میں آنے والے ایک اور ماہوار پرچے کے ایڈیٹر صاحب کے آفس میں بیٹھے تھے۔ اس پرچے میں بھی پہلے ان کے بہت سے افسانے لگ چکے تھے۔ ایڈیٹر صاحب ان کو اتنے عرصے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان سے علیک سلیک کے بعد وہ افسانہ پڑھنے لگے اور پھر کچھ ہی دیر میں گویا ہوئے۔

''احمد صاحب بھئی واہ! کیا گدگداتی تحریر ہے آپ کی، بالکل ویسی ہی تازگی ہے اس میں جیسی پہلے آپ کی تحریروں میں ہوا کرتی تھی مگر بات یہ ہے کہ احمد صاحب تب کے تو زمانے ہی اور تھے تھوڑا بہت امن و آشتی کا دور دورہ تھا ملک میں۔ بھئی اب جہاں لوگوں کو اتنے مسائل درپیش ہیں ہم کیسے انہیں میٹھی گولیاں کھلا کر سلا سکتے ہیں؟ آپ ایسا کیجیے حالات حاضرہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے کوئی اچھی سی تحریر لے آئیے جس میں عید کے موقع پر بھی لوگوں کو حقیقت کا آئینہ دکھا سکیں۔ اس تحریر کے لیے تو ہماری طرف سے معذرت..... آپ تو جانتے ہیں مقابلے کا دور ہے، بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

ایڈیٹر صاحب تو جانے کیا کیا کہہ رہے تھے مگر وہ چپ چاپ گنگ ہو کر بے یقینی کی سی کیفیت میں سن رہے تھے۔

کیسی عجیب الجھن میں پھنس گئے تھے وہ.....

آج جب وہ اور زیادہ مایوسی کی حالت میں گھر جا رہے تھے تو سوچ رہے تھے کہ حرم کو آج کسی بھی طرح پیار سے بہلا کر اس عید پر نئے کپڑے نہ پہننے کے لیے راضی کر لیں گے اور اگلی عید پر دو جوڑے دلانے کا وعدہ بھی کریں گے۔ شاید اس طرح وہ مان جائے۔

مگر جب وہ گھر پہنچے حرم نے خلاف معمول ان سے پھر نئے جوڑے کی فرمائش بالکل نہیں کی۔ دو تین دن سے وہ ایسا ہی کر رہی تھی، وجہ سمجھ سے باہر تھی کہ اچانک اس کی شدید ضد اتنی خاموشی میں کیوں بدل گئی۔ آج تیسواں روزہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت مایوسی کی حالت میں سرخ اینٹوں والے مگر بے حد صاف ستھرے صحن میں چادر بچھی چارپائی پر نیم دراز آسمان کو تکے جا رہے تھے۔ حرم کی مما کچن میں افطاری کی تیاری کر رہی تھیں اور بچے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔

اچانک ان کا دل گھبرانے سا لگا تھا شاید سوچوں کا اثر تھا، انہوں نے آواز دے کر حرم کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے اپنے بازو کا تکیہ بنا کر ساتھ لٹا لیا۔

''میرا بیٹا ناراض ہے پپا سے؟'' اُن کے لہجے میں عجیب سی یاس تھی۔

''نہیں پپا، میں آپ سے کیوں ناراض ہوں گی۔'' اس کے معصوم اور میٹھے لہجے میں انہیں عجیب سا حوصلہ دیا۔

''تو پھر پپا سے اب آپ شکایتیں اور فرمائشیں کیوں نہیں کرتیں؟'' انہوں نے اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''پپا آپ کو پتا ہے، ہماری نئی ٹیچر آئی ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ شکایتیں کرنا بری بات ہوتی ہے۔''

''اچھا.....؟ مگر کیوں؟ بری بات ہے؟ پپا سے تو کر سکتی ہے نا میری بیٹی اور پھر میری بیٹی نے تو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نئے کپڑوں کی فرمائش بھی کرنا چھوڑ دی ہے پپا
سے۔'' وہ بہت پیار سے اب اس کے بالوں میں
انگلیاں پھیر رہے تھے۔

''پپا ہماری ٹیچر بتا رہی تھیں کہ کسی بزرگ کا
قول ہے، انہوں نے تو ان بزرگ یا پتا نہیں صحابہ
کرام تھے ان کا نام بھی بتایا تھا جو مجھے یاد نہیں
آرہا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے فرمایا تھا۔ کوئی
بھی پریشانی، مصیبت یا مشکل ہو تو وہ چپ رہنے
سے کم ہو جاتی ہے اور صبر کرنے سے ختم ہو جاتی ہے
اور شکر کرنے سے خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پپا
مجھے ان کی یہ بات بہت اچھی لگی اور میں نے سوچ لیا
کہ میں آپ سے کوئی شکایت نہیں کیا کروں گی نہ کوئی
فرمائش۔'' حرم کے معصوم لہجے میں کی گئی اتنی اچھی
اور میٹھی بات سن کر انہیں لگا وہ دنیا کے سارے غم
بھول گئے ہوں۔

''مگر بیٹا آپ تو کہتی تھیں کہ نئے کپڑوں کے
بغیر آپ کی عید پھیکی ہو گی؟''

''نہیں پپا، میری عید میٹھی ہی ہو گی۔ مجھے نئے
کپڑوں کی ضرورت نہیں۔ پپا مجھے تو شکر کرنا چاہیے نا
کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ جیسے پپا دیے، مما دیں،
بہن بھائی دیے، جو مجھے اتنا پیار کرتے ہیں میں
چاہے جیسے ہی کپڑوں میں ہوں، میری عید آپ لوگوں
کے پیار سے ہی میٹھی ہو گی نا۔'' اتنی سمجھداری کی باتیں
وہ بھی اپنی آٹھ سالہ بچی کے منہ سے سن کر وہ بے یقینی
کے سے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے اور پھر بھینچ
کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اب ان کے دل کی وہ
کیفیت نہیں رہی تھی۔ حرم کی باتوں نے بہت پُرسکون
کر دیا تھا اور وہ جو کچھ دیر پہلے عجیب سوچوں میں الجھے
ہوئے تھے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بلاشبہ
حرم کی سوچ میں یہ تبدیلی اللہ پاک کی ان کی طرف وہ
مدد تھی جس کا شکر ادا کرنا بنتا ہی تھا۔

افطاری کے وقت بھی اور نماز مغرب و عشا کی
دعاؤں میں بھی وہ بار بار اللہ پاک کا شکر ادا کر رہے
تھے کہ اس نے انہیں وہ بے شمار نعمتیں دی ہیں۔ جن کا
وہ شکر ادا کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر پائیں گے۔ وہ شکر
کرتے جاتے اور روتے جا رہے تھے اور آج انہیں
عجیب سا دلی سکون محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

تیسواں روزہ بھی بخیر و خوبی گزر گیا۔ آج جب
وہ سونے کے لیے بستر پر گئے تو دماغ پر کوئی بوجھ نہیں
تھا، بہت مطمئن تھے۔ انہوں نے حرم کے کپڑوں
کے بارے میں سوچنا بالکل چھوڑ دیا کیونکہ اس
معاملے میں ان کی ساری کوششیں بھی کارگر ثابت
نہیں ہو سکی تھیں مگر ایک دم ان کے دماغ میں اچانک
ایک خیال ابھرا اور ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اگلے دن آفس جاتے ہوئے انہوں نے اپنے
حالیہ لکھے ہوئے دونوں افسانے ساتھ رکھ لیے اور
آفس سے واپسی پر پہلے دن کا لکھا ہوا پُر آشوب
افسانہ دوسرے دن والے ایڈیٹر صاحب کو دے آئے
جنہیں قارئین کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کی خواہش تھی
اور دوسرے دن کا لکھا ہوا نمکین اور چٹکیلا افسانہ پہلے
دن والے ایڈیٹر صاحب کو دے آئے جنہیں عید کے
موقع پر مسائل میں پھنسے قارئین کو تفریح فراہم کرنا
تھی۔ دونوں ایڈیٹرز صاحبان اپنی اپنی پسند مل جانے پر
بہت خوش تھے اور وہ بھی اس قابل ہو گئے تھے کہ حرم
کے لیے ایک مناسب سا عید کا جوڑا خرید سکیں۔ آج
وہ دل سے خوش تھے کیونکہ ان کی حرم کی عید آج واقعی
پھیکی سے میٹھی ہو گئی تھی اور انہیں یقین تھا کہ یہ سب
حرم کے اور ان کے شکر کرنے کا نتیجہ ہے۔



ناولٹ

# عیدِ مبارک

ناہید سلطان اختر

اماں منہ ہی منہ میں بکتی جھکتی، کمرا در کمرا
گھومتی، چیزوں کو بلا مقصد ادھر سے اٹھا کر اُدھر رکھتی
بولائی بولائی سی پھر رہی تھیں اور ابا برآمدے میں
پڑی اپنی ہی طرح عمر رسیدہ راکنگ چیئر پر بیٹھے اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے دھیرے دھیرے جھولے لے رہے تھے۔

اماں چھوٹے کمرے سے ٹکٹکی برآمدے میں بڑے تخت پر بچھے پھولدار تخت پوش کا ایک کونا پکڑ کر زور سے کھینچا اور ابا پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بولیں۔ ''راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔''

ابا نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی ڈیلا گھمایا اور اماں پر فوکس کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولے۔ ''مجھ سے کچھ کہا؟''

''نہیں... پڑوسیوں سے۔'' اماں کے لہجے میں بھناہٹ تھی۔

''اچھا... میں سمجھا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔'' ابا نے اپنی ادھ کھلی آنکھ دوبارہ بند کرلی۔

''ایک میں ہی رہ گئی ہوں اس گھر میں ساری فکریں کرنے کو۔'' اماں بڑبڑائیں۔

''نصیب دشمناں! باقی کہاں گئے؟'' ابا نے مسلسل جھولے لیتے ہوئے کہا۔

اماں نے ٹیڑھی نظر سے دیکھا ''بیٹی اپنے گھر بار کی ہوئی، باپ ہیں تو ریٹائرمنٹ کے بعد ساری فکروں سے سبکدوش، مسجد، یہ کرسی یا اخبار اللہ اللہ خیر صلا... رہے صاحبزادے تو اجنبیوں کی طرح رہتے ہیں گھر میں، دفتر سے آئے کمرا... کمرے سے نکلے دفتر...''

''شادی ہوگئی ہوتی تو آج اس گھر میں اس کے دو تین بچے کلکھلا رہے ہوتے۔''

اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور رقت زدہ لہجے میں بولیں۔ ''بس میرے زخموں کو نہ چھیڑیں... ایک ہی بیٹا اور اس کی طرف سے بھی دکھی ہوں، اچھا خیر...'' اماں نے اچانک اپنا لہجہ بدلا۔ ''کل کی بتائیں دانیہ کو لینے کے لیے آپ اکیلے ہی ائرپورٹ جائیں گے یا میں نایاب کو بھی بلالوں؟''

''نایاب آجائے تو بہت اچھا ہے، آپ نہیں چلیں گی کیا؟''

''کوئی گھر پر بھی تو ہونا چاہیے دروازہ کھولنے اور اسے خوش آمدید کہنے کے لیے... کبھی کبھی فلائٹ لیٹ بھی ہوجاتی ہے۔ سامان آنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ آنے والے مہمان کے ساتھ خود بھی تھک کر گھر واپس لوٹو تو آپ مہمان بننے کو جی چاہتا ہے، ہماری عمر اب وہ نہیں رہی... میں نایاب سے کہہ دوں گی وہ آجائے گی۔''

''جیسے آپ کی مرضی...''

''پہلی بار بھانجی آپ کے گھر آرہی ہے اور رمضان ساتھ لے کر اور آپ یوں بے فکرے بیٹھے ہیں جیسے...''

ابا نے دونوں آنکھیں کھولیں دھیرے سے مسکرائے اور اماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آپ کے ہوتے مجھے کسی بات کی فکر کرنے کی کیا ضرورت...''

اماں نے انہیں محبت سے گھورا۔

''آپ کی انہی اداؤں نے تو ہمیں ساری زندگی زیر رکھا'' ابا نے اماں کو خاصی محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

''تو یہ ہے۔'' اماں نے نظریں چرالیں۔

ابا کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

☆☆☆

دانیہ، ابا کی چھوٹی بہن ساجدہ کی بیٹی تھی۔ ساجدہ کی شادی کوئی پینتیس سال پہلے ایک مکمل طور پر غیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد شوہر انہیں انگلستان لے گئے جہاں وہ بسلسلۂ معاش مقیم تھے تین بچے ہوئے بڑی بیٹی نگینہ اس سے چھوٹا بیٹا ظہیر اور ظہیر سے چھوٹی دانیہ... چھوٹی بیٹی کی



پیدائش کے بعد ساجدہ کے شوہر کا ایک دوسری عورت سے چکر چل گیا اور انہوں نے طلاق دے دی۔ ساجدہ نے بچوں کو بہت صعوبتیں اٹھا کر پالا تھا۔

نگینہ فیشن ڈیزائنر تھی، اس نے ایک مصری نژاد اور برطانوی شہری سے پسند کی شادی کی تھی اور وسط لندن میں خوش حال زندگی بسر کررہی تھی۔ ظہیر ایک اسٹور کا مالک تھا۔ اس نے ایک اردنی لڑکی سے شادی کی تھی۔ دانیہ نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شادی کے بعد تمام برسوں میں ساجدہ صرف دو مرتبہ پاکستان آسکی تھیں۔ نگینہ اور ظہیر کو پاکستان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے خیال میں پاکستان سے ان کا تعلق بس اتنا تھا کہ وہ ان کے والدین کا وطن تھا اور بس... اپنا وطن تو وہ انگلستان کو سمجھتے تھے لیکن بڑے بھائی اور بہن کے برعکس دانیہ کا اندازِ فکر مختلف تھا۔ وہ پاکستان کو اپنا وطن کہتی اور مغرب میں رہتے ہوئے بھی مشرقی اقدار سے پیار کرتی تھی۔ کالج کے زمانے میں اس کا میلان یکایک مذہب کی طرف ہوا اور اس نے باقاعدگی سے اسلامک سینٹر جانا شروع کردیا۔ اپنے شوق و مطالعے سے اس نے اسلامی تعلیمات کو اپنا شعار بنایا تھا۔ پنج وقتہ نماز کے علاوہ وہ تہجد کی نماز بھی پڑھتی، قرآن حکیم کا بلاناغہ مطالعہ کرتی اور اپنے علم میں اہلِ خانہ کو بھی شریک کرنے کی کوشش کرتی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد سے آگہی نے اس کی زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا تھا۔ طبعاً وہ ایک نیک فطرت اور دوسروں کا خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔ چھٹی کے دنوں میں وہ گھریلو امور میں ماں کا پورا ہاتھ بٹاتی۔ اسے ماں کے دکھوں کا دل سے احساس تھا۔ جانتی تھی کہ اس کا باپ اس کی ماں کے تمام تر دکھوں کا ذمے دار بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اس کا مجرم تھا۔

لیکن یہ جاننے کے باوجود وہ اپنے دادا کے انتقال پر اپنے باپ کے گھر والوں سے ملنے پاکستان آرہی تھی۔ جب اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار ماں سے کیا تو وہ حیرانی سے اس کا منہ دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''تم اس شخص کے گھر والوں سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہو جس نے میرے ساتھ تم بھائی بہنوں کی زندگیوں کو بھی روگ لگا کر رکھا۔''

''ماما!'' اس نے ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ان لوگوں کا کیا قصور ہے؟''

''قصور ہے نا... کبھی پلٹ کر پوچھا ان لوگوں نے ہمارا حال؟''

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم بھی وہی کریں۔''

''انصاف تو یہی ہے۔''

''مگر درگزر پیاری ماما... بدلہ لینے سے معاف کردینا زیادہ افضل ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول ﷺ اپنے ایک ایک دشمن سے بدلہ لے سکتے تھے مگر آپ نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کرکے دنیا کو درگزر کا سبق دیا... مجھے پاکستان جانے کے لیے آپ کی اجازت چاہیے۔''

ساجدہ جانتی تھیں شخصی آزادی کے علمبردار دیس کی پروردہ اگر ان کے اجازت نہ دینے سے رک بھی گئی تو اسے جبر محسوس کرے گی سو انہوں نے کہا۔ ''صرف ایک شرط پر۔''

''جی بتائیں کیا شرط ہوگی؟''

''تم ان لوگوں سے صرف ملنے کے لیے جاؤ گی، رہو گی ماموں کے گھر۔''

''اوکے... تھینک یو ویری مچ۔''

☆☆☆



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لندن سے کراچی آنے والی پرواز لینڈ کر چکی تھی اور دانیہ جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اپنی ماں کو مس کر رہی تھی۔ وہ بھی ساتھ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا وہاں انگلستان میں ان کے اکیلے پن کے خیال سے اس کا دل دکھ رہا تھا۔ گگی اور زی کو تو اپنی زندگیوں سے ہی فرصت نہیں ملتی جو وہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کی فکر کریں۔ گگی اور زی، جمینہ اور ظہیر کے نک نیم تھے۔

اپنی سامان بردار ٹرالی کو چلاتی وہ ایرائیول لاؤنج سے باہر نکلی تو اس نے اپنے ماموں جلیل احمد اور ان کی بیٹی نایاب کو اپنا منتظر پایا۔ ایک دوسرے کی دیکھ رکھی تصاویر اور وڈیوز کے بدولت انہیں باہمی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن نایاب نے اسے مزید آسانی فراہم کرنے کو ایک پلے کارڈ اٹھا رکھا تھا جس پر اس کا نام "دانیہ نذیر" جلی حروف میں درج تھا۔ ماموں اور نایاب نے اس کے استقبال میں اس کی توقع سے بڑھ کر گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں اس کے لیے خوب صورت گلدستے لائے تھے۔

گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے اپنے چہار اطراف ایک طائرانہ نظر دوڑائی اور نایاب کی جانب دیکھتے ہوئے خوشی سے معمور لہجے میں بولی۔ "تو میں اپنے دیس میں ہوں؟"

"ہاں، تمہاری مم کا دیس۔" نایاب کو اچھا لگا کہ وہ خوامخواہ انگریزی کا رعب نہیں جھاڑ رہی تھی۔

"فادر کا اور میرا بھی۔" وہ بولی۔

نایاب کو تعجب ہوا کہ وہ اپنے بے وفا باپ کا ذکر بھی کتنے اطمینان سے کر گئی تھی، نایاب کا خیال تو یہ تھا کہ وہ اس شخص کا نام بھی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتی ہوگی تعجب تو نہ صرف نایاب بلکہ ابا کو بھی اس کے لبادے پر بھی ہوا تھا۔ اس نے ریشمی عبایا پہن رکھی تھی اور سر پر اسکارف تھا۔ پیروں میں فلیٹ شوز تھے۔ گھر جاتے ہوئے نایاب اس پر اپنے استعجاب کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔

"تم تو میرے تصور سے بالکل مختلف نکلیں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"مختلف! وہ کیسے؟"

"میں سوچ رہی تھی تم نے ویسٹرن اسٹائل کے کپڑے پہن رکھے ہوں گے، پینسل ہیل شوز ہوں گے، کندھے پر لیٹسٹ اسٹائل کا بیگ، آنکھوں پر گاگلز اور منہ میں چیونگم، تم آ کر کہو گی ہیلو انکل، ہائے کزن! مگر تم نے تو السلام علیکم کہہ کر ابا کے سامنے سر جھکا دیا کہ وہ تمہارے سر پر ہاتھ پھیریں اور مجھ سے بالکل دیسی انداز میں گلے ملیں۔" وہ پھر مسکرائی۔

"ہماری تہذیب یہی تو ہے۔"

"مگر تم تو مختلف تہذیب میں پلی بڑھی ہو؟"

"انسان کو اپنی اصل تو یاد رکھنی چاہیے نا۔"

"بہت ٹھیک۔" اگلی نشست پر بیٹھے ابا بغور دونوں کی باتیں سن رہے تھے بولے۔

"اور سنائیں گھر میں سب لوگ ٹھیک ہیں؟" دانیہ نے پوچھا۔

"ہاں، اماں کے ہاں تو بس اماں ہوتی ہیں ابا اور عریش..... سب ٹھیک ہیں، میں اپنی سسرال میں ہوتی ہوں۔ میاں ہیں، ساس ہیں ایک دیور ہے اور ایک بیٹا۔"

"ارے ہاں! اسے کہاں چھوڑ آئیں آپ؟"

"اماں کے پاس ساتھ ہوتا تو خود بھی تنگ ہوتا مجھے بھی تنگ کرتا۔"

"مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔"



"لیکن پالنا بہت مشکل ہے۔" نایاب نے اپنے کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا پھر مزید گرہ لگائی۔ "مجھے تو ایک ہی بچے نے پاگل بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ابھی فیڈ دینی ہے، اب نہلانا ہے، اب چینج کرانا ہے، اس وقت صاحبزادے کے سونے کا وقت ہے، اب جاگیں گے، رونے پر آتا ہے تو اسے چپ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیمار ہو جائے تو رات رات بھر جاگو۔"

"تبھی تو ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے ماں واقعی عظیم ہوتی ہے، دیکھیں نا میری ماں کتنی قربانی دی ہے انہوں نے ہم بھائی بہنوں کے لیے۔ اپنے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں شی از گریٹ۔"

ائرپورٹ سے گھر تک راستہ کافی طویل تھا۔ دونوں باتیں کرتی رہیں اور گاہے گاہے ابا بھی ان کی باتوں میں شریک ہوتے رہے۔

☆☆☆

"بھیا جی کو پتا ہے؟" باورچی خانے میں اماں کا ہاتھ بٹاتی ملازمہ نے جسے اماں، ابا اور ان کی دیکھا دیکھی ہر اپنا پرایا بھی چھوٹی کہتا تھا اماں سے پوچھا۔

"انہیں گھر سے کوئی دلچسپی اور گھر والوں سے کوئی تعلق ہو تو انہیں پتا ہو۔" اماں کے لہجے میں ناگواری سے زیادہ دکھ تھا۔

"پتا نہیں بھیا جی ان سے بھی بات کریں گے کہ نہیں؟" چھوٹی کہنے کو تو ملازمہ تھی، ابا کے ایک دوست کے خاندانی ملازم کی بیٹی جو چھ سال کی عمر سے اس گھر میں رہ رہی تھی لیکن بارہ سال سے اس گھر میں رہتے رہتے گھر کے تقریباً ہر معاملے سے واقف اور بیشتر میں دخیل رہنے لگی تھی۔ اماں چپ ہیں۔

"بھیا جی نے اگر ان سے بھی بات چیت نہ کی تو وہ کیا سوچیں گی؟" چھوٹی کے لہجے میں غیر معمولی تشویش تھی۔

"ہم خود بتا دیں گے۔" اماں نے ہاتھ جھٹکا۔ "کہ اس گھر میں ایک اکل کھرا بھی رہتا ہے جو اگر بات چیت نہ کرے تو برا ماننے کی ضرورت نہیں۔"

گھر کے باہر گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ اماں نے کھڑکی سے جھانکا اور ہاتھ دھو کر کھونٹی سے لٹکے تولیے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ "آ گئے میں جا رہی ہوں، دو تین منٹ اور بھنائی کر کے ہلکا سا شور بار کر دینا۔"

چھوٹی نے ہنڈیا کی بھنائی شروع کرنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکنا ضروری سمجھا۔ ان دیکھے لوگوں کو پہلی بار دیکھنے سے پہلے کا تجسس اور اشتیاق اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ گاڑی پورچ میں رکی۔ سوار اترے اور چھوٹی کی آنکھوں سے چھلکتے تجسس اور اشتیاق میں حیرانی کا رنگ شامل ہو گیا۔

"یہ تو لگتا ہے لندن سے نہیں عمرہ کر کے سعودی عرب سے آئی ہیں۔" چھوٹی نے ہنڈیا کی بھنائی کے لیے پیچ سنبھالتے ہوئے سوچا۔

اماں، دانیہ کو بڑے تپاک سے گلے لگا رہی تھیں۔

☆☆☆

گو دانیہ نے کہہ دیا تھا کہ لینڈنگ سے قبل فضائی میزبانوں نے خاصا پُرتکلف ناشتا کروا دیا تھا مگر اماں نے جو دوپہر کے کھانے کے لیے بھی ہانڈی چڑھا چکی تھیں دانیہ کو دوبارہ ناشتا کروانا ضروری سمجھا کہ بقول گورا صاحب فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ، سسرال آنے والی دلہن تمام عمر خواہ کتنے ہی مرغن و مقوی ناشتوں کا مزہ لیتی رہے اسے شادی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد پہلے دن سسرال میں ملنے والا ناشتا تازندگی نہیں بھولتا۔ اس معاملے میں سسرال والوں سے ذرا کوتاہی ہوجائے تو نہ صرف دلہن بلکہ اس کے متعلقین بھی منہ بھر بھر کے جتاتے رہتے ہیں۔

''ارے، پہلے دن کیا ناشتا دیا تھا کمبختوں نے۔ پراٹھے، آملیٹ، پچھلی رات ہمارے ہی ہاں سے بھجوایا گیا قورمہ اور چائے کی ایک پیالی۔'' سو اماں نے بھی دانیہ کے ہزار منع کرنے کے باوجود صرف اس لیے کہ ساجدہ کو شکوے کا موقع نہ ملے چھوٹی کی مدد سے ناشتے کے مشرقی اور فیشنی لوازمات سجا دیے۔ پراٹھے، آملیٹ، ہاف فرائیڈ انڈے، فرانچ پین میں بھنی بھنڈی، ڈبل روٹی کے سلائس، بسکٹ، مکھن، جام، جیلی، مایونیز اور چیز۔

''ممانی جان، میں نے جہاز میں اچھی طرح ناشتا کرلیا تھا۔'' دانیہ نے ناشتے کی میز پر آنے سے قبل آخری مرتبہ کہا۔

''بس بس اب آجاؤ، پراٹھے ٹھنڈے ہوجائیں گے۔'' اماں بولیں۔

''جہاز کا ناشتا تو ہضم بھی ہوچکا ہوگا دانیہ باجی۔'' چھوٹی جو اپنی طویل خدمات کے سبب گھر کے اکثر معاملات میں بے تکلف دخیل رہنے لگی تھی بولی۔

''ان کا میں نے کبھی ذکر نہیں سنا ماسے۔'' دانیہ نے سرگوشی میں نایاب سے کہا۔ چھوٹی کی خوش لباسی اسے کسی صورت بھی ملازمہ سمجھنے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔

''یہ چھوٹی ہے، نام تو اس کا عالیہ ہے مگر ہم سب اسے چھوٹی کہتے ہیں کیونکہ جب یہ ہمارے گھر آئی تو چھوٹی سی تھی مگر اب یہی پورے گھر کی کیئر ٹیکر ہے۔ ہمارے گھر دونوں وقت کھانے کا مینیو اب اسی کے مشورے سے ترتیب پاتا ہے۔ اماں کو شاپنگ کے لیے جانا ہو یا اپنے ڈینٹسٹ کے پاس..... چھوٹی کا ان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ میں تو کبھی کبھی اس سے جیلس فیل کرنے لگتی ہوں۔'' اپنے آخری جملے پر نایاب نے مسکراتے ہوئے چھوٹی کو دیکھا جو چائے دانی پر ٹی کوزی چڑھا رہی تھی۔

''پھر تو چھوٹی سی باادب باملاحظہ رہنا پڑے گا۔'' دانیہ بھی مسکرادی۔

''مجھے حیرانی اس بات پر ہورہی ہے دانیہ کہ تم اتنی اچھی اردو کیسے بولی لیتی ہو؟'' نایاب نے کہا۔

''ماں گھر میں ہم لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اردو میں بات چیت کرتی رہی ہیں۔''

''تمہاری زبان سے پھپھو کے لیے ممی یا ماما کے بجائے ماسنا بھی اچھا لگ رہا ہے۔''

''یہ بھی مانے سکھایا تھا۔''

''ساجدہ کو اللہ خوش رکھے۔ وہ شادی سے پہلے یہاں اور شادی کے بعد پردیس جانے پر بھی مکمل مشرقی رہیں۔'' اماں بولیں۔ ناشتے کے بعد نایاب نے اپنے گھر جانے کو پر تولے۔

''مجھے لینے کے لیے ائرپورٹ آنے کا شکریہ۔'' دانیہ نے کہا۔

''ارے، کیسی باتیں کرتی ہو۔'' نایاب نے اس سے گلے ملتے ہوئے دھیرے سے اسے پیار کیا اور بولی۔ ''سوری دانیہ، میرے میاں دفتر کے کام سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں کل رات واپسی ہے، میں اب پرسوں ان کے ساتھ تم سے ملنے آؤں گی۔''

''ایک کل کا دن ہی ہے پھر تو رمضان شروع ہوجائیں گے۔'' چھوٹی نے روئے سخن دانیہ کی طرف کیا اور بولی۔ ''کیوں جی، آپ کو افطار پارٹیوں کا بہت شوق ہے کیا جو رمضان میں آئی ہیں آپ؟''



''میں نے دانیہ سے تمہارا تفصیلی تعارف کرادیا ہے۔'' نایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور کل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔'' چھوٹی نے ترت کہا۔

''یہ اسے ہمارے ابا کا فیض ہے۔'' نایاب کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

نایاب کے جانے کے بعد اماں نے دانیہ کو اس کے لیے بطور خاص آراستہ کیا جانے والا کمرا دکھایا۔ چھوٹی بھی مصاحبہ خاص کی صورت ساتھ ساتھ تھی۔

''دانیہ بی بی، کھڑکی کا پردہ سرکا کر آپ کمرے میں بیٹھے بیٹھے بلکہ بستر پر لیٹے ہوئے بھی پارک کی سیر کرسکتی ہیں۔'' چھوٹی نے کمرے کی غربی دیوار میں موجود کھڑکی پر پڑا ریشمی پردہ سرکاتے ہوئے کہا۔

دانیہ کی آنکھیں گھر کے عین مقابل سڑک کے دوسری طرف واقع وسیع و عریض پُر بہار پارک سے تراوٹ محسوس کرنے لگیں۔

''کھڑکی کھول دوں؟'' چھوٹی نے پوچھا۔

''تمہاری مرضی۔''

''کھول دیتی ہوں، پارک کی طرف سے بڑی اچھی ہوا آتی ہے۔''

''اچھا بس، اب چلو دانیہ کو آرام کرنے دو۔'' اماں بولیں۔ ''دانیہ بیٹے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف بتادینا۔''

اماں اور چھوٹی کے جانے کے بعد وہ پارک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔ پاکستان کی یہ چھوٹی سی تصویر اسے اپنے تصور میں بسی پاکستان کی ان گنت تصویروں سے بڑھ کر مسحور انداز لگ رہی تھی۔

☆☆☆

شام کو گھر کے لان میں ابا، اماں اور دانیہ چائے پی رہے تھے کہ گھر کے صدر دروازے پر ایک گاڑی کا ہارن بجائے جانے پر چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ سیاہ رنگ کی ایک سٹی اندر داخل ہوئی اور گول دریائی پتھروں سے مرصع گزرگاہ سے ہوتی ہوئی پورچ میں جارکی۔ ایک خوش لباس شخص گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور انتہائی بے تکلفی سے گھر کے اندر چلا گیا۔ دانیہ نے دیکھا اس کے ساتھ بیٹھے ابا اور اماں کی نظریں باہم ملیں اور جھک گئیں۔ زمانے کے گرم و سرد دیکھے شکن آلود چہروں پر شرمندگی کے سائے تھے۔ گاڑی میں آنے والے شخص کے بارے میں نہ ان دونوں نے کچھ بتایا نہ دانیہ نے کچھ پوچھا۔ چائے سرو کرتی چھوٹی کی نگاہوں میں البتہ معنی خیزی رقصاں دکھائی دی۔

چائے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو چھوٹی بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئی۔

''دانیہ بی بی باتھ روم سے آپ کے کپڑے لے لوں دھونے کے لیے؟'' اس نے اجازت طلب لہجے میں کہا۔

''میں خود دھولوں گی چھوٹی، تم بس اتنا بتادینا لانڈری کس طرف ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں، نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے، اماں مجھے اتنا ڈانٹیں گی کہ کیا بتاؤں۔''

''ممانی جان تو بہت نرم ہی دکھائی دیتی ہیں۔''

''غصہ آئے تو بہت برا ڈانٹتی ہیں۔''

''اچھا!''

''جی ہاں ..... ایک دفعہ بھیا جی کو ایسی سنائیں کہ انہیں تو پھر چپ ہی لگ گئی۔''

''بھیا جی!'' دانیہ کے لہجے میں استفسار بھی تھا تجسس بھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا آپ پہلی بار آئی ہیں نا اس لیے۔" چھوٹی نے دانیہ کی لاعلمی کی خود ہی توجیہہ پیش کردی۔ "مگر اتنا تو پتا ہوگا نا کہ اس گھر میں ایک عریش بھیا بھی ہیں..... گاڑی سے اتر کر اندر جاتے دیکھے ہوں گے نا آپ نے؟"

"اچھا تو وہ ہیں عریش بھائی..... اتنے روڈ سے! نہ کسی کو سلام نہ....."

"ایسے ہی رہتے ہیں بس۔"

"کیوں؟"

"میں بیٹھ جاؤں؟"

"ہاں، ہاں بیٹھو....."

چھوٹی نے دائیں بائیں دیکھا اور خاصے رازدارانہ انداز میں گویا ہوئی۔ "جس گھر میں میرے ابا کام کرتے ہیں ان لوگوں کی ایک لڑکی تھی جس سے بھیا جی کو محبت تھی۔ میں نے سنا ہے وہ بھی بھیا سے محبت کرتی تھی مگر اماں کو پتا نہیں کیوں وہ لڑکی پسند نہیں تھی۔ بھیا جی چاہتے تھے اماں اور ابا رشتہ لے کر جائیں۔ اماں کے سمجھانے پر ابا بھی آج کل پر ٹالتے رہے۔ لڑکی کا آگیا کوئی رشتہ، بھیا جی نے اماں سے کہا اب تو فوراً جائیں، اماں، ابا نایاب باجی سب مل ملا کر گئے ان لوگوں نے کہا آپ کا ارادہ تھا تو پہلے بتاتے، خیر لڑکی سے اس کی مرضی پوچھیں گے پھر جواب دیں گے آپ کو بھی اور انہیں بھی۔ سنا ہے وہ دوسرے لوگ بہت امیر تھے لڑکی نے ان کے لیے ہاں کردی۔ بھیا جی اماں پر بہت ناراض ہوئے کہ آپ لوگوں کی دیر نے میری زندگی برباد کردی۔ بھیا جی کے چیخنے چلانے پر اماں کو بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے کہا۔ تم ہم پر کیوں چلاتے ہو جا کر اس پر چیخو چلاؤ جس نے محبت کا ڈھونگ تم سے رچائے رکھا اور ہاں دوسرے کے لیے کردی صرف اس لیے کہ وہ مال و دولت میں زیادہ تھا۔ بھیا جی کے دل کو یہ بات ایسی لگی کہ انہیں چپ ہی لگ گئی..... بس اس کے بعد سے گھر میں کسی سے بولتے چالتے ہی نہیں ہیں۔"

"اور اس لڑکی کی شادی ہوگئی؟"

"ہاں جی، بہت دھوم دھام سے..... بھیا جی سے چوری چھپے اپنے امی ابا کے بلانے پر میں بھی گئی تھی شادی میں..... اللہ ایسی شادی کہ میں نے تو پہلے اتنی زبردست شادی کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔"

"بڑی فلمی کہانی لگتی ہے۔"

"فلم بھی تو کہانی سے بنتی ہے دانیہ باجی۔"

"ہوتم عقلمند!"

"ہاں جی، وہ تو میں ہوں۔" چھوٹی نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اپنی گردن فخر سے اکڑائی۔

☆☆☆

دوسرا دن تھا مغرب کی نماز کے بعد وہ کمرے سے نکلی اور لاؤنج میں آئی تو اماں اور چھوٹی لاؤنج ہی میں تھیں۔ ٹی وی آن تھا مگر آواز بند۔

"رمضان کا چاند ہوگیا ہے..... مبارک ہو۔" اماں نے اسے دیکھتے ہی کہا اور اٹھ کر پیار کیا۔

"آپ کو بھی ممانی جان۔"

"مبارک ہو بھئی، چاند ہوگیا ہے۔" ابا نے باہر سے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ان کے سر پر ٹوپی مسجد سے نماز کی ادائیگی کے بعد واپسی کی گواہی دے رہی تھی۔

"خیر و برکت کا چاند ہو۔" اماں بولیں۔

"ارے بھئی رمضان تو ہے ہی خیر و برکت کا دوسرا نام۔"



"ہاں۔" اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ اس مہینے کی برکت سے میرے دل کی لگی کو بھی ٹھنڈک دے۔ دل کٹ رہا ہے میرا تو یہ سوچ سوچ کر کہ مسلمان گھرانوں میں لوگ اکٹھے بیٹھ کر ہنسی خوشی سحری، افطاری کرتے ہیں اور یہاں دو سال سے....."

ابا تنبیہ کرنے والے انداز میں دھیرے سے کھنکھارے اور اماں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

دانیہ سوچ میں پڑ گئی کہ اس کی ممانی کی اس بات کا کیا مطلب تھا؟ "مسلمان گھرانوں میں لوگ اکٹھے بیٹھ کر ہنسی خوشی سحری، افطاری کرتے ہیں اور یہاں دو سال سے....." کیا ہو رہا تھا یہاں دو سال سے جسے سوچ سوچ کر ان کا دل کٹ رہا تھا۔

"اماں سحری کے لیے دودھ میں کتنی کھجوریں بھگو دوں؟" چھوٹی نے اماں سے پوچھا۔

"دانیہ بیٹی روزے رکھتی ہو؟" اماں نے پوچھا۔

"بہت پابندی سے ممانی جان!" اس نے جواب دیا۔

"ایک ایک سب کے لیے بھگو دو۔" اماں نے چھوٹی سے کہا پھر تفصیل سے وضاحت کی۔ "ایک دانیہ کے لیے، ایک ایک ان کے، میرے اور اپنے لیے۔" دانیہ کو حیرت ہوئی عریش کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا انہوں نے کیا وہ خدانخواستہ روزہ خور تھا..... اگر ایسا تھا تو بہت بری بات تھی۔

رات کو جب وہ عشا اور تراویح کی نماز کے بعد سونے کی تیاری کر رہی تھی کمرے کے بند دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی اور ساتھ ہی چھوٹی کی آواز بھی۔ "دانیہ باجی....."

"ہاں..... آجاؤ..... دروازہ کھلا ہے۔"

چھوٹی دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ "اماں نے کہلوایا ہے یاد سے الارم لگالیں آپ ٹائم پیس میں، چار پچیس پر روزہ بند ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں تو تہجد کے وقت اٹھتی ہوتی ہوں۔"

"آپ تہجد بھی پڑھتی ہیں!" چھوٹی نے آنکھیں پھیلا کر حیرت سے کہا۔

"اس میں اس قدر حیرانی کی کیا بات ہے؟" دانیہ دھیرے سے مسکرائی۔

"تہجد تو لوگ بڑھاپے میں پڑھتے ہیں۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"غلط معلوم ہے۔ صبح سحری کے لیے جلدی اٹھنے کو تمہیں سونا بھی جلدی ہوگا۔ کل دن میں تم میرے پاس بیٹھنا ہم نماز کے بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ویسے اتنا بتاؤ نماز پڑھتی ہو؟"

چھوٹی نے قدرے خجالت سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پڑھا کرو..... پڑھنا چاہیے..... روزِ قیامت حساب بھی تو دینا ہے۔"

"پڑھوں گی۔"

"گڈ گرل....." دانیہ نے اس کا سر تھپتھپایا۔

☆☆☆

سحری کے وقت کھانے کی میز پر دانیہ تھی، اماں، ابا اور چھوٹی۔ دانیہ کو اپنے ماموں اور ممانی کی یہ بات بہت اچھی لگی کے کھانے کی میز پر وہ چھوٹی کو بھی فردِ خانہ کی طرح ان کے ساتھ ہی بیٹھتے دیکھ رہی تھی مگر افرادِ خانہ میں سے ایک عریش کہاں تھا! وہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو گزشتہ رات بھی کھانے پر موجود نہیں تھا اور اب اس وقت سحری پر بھی نہیں تھا۔

دوپہر کو جب وہ چھوٹی کو نماز کے بارے میں تفصیل سے درس دے چکی تو اس نے پوچھا۔

''چھوٹی ایک بات بتاؤ عریش بھائی رات کو کھانے پر بھی نہیں تھے اور صبح سحری پر بھی نہیں..... کیوں؟''

''وہ اپنے کمرے میں ہی کھاتے پیتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''گھر والوں سے ناراض جو ہیں۔''

''لیکن تم سے نہیں..... تم ہی پہنچاتی ہوگی ان کے کمرے میں کھانا؟''

''توبہ کریں۔'' چھوٹی نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''مجھ سے دشمن کی طرح چڑتے ہیں۔''

''کیوں!'' دانیہ چونکی۔

''میرے ابا جو اُن کی بے وفا محبوبہ کے گھر میں نوکر ہیں۔''

''آئی سی!'' دانیہ مسکرادی۔ ''تو پھر خود نکال کر لے جاتے ہوں گے وہ کچن سے اپنا کھانا۔''

''نہیں..... بازار سے لا کر کھاتے ہیں جو بچ جاتا ہے اسے فریج میں رکھ لیتے ہیں۔ اپنے کمرے میں ایک چھوٹا سا فریج بھی رکھا ہوا ہے انہوں نے اور ایک مائیکرو ویو بھی۔ اسی میں چائے بنا لیتے ہیں اپنے لیے۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ، کل ممانی جان کہہ رہی تھیں ان کا دل یہ سوچ سوچ کر کٹا جاتا ہے کہ سارے مسلمان گھرانوں میں لوگ اکٹھے بیٹھ کر ہنسی خوشی سحری اور افطاری کرتے ہیں اور یہاں دو سال سے..... اس کا کیا مطلب تھا؟''

''دو سال سے بھیا جی نے خود کو اپنے کمرے ہی میں بند رکھا ہے نا..... سحری، افطاری اپنے کمرے میں کرتے ہیں۔''

''بوڑھے والدین پر تو یہ ظلم ہے۔''

''دوزخ میں جائیں گے۔'' چھوٹی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''بری بات کسی مسلمان کے لیے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔''

''اگر وہ غلط ہو پھر بھی؟''

''اس کی درستگی اور رہنمائی کے لیے دعا بھی کرنی چاہیے کوشش بھی۔''

☆☆☆

نایاب افطار سے کچھ پہلے اپنے شوہر عارف کے ساتھ آ پہنچی۔ اس نے آتے ہی معذرت کی۔

''سوری، سوری، سوری ہم وقت کے وقت پہنچے ہیں، اصل میں عارف دیر سے گھر آئے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اماں ان دونوں کے آنے سے ایک دم بہت خوش دکھائی دینے لگی تھیں۔

نایاب نے عارف اور دانیہ کو باہم متعارف کرایا پھر جیسے اسے یکا یک کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ ''ارے دانیہ تم کام میں کیوں لگی ہوئی ہو، لاؤ کیا رہ گیا ہے، مجھے بتاؤ میں کرتی ہوں۔''

''سب ہو گیا۔'' چھوٹی بولی۔

''تم تو یہی کہنا..... جلتی رہنا مجھ سے۔''

نایاب نے چھوٹی کے سر پر پیار سے دھپ لگائی۔

''دانیہ کو میں نے بھی بہت روکا مگر یہ خود آ کر کھڑی ہو گئی کچن میں۔'' اماں نے کچن سے نکل کر لاؤنج میں آتے ہوئے کہا۔

''میرا اپنا گھر جو ہے ممانی جان۔'' دانیہ کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''جیتی رہو..... خدا تمہیں خوش رکھے۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''دانیہ بیٹی کے آنے سے رونق بڑھ گئی ہے ہمارے گھر کی۔'' ابا بولے۔

''آپ کی محبت ہے ماموں جان۔''

افطار میں اب کچھ زیادہ وقت نہ تھا۔

''روزے دار کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔'' دانیہ کی بہت دھیمے لہجے میں کہی گئی یہ بات گویا اس کا اشارہ تھی کہ ان سب کو اس وقت اِدھر اُدھر کی باتوں کے بجائے دعا مانگنے کی ضرورت تھی۔ سب بیٹھ گئے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد دانیہ کی نظر اماں کی طرف اٹھی تو اس نے دیکھا دونوں ہاتھ اٹھائے، آنکھیں بند کیے وہ انتہائی خشوع و خضوع سے زیرِلب دعا مانگ رہی تھیں ان کے بند ہونٹوں پر ارتعاش تھا، چہرے پر رقت، دفعتاً ان کی دائیں آنکھ سے ایک آنسو ڈھلکا اور ان کی ہتھیلی کی آغوش میں گر پڑا۔

افطار کے وقت عریش کے کمرے سے برتنوں کے اتصال کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دی تو اماں اور ابا کچھ خجل خجل سے دکھائی دینے لگے۔

مغرب کی نماز کے بعد چھوٹی نے کھانے کے برتن میز پر چننا شروع کیے تو دانیہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے دانیہ!'' نایاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''کیا ہوا؟'' وہ مسکرائی۔

''تم مہمان ہو۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مہمان نہیں ہوں اور دوسری بات یہ کہ انگلینڈ میں مہمان بھی کام میں میزبان کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور میں اسی کی عادی ہوں۔''

''اوکے، ایز یو وش۔''

کھانے کے دوران پورچ میں گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز لاؤنج تک پہنچی پھر گیٹ کھلنے اور گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے پھر گیٹ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ابا سر جھکائے کھانے میں یوں محو رہے جیسے گھر کا گیٹ کھلنے اور گاڑی کے باہر جانے سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ البتہ اماں کچھ تناؤ کا شکار دکھائی دینے لگیں۔ نایاب کی نگاہیں قدرے معنی خیز انداز میں اماں کی نگاہوں سے ملیں اور اماں نے دھیرے سے پہلو بدلا۔

''بھیا جی شاید افطاری پر گئے ہیں۔'' چھوٹی نے حدِ ادب ملحوظ نہ رکھی۔ اس کی بے ساختگی پر اماں کے چہرے پر بکھرا تناؤ ناگواری بن کر ان کی آنکھوں میں ڈولنے لگا۔

''بے وقوف ہیں آپ!'' نایاب نے اپنے مخصوص ٹھنڈے میٹھے لہجے میں کہا۔

''کیوں... کیوں نایاب باجی؟''

''کیونکہ افطاری کا وقت گزرے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چکا، عشا کے وقت افطاری کون کرتا ہے احمق لڑکی۔''

''افطاری کے بعد کھانا بھی تو کھاتے ہیں۔'' چھوٹی مورچہ سنبھالے رہی۔

''ہاں تو وہ کھانا ہوتا ہے، افطاری تو نہیں۔''

''رمضان کے دنوں میں صبح کو جو کچھ بھی کھاتے ہیں اسے سحری کہتے ہیں اور جو شام کو کھاتے ہیں وہ افطاری ہوتی ہے۔''

''یار کس سے بحث میں پڑ گئیں۔'' عارف نے مداخلت کی۔

''اس کی زبان تو کندھوں پر پڑی رہنے لگی ہے۔'' اماں کو چھوٹی کی بے ساختگی کا حساب برابر کرنے کا موقع ملا۔ ''ہم اسے گھر کا فرد سمجھتے ہیں مگر یہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔'' چھوٹی کا منہ پھول گیا۔

''اچھا بھئی اچھا...... بس۔'' ابا نے بات رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

''سوری دانیہ......'' نایاب نے میز کے نیچے دانیہ کے زانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے ماحول کی کشیدگی پر معذرت کر کے گویا حقِ میزبانی ادا کرنے کی کوشش کی پھر سرگوشی میں بولی۔ ''اماں کبھی کبھی اچانک ٹینس ہو جاتی ہیں۔''

''اٹس آل رائٹ......'' دانیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

کھانے کے بعد اپنے گھر واپس جاتے ہوئے نایاب نے کھانے کی میز پر پیدا ہونے والی صورتِ حال کی نسبت دانیہ کو مزید صفائی پیش کی۔ ''اماں عریش بھیا کی وجہ سے بہت ڈسٹرب رہتی ہیں اس لیے کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ غصہ کر جاتی ہیں۔ چھوٹی کو میں سمجھا کر تو جا رہی ہوں مگر اسے سب کے سامنے ڈانٹ پڑی ہے اس لیے ایک دو روز منہ پھولا رہے گا اس کا۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں اسے سمجھا دوں گی۔''

''تھینک یو ڈیئر۔ تم یہ نہیں پوچھو گی دانیہ کہ عریش بھیا کا مسئلہ کیا ہے جو اماں اُن کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔''

''چھوٹی نے کچھ کچھ بتا دیا ہے مجھے۔''

''او گاڈ! چھوٹی تو ہمارے گھر کی بھیدی بن گئی ہے۔''

''ماں کہتی ہیں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔''

''خدایا!'' نایاب بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی اور دانیہ کو اپنے سے چمٹاتے ہوئے بولی۔ ''پھپھو نے تو تمہیں محاوراتی اردو سکھائی ہے۔''

''مجھے اپنی ماں پر فخر ہے۔''

''تمہیں اس کا پورا حق ہے۔''

نایاب کو رخصت کرنے کے لیے اس کے ہمراہ عارف کی گاڑی کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دانیہ نے کہا۔ ''اسکول میں ہماری ایک ٹیچر ہوتی تھیں مس میکملن۔ انہوں نے ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا تھا کہ کسی شخص کی تکلیف یا دکھ کو نظر انداز کرنا اسے مزید تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے مگر اس سے اس کی پرابلم کے بارے میں بات کر کے آپ اس کا دکھ بٹا سکتے ہیں، وہ کہتی تھیں اگر کوئی معذور ہے تو اس پر ترس مت کھاؤ اس کے پاس بیٹھو اس سے پوچھو معذوری کیوں ہوئی، کیسے ہوئی، وہ آپ کو اپنا ہمدرد اور دوست سمجھے گا اور ایزی فیل کرے گا...... نایاب باجی کیا آپ کے خیال میں، میرا ممانی جان سے عریش بھائی کے بارے میں بات کرنا ٹھیک ہوگا؟''

نایاب چلتے چلتے تھم گئی اور اس نے دانیہ کا ہاتھ دھیرے سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ضرور دانیہ...... مائنڈ مت کرنا...... تم نے بات کی ہے تو میں تمہیں بتا دوں، اماں آج کل اسی لیے کچھ زیادہ ٹینس ہو رہی ہیں کہ تم مہمان آئی ہو۔ عریش بھیا کا گھر والوں سے بے گانگی کا رویّہ دیکھ کر کیا تاثر لو گی۔''

''یہ میرا دوسرا گھر اور آپ سب میری فیملی ہیں نایاب باجی...... مجھے آپ کی پرابلمز کو اپنی پرابلمز سمجھنا چاہیے...... مجھے شیئر کرنا چاہیے...... میں شیئر کرنا چاہتی ہوں۔''

''تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ دانیہ......''

نایاب کے لہجے میں شکر گزاری تھی۔

☆☆☆





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سحری کے وقت دانیہ کچن میں آئی تو چھوٹی کا منہ رات والی بات پر واقعی پھولا ہوا تھا۔ اماں ابھی کچن میں نہیں پہنچی تھیں۔

''السلام علیکم چھوٹی!''

''وعلیکم۔''

''ناراض ہو؟''

''میری کیا اوقات کہ میں ناراض ہوسکوں۔''

''سلام کا جواب پورا کیوں نہیں دیا؟''

''وعلیکم السلام۔''

''گڈ! ویسے تم ہو بڑی اچھی لڑکی۔''

''میں اچھی کہاں ہوں۔'' چھوٹی کے لہجے میں خفگی تھی۔ ''کتنی خدمت کرلو ان لوگوں کی ایک منٹ میں عزت اتار کر ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔''

دانیہ اس کے نزدیک آ کھڑی ہوئی۔ ''خیال بھی تو کتنا رکھتے ہیں تمہارا..... ممانی جان کو تو میں دیکھ رہی ہوں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی ہیں تم سے۔ کوئی بات ہو بس چھوٹی کو پتا ہوگا۔ چھوٹی سے پوچھو..... یہ بھی تو سوچو عریش بھائی کی وجہ سے پریشان ہیں وہ۔''

''تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟'' چھوٹی زبان کے ساتھ دونوں ہاتھ بھی سرعت سے چلا رہی تھی۔

''اچھا سنو، آج عریش بھائی کو بھی سحری پہنچانی ہے۔''

چھوٹی نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ بولی۔ ''مار کھانی ہے کیا!''

''کھالیں گے یار۔'' دانیہ کا انداز سرفروشانہ تھا۔

''کوئی بڑی ٹرے دو اس میں رکھتے ہیں عریش بھائی کی سحری۔''

اماں کچن میں آئیں تو دانیہ، عریش کے لیے سحری کی ٹرے آراستہ کرچکی تھی۔

''اماں سے پوچھ لیں۔'' کچن میں اماں کے داخل ہوتے ہی چھوٹی نے کہا۔

''کیا؟'' اماں نے پوچھا۔

''ممانی جان! عریش بھائی کو سحری پہنچانے جارہی ہوں میں۔''

اماں نے چونک کر دانیہ کو دیکھا، آن کی آن ان کے چہرے پر کئی رنگ گزر گئے۔ پہلے اچنبھا پھر دکھ پھر تذبذب اور آخر شکن جیسے ڈوبتے کو کنارہ دکھائی دے رہا ہو۔

''نہ.....'' اماں نے منع کیا پھر دانیہ سے بولیں۔ ''وہ ناراض ہے۔''

''مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ کیوں..... کچھ مجھے آپ کی لاڈلی چھوٹی نے بتایا اور کچھ نایاب باجی سے پتا چلا۔'' دانیہ نے چھوٹی کو اماں کی جانب سے ممکنہ گوشمالی سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنی معلومات کا ماخذ چھوٹی کے ساتھ نایاب کو بھی قرار دے ڈالا۔ اماں انتہائی ملول دکھائی دینے لگیں۔

''اجازت ہے ممانی جان؟'' دانیہ نے ٹرے اٹھائی۔

''اس نے کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تو تمہارا دل برا ہوگا۔'' اماں بولیں۔

''کوئی بات نہیں۔''

''ایک منٹ۔''

وہ تھم گئی۔ اماں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور اس کے ساتھ ٹرے پر بھی دم کردیا۔

''تمہیں خود بھی سحری کرنی ہے، اس بات کا دھیان رکھنا۔'' اماں نے کہا۔



''ابھی پندرہ منٹ ہیں ممانی جان۔'' اس نے جاتے جاتے جواب دیا۔

☆☆☆

کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک سن کر وہ چونکا۔ کون ہوسکتا تھا۔ اماں، ابا، نایاب، عارف اور وہ تمام بہی خواہ اور دردمند جو چاہتے تھے کہ وہ کاتبِ تقدیر کے لکھے کو اپنا مفہوم جان کر حوصلے سے ایک نارمل انسان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرے ان سب کو تو وہ تند و تلخ سنا کر اپنے کمرے کا راستہ ان پر بند کرچکا تھا۔

پھر آج اور وہ بھی اس وقت کون چلا آیا تھا اس کے زخم ہرے کرنے۔ اس نے چائے کا مگ مائیکرو ویو اوون سے نکال کر باہر رکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو سر پر اسکارف منڈھے، ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے ایک ناشناسا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

''السلام علیکم!''

اس نے جواب نہیں دیا۔

''سلام کا جواب بھی دیا جاتا ہے۔''

''وہ خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا۔

''میرا نام دانیہ ہے، آپ کی پھپھو ساجدہ کی بیٹی ہوں۔''

اس کی ابروئیں چڑھ گئی تھیں۔

''اندر آسکتی ہوں؟''

''جی نہیں۔'' اس نے بلا تامل منع کردیا۔

''بری بات! خاتون اور وہ بھی گھر آئی مہمان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا..... آپ اجازت نہ بھی دیں تو میں خود اندر آسکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ٹرے سمیت اتنی سرعت سے آگے بڑھی کہ عریش جس کے لیے اس کی یہ جرأت قطعاً غیر متوقع تھی ایک جانب ہٹ کر اسے راہ دینے پر مجبور ہوگیا۔

''تھینک یو۔'' اس نے کہا اور ٹرے کمرے میں موجود میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''سحری کرلیجیے۔''

وہ کمرے سے جانے کو مڑی تو عریش اپنے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو افقاً نچاتے ہوئے اس پر آنکھیں نکال کر بولا۔ ''اے۔''

''میں اے بی سی نہیں ہوں۔ میرا نام دانیہ ہے، سمجھے آپ۔''

''اسے اٹھاؤ اور لے جاؤ۔'' اس نے میز پر رکھی ٹرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کھائیں یا نہیں کھائیں یہ خدا کا دیا ہوا رزق ہے، یہیں رکھا رہے گا اور کفرانِ نعمت کرنے والے کو ملامت کرتا رہے گا۔''

''زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں..... سمجھیں۔''

''فری! آپ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا نہ ہوں..... بلاضرورت تو میں خود اپنے آپ کو بھی لفٹ نہیں کراتی..... سمجھے آپ۔'' اس نے تیزی سے راستہ بنایا اور دروازے سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''سحری کرلیجیے گا۔''

''زبردستی ہے!'' وہ اس کے جانے کے بعد غرایا۔

دانیہ واپس لوٹی تو اماں، ابا اور چھوٹی سحری کے لیے اور سحری کرنے سے زیادہ عریش کا ردِعمل جاننے کے لیے اس کے منتظر تھے۔

''آج پہلا دن ہے، آج تو رکھ آئی ہوں..... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' دانیہ نے کہا۔

''تو کیا آپ روزانہ لے کر جایا کریں گی سحری؟'' چھوٹی نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہ صرف سحری بلکہ افطاری بھی۔'' دانیہ نے کہا۔

''آؤ، اب تم بھی جلدی سے سحری کرلو وقت کم رہ گیا ہے۔'' اماں خوش تھیں۔

☆☆☆

عریش کے دفتر جانے کے بعد دانیہ، اماں اور چھوٹی اس کے کمرے میں آئیں تو سحری کی ٹرے جوں کی توں رکھی تھی۔ اماں اداس ہوگئیں ..... ''میں اسے جانتی ہوں..... بہت ضدی ہے وہ۔''

''آپ فکر نہ کریں ممانی جان..... دعا کریں..... دعا میں بہت طاقت بہت برکت ہوتی ہے۔'' دانیہ نے انہیں دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''بیٹا زبان گھس گئی ہے میری دعا کرتے کرتے۔'' اماں کے لہجے میں یاسیت تھی۔

''اللہ تعالیٰ بہتر کریں گے۔'' دانیہ کے لہجے میں یقین تھا۔ کمرا بہت بے ترتیب اور گندا تھا۔

''ممانی جان! آپ جائیں، ہم دونوں کمرا صاف کرکے آتے ہیں۔''

''نہ بابا۔'' چھوٹی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''شروع شروع میں میں نے ایک دو مرتبہ صفائی کردی تھی بھیا جی نے ایسی جھاڑ پلائی کہ میرے تو چالیس طبق روشن ہوگئے۔''

اماں بے ساختہ ہنس دیں۔ ''بے وقوف، چودہ طبق کے بجائے چالیس کہہ رہی ہے۔'' پھر وہ دانیہ سے بولیں۔ ''مگر کہہ رہی ہے یہ ٹھیک، وہ ناراض ہوگا۔ وہ خود کرتا ہے اپنے کمرے کی صفائی۔''

''ممانی جان کمرے کی حالت تو دیکھیں۔''

''کیا کریں بیٹا مجبوری ہے، ورنہ اس کا کمرا تو گھر کے تمام کمروں سے زیادہ چمکتا دکھائی دے۔''

''آج صفائی کرکے دیکھتے ہیں ممانی جان کیا ہوتا ہے اگر عریش بھائی آکر ناراض ہوئے تو پھر سوچیں گے آگے کیا کرنا ہے۔''

''آگے!'' چھوٹی نے ابرو اچکائیں۔ ''آگے کیا کرنا ہے بھئی۔''

''فی الحال تو تم شروع ہوجاؤ..... شاباش.....'' دانیہ نے اسے چمکارا۔

''دیکھو بیٹا، وہ آکر کچھ کہے سنے تو دل برا مت کرنا۔'' اماں نے جاتے جاتے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں۔''

دانیہ کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اماں جو اس کی آمد کے ابتدائی دنوں میں کافی محتاط دکھائی دیتی رہی تھیں اب مطمئن تھیں۔

کمرے کی صفائی میں دوپہر ہوگئی اور اس صفائی میں بے وفا محبوبہ کی ایک تصویر بھی ہاتھ لگی۔

''چھوٹی! یہ کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں اس طرح؟'' دانیہ نے کمرے کی انتہائی بے ترتیبی دیکھ کر پوچھا۔

''دو سال تو ہوگئے ہوں گے۔''

کمرا صاف ہوگیا، چیزیں ترتیب پاگئیں، بیڈ روم ریفریجریٹر، مائیکرو ویو اوون، گنے چنے برتن، بستر کی چادر، تکیہ غلاف، کشن کورز، سب جھکا جھک ہوگئے، دانیہ نے لان سے تازہ پھولوں کی ٹہنیاں چھوٹی سے تڑوائیں اور کمرے میں سجادیں۔

سہ پہر کو عریش کی واپسی ہوئی تو اماں، دانیہ اور چھوٹی کے ساتھ ابا بھی سانس روک کر بیٹھ گئے۔ نہ کوئی شور اٹھا نہ طوفان آیا نہ کوئی قیامت بپا ہوئی۔ البتہ شام کو جب دانیہ افطاری کی ٹرے لے کر عریش کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو وہ دروازہ کھولتے ہی غرایا۔

''کس نے کہا تھا تمہیں میرے کمرے میں



مداخلت کرنے کو۔''

''کمرا!'' وہ مسکرائی۔ ''کمرا تو یہ اب دکھائی دے رہا ہے ورنہ ''

''ورنہ؟''

''کسی دیوانے کا مسکن لگ رہا تھا۔''

''مہمان بن کر آئی ہو مہمان ہی بن کر رہو، اس گھر کے معاملات میں زیادہ مداخلت کی ضرورت نہیں۔'' وہ جارحانہ تیوروں سے بولا۔

اس کی بات کے دوران دانیہ نے اپنے لیے راہ بنائی اور افطاری کے لوازمات سے لدی ٹرے میز پر رکھنے کے بعد اس کی بات کے جواب میں بولی۔

''آپ کو کیا پتا میں کس حد تک مداخلت کرسکتی ہوں۔''

''شٹ.....'' عریش کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اوگاڈ!'' دانیہ نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے گالی دی مجھے۔''

''نو..... ناٹ ایٹ آل..... ناٹ ایٹ آل.....'' وہ سٹپٹا گیا تھا۔

''جی ہاں..... جی ہاں..... آپ نے مجھے گالی دی..... شٹ کہا۔'' روہانسی نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور جھوٹ موٹ سسکنے لگی۔

''دیکھو..... دیکھو..... میں نے جان بوجھ کر..... ارادتاً..... نہیں کہا..... بس اچانک منہ سے نکل گیا۔''

''کوئی اچھی بات نہیں نکال سکتے منہ سے۔'' وہ بدستور چہرے پر اپنے ہاتھ ڈھانپے رقت زدہ لہجے میں بولی۔

''نکال سکتا ہوں..... سوری..... سوسوری.....''

''وہ ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے انگلیوں کی جھریوں سے راستہ دیکھتی کمرے سے نکل گئی۔ عریش چند ثانیے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنایا اور قریبی دیوار پر پوری طاقت سے رسید کرتے ہوئے زیرلب بڑبڑایا۔ ''شٹ!''

☆☆☆

اگلی صبح سحری کے وقت جب وہ دوسری ٹرے میں سحری کے لوازمات سجا کر اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو گزشتہ افطاری کی ٹرے کمرے کے دروازے کے باہر فرش پر رکھی تھی۔ تمام چیزیں جوں کی توں ان چھوئی رکھی تھیں۔ اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ عریش نے دروازہ کھولا۔

''تم پھر آگئیں؟'' اس کے لہجے میں غراہٹ کے بجائے ناپسندیدگی اور بیزاری کی کیفیت تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ اپنے روبرو کھڑے چھ فٹ طویل قامت کے عریش کے پہلو سے اپنے لیے راستہ بنایا۔ سحری کی ٹرے میز پر رکھی۔ واپس پلٹی کمرے کے باہر فرش پر دھری افطاری کی ٹرے اٹھائی اور چلی گئی۔ اماں اداس ہوگئیں۔

''دیکھا! میں نے کہا تھا نا وہ بہت ضدی ہے..... وہ بچپن ہی سے ضدی ہے مرضی کی چیز نہ ملنے پر وہ نہ جانے کتنی چیزیں توڑ پھوڑ دیا کرتا تھا۔''

''ممانی جان! زندگی بدلتی ہے، مرضی کی چیز نہ ملنے پر آپ ہمیشہ ہی توڑ پھوڑ نہیں مچا سکتے..... سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔''

''وہ سمجھوتا کرنا چاہے تب نا!''

''دیکھتے ہیں ممانی جان کیا ہوتا ہے۔''

''اچھا تم سحری تو کرلو..... آئی تھیں اپنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ددھیال والوں سے ملنے اور پڑ گئیں ہمارے چکروں میں۔“

”صرف ددھیال والوں سے ہی تو نہیں ممانی جان ـــ آپ لوگوں سے بھی۔“ وہ سحری کے لیے سب کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

نصف رمضان گزر گیا تھا۔

دانیہ انتہائی استقلال کے ساتھ سحری اور افطاری کے وقت ٹرے آراستہ کر کے اسے پہنچا رہی تھی اور وہ بھی اسی استقلال کے ساتھ جوں کی توں واپس کر دیتا۔ اس کے دفتر جانے کے بعد چھوٹی کے ساتھ مل کر اس کے کمرے کی صفائی بھی اس نے اپنا معمول بنالی تھی۔

”تمہیں کوئی اور کام نہیں ہے کیا جو تم میرا کمرا تباہ کر دیتی ہو۔“ ایک روز وہ زچ ہو کر بولا۔

”نہیں ـــ نہیں ہے کوئی اور کام۔“ وہ بے چارگی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انتہائی پچھو کے منہ سے بولی۔

”او خدایا!“ وہ منہ اوپر کر کے بے بسی سے کمرے کی چھت کو دیکھنے لگا۔

”اوپر کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”اپنی قسمت!“

”کیا وہاں ہے؟“ وہ بھی منہ اوپر کر کے چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

”کتنے سکون سے رہ رہا تھا تم نے آ کر۔ ـــ“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں ـــ کیا کیا میں نے آ کر!“

”کچھ نہیں بابا۔“ وہ جھلا گیا۔ ”بائی دا وے تم آئی کتنے دن کے لیے ہو؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”کیا مطلب؟“

”کس بات کا مطلب ـــ“

”کسی بات کا نہیں۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

☆☆☆

دانیہ کے پاکستان آنے کا بڑا مقصد دادا کے انتقال پر ددھیال والوں کو پرسہ دینا تھا مگر اس نے ان لوگوں کو نہ لندن سے اپنی روانگی کی اطلاع دی تھی نہ پہنچنے کے بعد اب تک اطلاع دی تھی۔ وہ اچانک وہاں جا کر انہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی، خیال یہ تھا کہ کراچی پہنچنے کے ایک دو دن بعد وہ اپنی ننھیال کے کسی فرد کے ہمراہ راول پنڈی چلی جائے گی لیکن یہاں آتے ہی ماہِ صیام شروع ہو گیا اور وہ عرِیش کے معاملے میں ایسی گرفتار ہوئی کہ نصف رمضان گزر گیا۔ اب تو جانا لازم ہی لازم تھا عید کے بعد تو اسے انگلستان واپس جانا تھا۔

راول پنڈی اسے اکیلے ہی جانا پڑا کہ یہاں سے کسی کو اس کے ساتھ جانے کی فرصت نہیں تھی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی مجبوری تھی، کوئی بوڑھا، کوئی بیمار، کسی کی ملازمت، کسی کی تعلیم، سچی بات تو یہ تھی کہ مجبوری نہ بھی ہوتی تو اس کے ننھیال سے کوئی اس شخص کے متعلقین سے کوئی ربط نہیں رکھنا چاہتا تھا جس نے ان کے گھرانے کی نیک نفس ساجدہ کو جیتے جی درگور کر دیا تھا۔ طلاق کا صدمہ سہنے پر لے کر تین بچوں کے ساتھ ساجدہ نے کیسے اپنی زندگی گزاری تھی، یہ خود وہی جانتی تھیں یا پھر اُن کے دردمند ـــ کہنے والے تو کہہ دیتے تھے کام نہ بھی کرو تو سرکار خرچا دے دیتی ہے مگر سرکار کے دیے اور مرد کی کمائی میں فرق ہوتا ہے اور پھر مسائل صرف معاشی ہی تو نہیں ہوتے جذباتی بھی ہوتے ہیں۔



کراچی ائرپورٹ پر راول پنڈی کے لیے بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد دانیہ نے ائرپورٹ ہی سے...... اپنے ایک چچا کو ان کے موبائل فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی، یہ فون نمبر اس نے اپنے باپ کے ہی ایک رشتے دار سے لیا تھا جو اپنی فیملی کے ساتھ عرصہ دراز سے انگلستان ہی میں رہ رہے تھے۔ ساجدہ اپنی شادی کے ابتدائی دو ڈھائی سال شوہر کے ساتھ ان ہی کے گھر کے ایک حصے میں کرایے پر رہی تھیں اور تب سے ان لوگوں سے جو تعلقات بنے تھے ساجدہ کی طلاق نے ان تعلقات کو ختم یا کمزور کرنے کے بجائے اور مضبوط کر دیا تھا۔ ان لوگوں کا پاکستان آنا جانا رہتا تھا۔ رشتے دار ہونے کے ناتے دانیہ کے ددھیال والوں سے ان کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ ان سے اپنے چچاؤں اور پھپھیوں کے فون نمبرز لیتے ہوئے دانیہ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ وہاں پہنچ نہیں جاتی یہ لوگ انہیں کچھ نہ بتائیں۔

دادی، چچاؤں اور پھپھیوں نے دانیہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی صورت، اس کا... سراپا، لباس، گفتگو، اٹھنے، بیٹھنے، چال، ڈھال غرض ایک ایک بات کی تعریف کی جاتی اور اس کے باپ پر سو سو صلواتیں بھیجی جاتیں۔

”ہائے کیسا بدنصیب ہے نذیر علی جو ایسی اچھی اولاد سے محروم ہو کر بیٹھ گیا۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نماز روزے کی ایسی پابند کہ کیا ہماری پاکستانی لڑکیاں ہوں گی۔“ دانیہ دو تین دن رہنے کے ارادے سے آئی تھی مگر ددھیال والوں نے اسے ہفتہ بھر بعد بھی جانے کی بہ مشکل اجازت دی۔

”میں پھر آؤں گی دادو۔“ اس نے بوڑھی دادی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔

”میں کہاں ہوں گی۔“ دادی کے لہجے میں حسرت تھی۔

”یہیں ہوں گی اور کہاں!“

”بوڑھے آدمی کا کوئی پتا نہیں ہوتا کب پرچی کٹ جائے۔“

”جب میں دوبارہ آؤں گی تو آپ انشاء اللہ یہیں ہوں گی۔ اسی چارپائی پر بیٹھی ہوئی اور میں آ کر کہوں گی دادو میں پھر آ گئی ہوں۔“ دادی رونے لگیں۔ بڑھاپے میں انسان اتنا رقیق ہو جاتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی آنسو پھوٹ پڑنے کو تیار ہوتے ہیں۔

”اچھا دادو......“ اس نے جھک کر دادی کے سر کو بوسہ دیا۔ زندگی دورخی چال چلتی ہے، کبھی بچے بڑوں کی توجہ اور پیار کے طلبگار ہوتے ہیں کبھی بوڑھوں کو بچوں کی توجہ اور پیار کا محتاج بنا دیتی ہے۔

☆☆☆

سحری اور افطاری کی ٹرے آنے کا سلسلہ تھمنے سے وہ دوبارہ یکسو ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا یہ سب اماں کی چال تھی ورنہ دور دیس سے آنے والی پھوپی زاد کو کیا پڑی تھی کہ وہ دونوں وقت ٹرے سجا کر لاتی رہی۔ جس دیس کی وہ پروردہ تھی وہاں تو اپنے بھی اپنوں کے نہیں ہوتے۔ ماں باپ اور اولاد بھی ایک خاص وقت تک ایک دوسرے کے پھر تیرا راستہ اور میرا اور بیوی، شوہر سے کہتی ہے اپنا ناشتا خود بناؤ، اپنے جھوٹے برتن خود جا تو اس دیس کی پروردہ کو غیروں جیسے اجنبی ماموں زاد کے لیے ٹرے سجا کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اماں، صرف اماں...... یہ انہی کا اسٹیج کردہ ڈراما تھا جو فلاپ ہو گیا۔ وہ شاید واپس چلی گئی، کیا سمجھتی تھیں اماں کہ وہ ایک لڑکی کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ دو چار دن سحری افطاری بھجوا کر اسے اس کے محاذ سے پسپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

"ہرگز نہیں! کسی قیمت پر نہیں۔"

وہ کسی سنہری جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔ اسے اپنا مورچہ چھوڑنے کی مجبوری تھی نہ ضرورت، یہ طے تھا کہ اب زندگی اسی طور گزرے گی۔ زوباریہ کی یادوں کو سینے سے لگا کر۔ زوباریہ اگر بے وفائی کر گئی تھی تو یہ اس کا معاملہ تھا۔ وہ تو بے وفا نہیں تھا، اسے زوباریہ سے محبت تھی، کل بھی اور آج بھی اور محبت، وفاداری اور بے وفائی سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اسے انجام سے علاقہ نہیں ہوتا۔ وہ تو بس اتنا جانتی ہے کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے! سو وہ زوباریہ کے نام کی دھونی رمائے بیٹھا تھا اور بیٹھا ہی رہنا چاہتا تھا۔ ساجدہ پھپھو کی بیٹی جیسی ایک نہیں دس حسیناؤں کو بھی اماں سحری اور افطاری کی ٹرے تھما کر اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑا کر دیتیں تو بھی وہ اس گھر کے لوگوں سے اپنے ٹوٹے روابط بحال کرنے والا نہیں تھا۔

زندہ باد، اے محبت زندہ باد!

مگر یہ کیا! وہ تو اپنی دانست میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ چلی گئی ہوگی مگر وہ تو پھر اسی طرح ٹرے اٹھائے دوبارہ اس کے کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم پھر آ گئیں!" وہ اس پر آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ کچھ کہے سنے بنا وہ اس کے پہلو سے راستہ بناتی خاموشی سے آگے بڑھی اور اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔

"اے! اسے اٹھاؤ۔" اس نے انگلی سے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

"میں نے پہلے بھی بتایا تھا میرا نام دانیہ ہے۔"

"دانیہ ہو یا دانیہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

وہ اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ "آپ کو یہ خوش فہمی کیوں ہوئی کہ کسی اور کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"دلچسپی نہیں تو یہ ٹرے کیوں لائی جا رہی ہے؟"

"سب آپ کی طرح خود غرض نہیں ہوتے، کچھ لوگ ہیں اس دنیا میں جنہیں دوسروں کا بھی خیال ہوتا ہے۔"

"تمہیں کس نے اجازت دی کہ مجھے خود غرض کہو۔"

"میں نے آپ کا نام تو نہیں لیا۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں کہ سمجھ نہ سکوں۔"

اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہوتا ہے۔"

"تم حد سے بڑھ رہی ہو۔" وہ غرایا۔

"میں اس حد سے بھی بڑھ سکتی ہوں۔" وہ مسکرا دی۔

"میں نے پھر کچھ کہہ دیا تو پھر ٹسوے بہانے بیٹھ جاؤ گی۔"

"زیادہ سے زیادہ کیا کہیں گے شٹ! آپ لوگوں کو بس یہی آتا ہے، کبھی انگلینڈ آئیں ایسی عمدہ اور نفیس گالیاں سننے کو ملتی ہیں کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں کو مبارک ہو، مجھے تمہارے انگلینڈ آنے اور گالیاں سننے کا کوئی شوق نہیں۔" وہ بھنا کر بولا۔

"خدا نہ کرے جو انگلینڈ میرا ہو، میرا تو پاکستان ہے۔"

"برٹش نیشنلٹی پر یونہی اتراتے ہیں تم جیسے



لوگ۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"کم از کم میں تو نہیں۔"

"دماغ مت کھاؤ..... جاؤ۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیزاری سے کہا۔

"جا رہی ہوں..... پھر آنے کے لیے۔"

"مصیبت!" وہ اس کے جانے کے بعد بڑبڑایا۔

میز کے نزدیک آ کر اس نے ٹرے کا بغور معائنہ کیا، دودھ پھینی کھائے بغیر یہ دوسرا رمضان گزر رہا تھا، گھر کی خواتین کے ہاتھ کی سحری اور افطاری کا اہتمام اور مزہ ہی اور ہوتا ہے مگر اس روز بھی اس کے دفتر جانے کے بعد سحری کی ٹرے ان چھوئی رکھی ملی۔

☆☆☆

اگلے روز اتوار تھا۔

سحری، نمازِ فجر اور قرآن مجید کی تلاوت کے بعد سب حسبِ معمول سو گئے۔ چھٹی تھی عریش کو بھی دفتر نہیں جانا تھا۔ دن چڑھے دانیہ کی آنکھ کھلی تو کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں کوئی روز روز سے کراہ رہا تھا۔ مردانہ آواز تھی، شاید ابا..... اور باہر کچھ کھلبلی سی مچی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی پریشانی میں ہو، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اسکارف سر پر لیا، پاؤں میں چپلیں پہنیں اور دروازے کا رخ کیا۔

"چھوٹی مجھے قرآن مجید دے انہیں ہوا دوں قرآن مجید کی۔" اماں ابا کے کمرے سے اماں کی آواز آ رہی تھی، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، دانیہ تیزی سے لپکی، ابا سینے پر ہاتھ دھرے زور زور سے کراہ رہے تھے۔ منہ یوں کھلا ہوا تھا جیسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی ہو، چہرے پر پسینے کے آثار تھے۔ اماں ان کے پاس ہی تھیں، ہراساں اور لرزاں کبھی ان کا کندھا دبانے لگتیں کبھی سینہ تھپتھپاتیں، چھوٹی نے انہیں قرآن مجید دیا تو وہ قرآن مجید ابا کے چہرے کے نزدیک کر کے انہیں ہوا دینے لگیں۔

"شاید ہارٹ اٹیک....." دانیہ کو گمان ہوا۔

"ممانی جان! ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔

"ایں!" اماں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اسے بے بسی سے دیکھا اور روہانسے لہجے میں بولیں۔

"کون لے جائے؟ ارے، ہے کون جو لے جائے۔"

لمحے بھر کو تو وہ کنگ سی کھڑی دیکھتی رہی، ابا کی حالت بہت خراب ہوئی جا رہی تھی۔ ایمبولینس! اتوار.....

عریش!

وہ مڑی، سرعت سے کمرے سے نکلی، لپکی اور عریش کے کمرے کا دروازہ بری طرح دھڑ دھڑا ڈالا۔ وہ سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا تو اسے کھڑے دیکھ کر بپھر گیا۔ "کیا مصیبت ہے! دروازہ کھٹکھٹانے کی تمیز ہے یا نہیں۔"

"ماموں..... ماموں کی طبیعت بہت خراب ہے..... بہت زیادہ..... وہ....." اس نے اپنا بازو کھول کر اماں ابا کے کمرے کی راہداری کی سمت اشارہ کیا۔ "بہت..... بہت تکلیف میں ہیں۔" اس کے لہجے سے لگتا تھا اُن کی تکلیف اسے بھی غیر معمولی تکلیف سے دوچار کیے دے رہی تھی۔ دفعتاً اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "پلیز! ہیلپ! انہیں فوراً! اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔" وہ دم بخود کھڑا رہا۔

"ہیلپ ہم۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ وہ مڑا اور دانیہ نے اسے کسی مشینی انسان کی طرح لپے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے ڈگ بھرتے اور بیڈ سائڈ سے گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھاتے دیکھا۔

☆☆☆

دانیہ کا گمان درست تھا۔ دو دن ابا کو سی سی یو میں رکھا گیا اور ان دو دنوں میں عریش، دانیہ، نایاب اور عارف اسپتال کا کوڑی پھیرا لگاتے رہے، ایک آتا، دوسرا جاتا، دوسرا آتا، پہلا جاتا اماں کو ان کی اپنی طبیعت کے خیال سے زیادہ دیر اسپتال میں نہ ٹھہرنے دیا جاتا۔ وہ تھوڑی دیر کو آتیں پھر نہ چاہتے ہوئے بھی سب کے کہنے پر گھر چلی جاتیں، سوموار کی صبح عریش نے اپنے دفتر بھی اطلاع کردی تھی۔ دو تین کو لیگز تو فوراً ہی اسپتال پہنچے اور ابا کو سی سی یو کے باہر ہی سے ایک نظر دیکھ کر چلے گئے۔ عریش کا فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا کبھی گھر سے فون، کبھی کسی رشتے دار کی جانب سے ابا کی مزاج پرسی اور کبھی اس کے دفتر کے کسی فرد کی طرف سے بذریعہ فون عیادت۔ ابا کی اچانک علالت نے عریش اور گھر والوں کے درمیان کھڑی دیوار وقتی طور پر تو گرا ہی دی تھی۔

تیسرے دن جب ابا کو سی سی یو سے علیحدہ کمرے میں منتقل کیا گیا تو عریش ان کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ تھا۔ ابا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر زردی بکھری ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں مگر عریش کا ہاتھ اپنے سینے پر دھرے وہ بڑے پُرسکون لگ رہے تھے۔

''ہم سب ابا کے پاس تھے مگر انہوں نے ہاتھ بس بھیا ہی کا تھاما ہوا تھا۔'' بعد میں نایاب نے اماں کو بتایا چوتھے دن شام کے وقت ابا کو اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ اس روز ستائیسواں روزہ تھا۔

افطار کے وقت عریش اپنے کمرے میں چلا گیا تو اماں اداس ہوگئیں۔

''دانیہ باجی، آپ افطاری کی ٹرے رکھ آئیں، کیا پتا آج بھیا جی گھر کی افطاری کر ہی لیں۔'' چھوٹی نے کہا۔

''کوئی ٹرے ورے نہیں۔'' دانیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

چھوٹی نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولی۔

''چار دن ایک پاؤں سے کھڑے رہے ہیں بھیا جی بیچارے اسپتال میں۔''

''کوئی احسان نہیں کیا، ان کا فرض تھا۔۔۔ ساری زندگی بھی ایک پاؤں سے کھڑے رہیں تو ماں باپ کا حق ادا نہیں کرسکتے۔''

''ہیں!''

''جی ہاں۔''

''میں تو خوش ہورہی تھی کہ بھیا جی کا روزہ ٹوٹ گیا مگر وہ تو پھر اپنے کمرے میں بند ہوگئے۔'' چھوٹی بجھے بجھے لہجے میں بولی۔

دانیہ خالی ہاتھ عریش کے کمرے کے دروازے پر جا پہنچی، ہلکی سی دستک دی تو اندر سے جواب ملا۔ ''ہاں کون ہے؟''

''میں۔''

اس نے دروازہ کھول دیا اور انتہائی ممنونیت سے بولا۔ ''تھینکس اے لاٹ۔۔۔ آپ نے میری بہت مدد کی۔''

''میرا فرض تھا۔'' وہ بولی۔

''حیرت ہے۔''

''کس بات پر؟''

''اس معاشرے میں رہتے ہوئے جہاں اولاد ماں باپ کی نہیں احساسِ فرض!''



''عموماً معاشرہ کوئی برا نہیں ہوتا، اچھے برے لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں، یہاں کی طرح وہاں بھی ماں باپ سے محبت کرنے والی اولاد بھی ہوتی ہے اور نا خلف بھی، بس یہ کہیں اندازِ محبت اور طریقۂ زندگی مختلف ہے۔ وہاں ماں باپ کو چاہنے والے ان پر پھولوں اور کارڈوں کی رم جھم رکھتے ہیں۔ یہاں ایک مرتے ہوئے باپ کو دوبارہ زندگی سے ہمکنار ہونے میں مدد دینے والے اپنی انا کو مجروح نہ ہونے دینے کی خاطر پھر دوسرے کنارے پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔''

''طنز کررہی ہیں مجھ پر۔''

''جی نہیں، ایک سمجھدار انسان کو اس کی ناسمجھی کا احساس دلانے کی کوشش کررہی ہوں۔'' اس نے توقف کیا پھر بولی۔ ''ماموں جان کی بیماری کے دوران آپ نے جس طرح ان کا خیال رکھا اس سے مجھے اتنا اندازہ تو ہوگیا کہ آپ ماموں جان اور ممانی جان دونوں ہی سے بے حد محبت کرتے ہیں اور اگر خدانخواستہ ماموں جان کو آپ کی بے خبری میں کچھ ہوجاتا تو شاید آپ بہت اپ سیٹ ہوجاتے۔ دونوں بوڑھے ہیں، عمر کے اس حصے میں جب کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے اگر آپ اپنی انا کا خول اوڑھے اپنے کمرے میں بند ان سے لاتعلق بیٹھے رہے اور خدانخواستہ ان دونوں میں سے کوئی آپ کی ضرورت ہوتے ہوئے آپ کو اپنے نزدیک نہ پاکر۔۔۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر چند ثانیے بعد بولی۔ ''تو کیا آپ خود کو معاف کرسکیں گے؟'' وہ کچھ نہیں بولا۔

''یہ تو محض اتفاق ہے کہ میں یہاں موجود تھی، میں نے آپ کو فوراً ہی خبر کی ورنہ ممانی جان بے چاری تو ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی رہ گئی ہوتیں، ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی آپ کو خبر دینے والا موجود ہو۔''

اس نے بے ساختہ چونک کر دانیہ کی طرف دیکھا۔ ''افطار کا وقت ہونے والا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں تو چلیں میں آپ کو بلانے کے لیے ہی آئی ہوں۔''

وہ متذبذب دکھائی دینے لگا۔

''ماموں جان بلا رہے ہیں آپ کو۔'' اس نے مصلحت آمیز جھوٹ سے کام لینے کی کوشش کی۔

وہ بدستور الجھا الجھا کھڑا رہا۔

''چلیں۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

وہ شش و پنج کی کیفیت میں تھا۔

''کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ صلح کے آرزومند ہوتے ہیں اور صلح کروانے والا تیسرا ہاتھ نہیں ملتا۔''

''دانیہ باجی۔۔۔'' چھوٹی کی پکار سنائی دی۔

''آتی ہوں۔'' اس نے گردن کو خفیف سا موڑ کر بلند آہنگی سے جواب دیا۔

''بس دو منٹ رہ گئے ہیں افطار میں۔'' چھوٹی اپنی آواز کے ساتھ راہداری میں پہنچ چکی تھی۔ عریش کو دیکھتے ہی اس کے قدم رک گئے تھے۔

''کوئی طریقہ ہے انہیں لے جانے کا؟'' دانیہ نے چھوٹی کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہے تو۔۔۔'' چھوٹی جو عریش کو دیکھ کر متکلف دکھائی دینے لگی تھی بڑی بے تکلفی سے بولی۔

''کیا بھلا؟''

''ڈنڈا ڈولی۔''

''چلیں۔۔۔'' دانیہ نے اس کا ہاتھ اچانک ہی اپنے ہاتھ میں لے کر اسے زبردستی کھینچنا چاہا۔ وہ چل پڑا۔

افطار پر عریش کو دیکھ کر اماں کا رواں رواں کھلا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جارہا تھا۔ ابا بھی ہزار منع کرنے کے باوجود بستر علالت سے اٹھ کر ان سب کے ساتھ آبیٹھے تھے اور بہت خوش تھے۔

''اس گھر میں اس مرتبہ دو سال بعد عید آرہی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''ممانی جان عید تو ہر سال آتی ہے۔'' دانیہ نے کن انکھیوں سے عریش کو دیکھا۔

''بیٹی! عید نام ہے کسی اچھے کام کے بدلے انعام کا...... عید نام ہے خوشی کا...... آدمی کا دل خوش ہو تو ہر دن، روز عید بن جاتا ہے۔'' ابا کی آواز نقاہت مگر خوشی سے معمور تھی۔

''کیا خوشی اس عید کی جو دانیہ باجی کی طرح آئے کہیں دور سے۔'' چھوٹی بولی۔

''واہ! کیا بات کہی ہے اس بچی نے۔'' ابا پھڑک کر بولے۔

عریش اپنی نشست کا زاویہ اور سر کا رخ بدلے بنا صرف آنکھوں کے ڈھیلے اوپر چڑھا کر چھوٹی کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر اپنا کان دبا رہی تھی۔

دانیہ مسکرا دی۔

☆☆☆

انتیس کا چاند تھا۔ چاند رات پورے سنگھار، پورے نکھار کے ساتھ اتری۔

اماں اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتی حواس باختہ ابا کے پاس پہنچیں۔ ''ایسی باؤلی ہوگئی ہوں میں اس بڑھاپے میں کہ کیا بتاؤں۔''

''کچھ تو بتاؤ۔'' عریش سے تعلقات کی استواری کے بعد ابا غیر معمولی خوشگوار موڈ میں رہنے لگے تھے۔

''پتھر پڑیں موئی اس عقل پر۔'' اماں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''درزی کے ہاں دانیہ کا جوڑا سلنے کو ڈالا تھا۔ اس نے کہا تھا اٹھائیس رمضان کی شام یاد سے منگوالینا کیونکہ اٹھائیس کی رات سارا کام نمٹا کر میں اور میرے کاریگر گاؤں چلے جائیں گے۔'' اماں نے دوبارہ اپنے سر کو پیٹا۔ ''کمبختی مارا یہ دماغ ایسا خراب ہوا ہے کہ یاد ہی نہیں رہا...... کیا کہے گی دانیہ اور کیا سوچیں گی ساجدہ کے بچی ننھیال گئی اور وہاں...... بس آپ کی بیماری کے چکر میں بھول گئی میں۔''

''ارے بھئی تو اس میں سر بے چارے کو اتنا پیٹنے اور دماغ کو کوسنے کی ضرورت کیا ہے۔ کپڑے سلے سلائے بھی تو مل جاتے ہیں۔'' ابا نے کہا۔

''آج چاند رات ہے، نایاب بے چاری تو نندوں کے ہاں عیدی لے جانے کے چکروں میں ہوگی آپ کی طبیعت اس لائق... نہیں، کون لے جائے دانیہ کو سلے سلائے کپڑے خریدوانے۔'' اماں بولیں۔

''ایک عدد مرد جواں بھی رہتا ہے اس گھر میں جس کا نام ہے عریش......''

''وہ لے جائے گا بھلا...... خدا خدا کر کے تو اس کا بگڑا موڈ بہتر ہوا ہے۔''

''کیوں نہیں لے جائے گا، میں کہتا ہوں ابھی۔'' ابا رازداری سے کوئی بات کہنے کے لیے اماں کے نزدیک اپنا منہ لائے۔ ''مجھے پتا ہوتا کہ میرا ہارٹ اٹیک کام دکھا جائے گا تو اب تک چھ سات......''

اماں نے اپنا ہاتھ ابا کے منہ پر رکھ دیا اور انہیں شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''خدا نہ کرے۔''

ابا کے حکم پر عریش چاند رات کو دانیہ کو شہر کے سب سے بڑے شاپنگ مال میں دکان در دکان لیے پھرا...... اماں نے کہا تھا کوئی چیز رہ نہ جائے۔ ریڈی میڈ سوٹ، سینڈلیں، جیولری، کاسمیٹکس، چوڑیاں اور مہندی۔ چھوٹی بھی مصاحبِ خاص بنی دانیہ کے ساتھ تھی۔ جس نے غضب یہ کیا کہ رات تین بجے جب وہ دونوں اپنے ہاتھوں پر مہندی لگائے مٹھیاں بنی پارلر سے نکلیں تو اس نے دانیہ کے کان میں چپکے سے آئس کریم کی فرمائش پھونک دی۔

''ہاتھوں میں تو مہندی لگی ہے آئس کریم کھاؤ گی کیسے تم لوگ؟'' عریش نے کہا۔

''مجھے کھانی آتی ہے بھیا جی...... دونوں کلائیوں میں دبا کر کھالوں گی۔'' چھوٹی چہکی۔

''اور جنہیں نہیں آتی؟''

''انہیں آپ کھلا دیجیے گا۔''

عریش ٹپٹا کر رہ گیا۔

چھوٹی کو بہت ہی سر چڑھا لیا تھا گھر والوں نے۔

☆☆☆

صبح عید تھی اور اس عید نے عریش کے اس خیال کو خام ثابت کر دیا تھا کہ زوبار یہ اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ خالص مشرقی وضع کے فیروزی رنگ کے کامدار جوڑے میں دانیہ بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ مرمریں کلائیوں میں کانچ کی ست رنگی چوڑیوں کی چھبن دیدنی تھی اور اس پر قیامت ہتھیلیوں کے حنائی بیل بوٹے۔

''عیدی!'' اس نے اپنا حنائی ہاتھ عریش کے سامنے پھیلایا تو اس کا دل الٹ پلٹ کر رہ گیا۔ خواب کی سی کیفیت میں اس کے ہاتھ دانیہ کے ہاتھ تک جا پہنچے۔

''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کون ہے وہ؟'' عریش کو اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''ما..... میری ما اور کون.....''

''اوہ گاڈ!'' عریش نے اطمینان بھری سانس کھینچی۔ ''میں تو ڈر ہی گیا تھا..... اچھا سنو۔'' دانیہ کے سراپا سے اٹھتی مہک اسے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔ ''مجھ سے شادی کرو گی؟''

وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''آپ کی اس محبت کا کیا بنے گا جس کی خاطر آپ ساری دنیا تیاگے بیٹھے ہیں۔''

''ہیل ٹو ہر۔''

''ہیں، ہیں، ہیں۔'' وہ آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولی۔

''تمہاری خاطر میں پاکستان چھوڑ کر انگلینڈ جا بسنے کو بھی تیار ہوں۔'' عریش کے لہجے میں ایک گونہ بے تابی اور سپردگی تھی۔

''دل سے بے ایمانی نہیں جاتی۔'' دانیہ نے اسے ایک ادائے قاتلانہ سے دیکھا۔

''کیا مطلب!'' وہ ہڑبڑا گیا۔

''بوڑھے والدین اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کون جاتا ہے؟''

''اماں ابا کو بھی وہیں بلا لیں گے۔''

''اتنا آسان نہیں ہے۔''

''ہو جاتا ہے..... سب ہو جاتا ہے۔''

''اور اپنا وطن؟''

''یار ہم یہاں آتے رہیں گے۔''

''آپ پاگل تھے، پاگل ہیں اور پاگل ہی رہیں گے۔''

''کیا..... کیا مطلب.....؟''

''اتنے جھمیلوں میں پڑنے کے بجائے اگر میں ہی یہاں آ جاؤں؟''

''رئیلی!'' وہ اچھل ہی تو پڑا۔ ''اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''ما بھی لمبا پردیس کاٹ کر بیزار ہو چکی ہیں، اب اپنے وطن میں رہنا چاہتی ہیں۔''

''سر آنکھوں پر بھئی!'' عریش پر شادیِ مرگ کی کیفیت تھی۔ ''تو تم واپس نہیں جا رہیں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''جانا تو پڑے گا۔''

عریش کا منہ لٹک گیا۔

''لیکن بہت جلد واپس آؤں گی۔''

''جب تک تم واپس نہیں آ جاتیں.....'' عریش کی لے دھیمی تھی۔

''رک کیوں گئے؟''

''آئی ول مس یو۔''

دانیہ نے نظریں جھکا لیں۔

''میں انتظار کروں گا۔''

''میں بھی.....'' اس نے آہستہ سے کہا۔

عریش نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے، وہ چونکی اور اس کی نظریں یکبارگی عریش کی جانب اٹھیں۔

''عید مبارک.....'' اس کے لہجے میں سرخوشی تھی۔

''عید مبارک!''

''چلو، اماں ابا کو بھی عید مبارک کہہ دیں۔''

عریش اپنی آنکھوں میں گہری وارفتگی سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔

دانیہ کو اپنی سماعت میں بس ایک ہی صدا سنائی دے رہی تھی۔ ''عید مبارک.....''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# جہاں ہم ہیں

نصرت شمشاد

''پہلی بار کال ملی ہے میری..... اتنی خوشی ہو رہی ہے..... میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔'' حسبِ معمول میں کام کو پسِ پشت ڈالے دفتر کے فون سے ایک ایف ایم ریڈیو اسٹیشن پر فون ملائے حرام خوری پلس ہڈحرامی میں مصروف تھا، مارے خوشی اور جوش و خروش کے باچھیں کھل کر جبڑوں تک پہنچی ہوئی تھیں آخر پورے ڈیڑھ گھنٹے کی محنت مشقت کے بعد کال ملی تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ تو اچھی بات ہے..... ورنہ بیکار میں Drag ہی کرتے..... آپ تو بس یہ بتائیں کہ آج پروگرام کیسا لگ رہا ہے آپ کو..... مزہ تو آرہا ہے نا؟'' خاتون R.J نے حد درجہ لگاوٹ سے دریافت فرمایا، میں نے بھی بے قابو ہوتے جذبات کی لگام کو قطعی آزاد چھوڑ دیا۔

''ایسا..... ویسا!..... بہت مزہ آرہا ہے..... بلکہ آج کیا ہمیشہ ہی آتا ہے۔ کیونکہ آپ تو ہمیشہ ہی بہت اچھا پروگرام کرتی ہیں..... آپ کی آواز تو بہت ہی اچھی ہے..... میں تو آپ کا ریگولر لسنر ہوں..... بس اس سے پہلے خاموش تھا..... پورے چار سال ہوگئے ہیں مجھے آپ کو سنتے ہوئے۔''

''ہیں!..... ارے واہ..... نہایت ہی باکمال آدمی لگتے ہیں آپ تو مسٹر اشعر!'' کچھ پُراسرار سے انداز میں محترمہ دبی دبی سی ہنسی کے درمیان گویا ہوئی تھیں، مجھے پل بھر کو کسی انہونی کا سا احساس ہوا مگر اگلے ہی پل میں نے اپنے اس خیال کو بیکار کا وہم قرار دیتے ہوئے فی الفور نہایت مسرت اور شادمانی کے ساتھ اس قدر، قدر شناسی پر خاتون کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

''شکریہ کی اس میں کوئی بات نہیں ہے..... آج میں اپنی زندگی کا پہلا ریڈیو پروگرام کر رہی ہوں اور آپ پچھلے پورے چار سال سے مجھے سن رہے ہیں..... یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے؟'' صاف گوئی کی ایسی انتہا کا سامنا کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا، حالانکہ میں خاصا منجھا ہوا تجربہ کار جھوٹا تھا مگر جملہ اس قدر بے ساختہ اور غیر متوقع تھا کہ میری گھگی سی بندھ گئی۔

''ایک مشہور مقولہ ہے اشعر صاحب! آپ نے بھی یقیناً سنا تو ہوگا..... جھوٹے کے منہ پر لعنت..... آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' ایک دل جلانے والی کھلکھلاہٹ کے ساتھ گل افشانی کی گئی تھی۔

''لعنت ہے بھئی۔'' مارے خجالت کے بے اختیاری کے عالم میں میرے منہ سے پھسلا تھا۔

''میری طرف سے بھی۔'' دوسری جانب سے مزے سے فرمایا گیا تھا، اس قدر مٹی پلید ہونے کے بعد اب میرے حق میں مناسب یہی تھا کہ میں فی الفور لائن کاٹ کر اپنی ناک مزید کٹنے سے بچالوں چنانچہ میں نے یہی کیا اور اپنی خجالت مٹانے کے لیے خوامخواہ ایک فائل کھول کر اس کے صفحات الٹ پلٹ کرنے لگا تبھی میرے سیل فون کی میسج الرٹ ٹون بج اٹھی، میں نے بے دلی سے سیل فون اٹھایا اور بھونچکا رہ گیا۔

''کیا..... اوہ..... نہیں..... کیسے!'' کوچی کی اچانک موت کی ناگہانی خبر موصول ہوئی تھی، میں ماتمی لہجے میں نہایت جوش و خروش سے گردن ہلاتے ہوئے خاصا ہکا بکا سا تھا، حالانکہ ان موصوف سے میرا کبھی بھی کوئی ایسا شدید قلبی لگاؤ نہیں رہا تھا کہ اس کے داغِ مفارقت دے جانے کے غم میں میری آنکھیں پھٹ جاتیں اور منہ کھل جاتا..... بلکہ سچائی تو یہ تھی کہ میرے اندر موجود حاسد، جل کُکڑا اور کم ظرف سا آدمی جو اپنی ان تمام خوبیوں کو بڑے فخر سے پوزیسو نیس گردانتا تھا..... جی ہاں پوزیسیو اپنی کم ظرفی، خودغرضی، جیلیسی، بغض، بخل اور کمینہ پن وغیرہ وغیرہ کو جسٹ فائی کرنے کی جدید اصطلاح اور آسان لفظوں میں کہوں تو اپنے گھٹیا پن پر پردہ ڈالنے کا ماڈرن طریقہ..... میں چونکہ سنبل کے معاملے میں انتہائی پوزیسیو واقع ہوا تھا سو اپنے تئیں اس بے ضرر جان کو اپنا رقیبِ روسیاہ مانے بڑی مدت



سے دیدۂ و دل فراش کیے اس بے چارے کی موت کے انتظار میں مرا جا رہا تھا اور اب جبکہ وہ بے چارہ ٹھنڈا ہو چکا تھا تو میرے سینے میں ٹھنڈ پڑنے کے بجائے رنج و ملال کے الاؤ دہک اٹھے تھے، دل چاہ رہا تھا کہ دو چار ٹسوے تو ''جانے والے'' کی خدمت میں بطور نذرانۂ عقیدت پیش کر ہی دوں..... شاید اسی طرح اس شقی القلبی کا کچھ ازالہ ہو جائے جو خوامخواہ اس معصوم کو اپنا رقیب تصور کر کے اور زندگی بھر اس سے بیر باندھے رکھنے کے باعث اب یکا یک ہی ضمیر پر دھرا کوئی بھاری بوجھ محسوس ہونے لگی تھی مگر کافی مشقت کے باوجود جب ایک بھی آنسو نین کٹوروں سے باہر آنے پر راضی نہ ہوا تو اس فضول خیال پر مٹی پا (ڈال) دی..... پھر اس کے بعد جو اگلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ ''وہ'' اس رنج کے اس موقع پر کسی قدر شاکڈ ہوگی۔

''وہ'' کے گرد ڈالے گئے ان وائنڈ کو مازسے آپ کو ''وہ'' کی میری زندگی میں اہمیت و خصوصی حیثیت کا اندازہ تو بخوبی ہو ہی گیا ہوگا اور اگر نہیں ہو سکا تو غالباً نہیں یقیناً آپ کے اندر کامن سینس نامی ایک لازمی سینس کا شدید فقدان پایا جاتا ہے خیر تفصیل میں جانے کا وقت نہیں مختصراً بس اتنا جان لیں کہ ''وہ'' یعنی میری پھپھی زاد سنبل شیراز ''وہ'' ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس کے مقابل آتے ہی میرا دل دُگنی رفتار سے دھڑکنے لگتا ہے، جس کے چہرے میں مجھے سارے جہاں کا حسن نظر آتا ہے اور میں اس دنیا کا وہ واحد خوش نصیب ''صاحب'' ہونا چاہتا ہوں جو اس کی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھنے کا اعزاز پا سکے اور جو میری انتیس سالہ زندگی کی اکلوتی، لاڈلی محبت ہے، نہایت حساس، سادگی کا پیکر، شیریں گفتار اور نرم دل جس پر میرا دل چوبیس گھنٹے صدقے واری ہوتا ہے۔

اب زیادہ لفاظی کیا کروں بس سو بات کی ایک بات ہے میں اس پر سو جان سے فدا ہوں جبکہ ''کوچی'' وہ خوش نصیب تھا جس پر وہ سو جان سے فدا تھی.....

اس قدر فدا کہ اس کی وجہ سے اس نے ایک دو بار نہیں کئی سو بار میرے خلوص کا جلوس نکالا تھا، میں جس قدر اس پر جان چھڑکتا ہوں وہ اسی قدر اس ڈیڑھ پسلی کی مخلوق صرف کوچی پر جان چھڑکتی تھی۔

یہ تو فطری سی بات ہے کہ جس پر آپ جان چھڑکتے ہوں اس کی جان نکل جانے کا دکھ انتہائی جان لیوا ہوتا ہے سو اس ناگہانی خبر کے بعد سے مجھ پر یہ جان لیوا ملال طاری تھا کہ وہ اس وقت کس قدر دلگرفتہ اور رنجور ہوگی۔ اسی کے ساتھ اگلا خیال جو میرے ذہن میں آیا تھا، وہ یہ تھا کہ اس رنج کے موقع پر اس کا یہ عظیم دکھ بٹانے کے لیے میرا اس کے پاس ہونا کس قدر ضروری ہے..... بس پھر کیا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑتا ہوا سیدھا چھپی جان کے گھر کی چھت پر جا اترتا مگر مشکل یہ تھی کہ میں فی الوقت دفتر میں موجود تھا اور میرے کھڑوس، بدمزاج، چڑچڑے گنجے باس سے ہفتے کے پہلے ہی ورکنگ ڈے یعنی پیر کو ہی ہاف لیو کا تقاضا کرنا، وہ بھی ایک پالتو کی موت کی خوشی میں..... کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے ایک ایسا سپرب آئیڈیا درکار تھا جو اس پتھر کے دیو کو پھڑ پھڑا کر رکھ دے۔

کہتے ہیں حرکت میں برکت ہوتی ہے سو میں فی الفور حرکت میں آ گیا..... متعدد دیگر عالی دماغ لوگوں کی طرح میرا دماغ بھی عموماً متحرک ہونے کے بعد ہی متحرک ہوا کرتا ہے..... میں اپنے مختصر سے کمرے میں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکرانے لگا..... ایک..... دو..... تین ہر چکر کے اختتام پر میرا تفکر بڑھتا جا رہا تھا، آئیڈیا ایسا درکار تھا جس میں اس چڑچڑے آدمی کے لیے انکار کا آپشن صفر ہو..... بالآخر چھٹے چکر کے اختتام پر ایک عمدہ آئیڈیے کی آمد کے ساتھ ہی میں جلد سرخرو ہو کر اپنی چیتی بائیک کی پیٹھ پر سوار چھپی جان کے گھر کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا، راستے بھر تعزیت کے موقع پر استعمال ہونے والے فقروں کو ذہن میں تر و تازہ کرتے ہوئے چھپی جان کے گھر پہنچا تو میت کے گھر والی روایتی چہل پہل میری منتظر تھی۔

''موت ایک اٹل حقیقت ہے سنبل! اور حقیقت تو ہوتی ہی تلخ ہے..... جس کا بلاوا آ جائے اسے جانا ہی پڑتا ہے۔'' میں نے جاتے ہی ملول سی صورت بنا کر فلمی انداز میں ڈائیلاگ داغا، اس نے بے اختیار سر اٹھا کر شدید خفگی سے مجھے دیکھا۔

''یہ اتنی جلدی کیوں بلاوا آ گیا اس کا..... یہ اس کی عمر تھی کوئی جانے کی؟'' وہ ٹپ ٹپ آنسو چھلکاتے ہوئے سخت برہمی سے بولی تھی۔

اور میرے پاس کہاں ایسی قوتِ گفتار تھی کہ ایسے غیر متوقع سوالات کے جواب میں کوئی کلام کرنے کی جسارت کر پاتا، سو بے چارگی سے چھپی جان کو دیکھ کر رہ گیا بس!

''بری بات بچے..... ایسے نہیں کہتے..... کس



نے کب آنا ہے اور کب جانا ہے..... یہ فیصلے کرنے والا اوپر بیٹھا ہے..... یہ اسی کا کام ہے، اسی پر سجتا ہے..... ہماری اتنی اوقات اور بساط نہیں ہے کہ ہم اس کے فیصلوں پر اعتراض اٹھائیں..... اور یوں بھی ہر نفس کا اصل مقام وہی ہے..... سب ہی نے جانا ہے ایک نہ ایک دن۔'' چھپی جان کی یہ بروقت، مدلل انٹری میرے لیے تو خاصی تقویت کا باعث بنی مگر اس دشمنِ جاں نے ناک سڑکتے ہوئے یوں سر جھٹکا گویا کہہ رہی ہو۔ ''مجھے اس وقت کچھ نہیں سمجھنا بس!''

''میرا بچہ۔'' چھپی جان نے اسے لاڈ سے پکارتے ہوئے اپنی..... ممتا کی آغوش میں سمیٹ لیا۔

''امی میں تو اب ساری زندگی اس کی پیاری سی آواز..... اس کی کیوٹ کیوٹ باتیں سننے کو ترستی رہوں گی۔''

''ہائے، کاش آپی تم نے اس کی آواز ہی ریکارڈ کر لی ہوتی۔'' سارہ نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اپنے تئیں بڑے پتے کی بات کی تھی۔

''کاش!'' حسرت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے باقاعدہ یہ آواز بلند رونا شروع کر دیا تھا..... میرے دل پر گھونسا سا پڑا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی جادو کی چھڑی کے زور سے اس اداس شہزادی کا یہ عظیم دکھ دور کر کے اس کے دلکش چہرے پر مسرت کی کلیاں پھر سے چٹخا دیتا..... مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سے تفاخر نے بھی مجھے گھیر لیا تھا۔ مجھے خود پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا کہ میں نے سنبل جیسی پیاری اور پاکیزہ، انمول لڑکی کا انتخاب کیا تھا..... بے حسی اور نفسا نفسی کے اس دور میں جب انسانی زندگی کی کوئی اوقات و اہمیت نہیں رہی تھی..... ایک معمولی سے طوطے کے غم میں ہلکان ہوتی وہ لڑکی انمول ہی تو تھی مگر اس کا اترا ہوا چہرہ بھی میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا، بے چینی سے پہلو پر پہلو بدلتا میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک زندگی میں پہلی بار بروقت ایک جینئس آئیڈیے نے میرے ذہن پر دستک دے دی، مارے ایکسائٹمنٹ کے جذبات کی بے قابو ہوتی لگام کو بہ مشکل قابو میں کر کے میں نے اس پری پیکر کے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اپنا کارڈ پھینک دیا۔

''تم پریشان کیوں ہوتی ہو سنبل! کچھ ہی عرصے کی بات ہے..... آم کا سیزن اسٹارٹ ہوتے ہی میں تمہیں ایک پیارا سا نیا طوطا منگوا دوں گا..... کوچی سے بھی اچھا اور کیوٹ!'' اس نے فوراً چھپی جان کی آغوش سے سر نکال کر مجھے یوں دیکھا گویا میری عقل پر ماتم کر رہی ہو۔

''میرے کوچی کا مقابلہ دنیا کا کوئی دوسرا طوطا نہیں کر سکتا۔'' اور ایک ہی پھونک میں میرے جوش و خروش کے چڑھتے ابال کو ٹھنڈا کر کے ایک نادیدہ نقطے پر نگاہ جما لی۔

''وہ کوئی عام طوطا تھوڑی تھا کہ آم کا سیزن اسٹارٹ ہوتے ہی اس کی رمی پلیس منٹ ہو جائے گی..... وہ تو کچھ الگ ہی تھا..... دنیا سے نرالا! طوطا کب لگتا تھا وہ..... وہ تو ہمارے گھر کا شیر خوار تھا..... سارا دن اس کی پیاری سی آواز اور معصوم قلقاریاں ہر طرف گونجا کرتی تھیں..... قسمت سے مل گیا تھا مجھے۔'' وہ کوچی کی یادوں کا پٹارہ کھول چکی تھی اور سیکڑوں بار کے سنے سنائے، ازبر قصوں کو پھر کہنے کے فل موڈ میں نظر آ رہی تھی، یہ ایک مشکل پوزیشن تھی اور میں چہرے پر پریشانی سجائے اس کی غیر دلچسپ باتیں سننے پر مجبور تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

شیریں حیدر

قسط 7

تم نا حق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنف نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہیے تھا۔ تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی۔ عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے بہت سی ایسی صورت حال بھی آ جاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چنگیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے۔

**آئیں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے اس تعلق میں کون کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے**

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مراد نگر نامی گاؤں میں تقسیم ہندوستان سے قبل ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ اکٹھے رہتے تھے، جس طرح پاکستان کے باقی سب حصوں میں تھے۔ چوہدری مراد علی اور نور علی دو بھائی تھے، جن کے دادا کے نام پر اس گاؤں کا نام رکھا گیا تھا۔ فطرتاً دونوں بھائی بالکل مختلف ہیں۔ مراد علی شریف النفس اور نور علی عیاش طبع۔ مراد علی کی بیوی عابدہ اور تین بیٹے جہانگیر، شجاع اور شیر علی ہیں۔ شجاع عادات میں اپنے چچا پر ہے حتیٰ کہ ایک رات اپنی بھابی رابعہ کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ مراد علی بیٹوں میں فساد پڑ جانے کے باعث رابعہ کو یہ بات جہانگیر سے چھپانے کو کہتے ہیں اور جہانگیر، رابعہ اور شیر علی کو شہر منتقل کر دیتے ہیں۔ شہر جا کر رابعہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوتی ہے جس کا نام عمران رکھا جاتا ہے۔ نور علی کی بدمزاج بیوی شکیلہ ہے اور بیٹے اکبر اور بابر ہیں۔ دونوں بیٹے باپ کا پرتو ہیں۔ نور علی بیٹیاں بیاہ چکے ہیں اور اس کی خواہش تھی کہ بھائی اس سے بیٹی کا رشتہ لے مگر ایسا نہ ہوا اور بھائیوں میں فاصلے بڑھ گئے۔ نور علی کا بڑا بیٹا اکبر علی ہے۔ جس کے ہاں دو بیٹیوں کے بعد دو جڑواں بیٹیوں کی ولادت ہوتی ہے تو اس کی ماں شکیلہ بیگم، ان بچیوں کے قتل کا حکم ملازماؤں کو صادر کرتی ہے۔ زرتاج یہ سن لیتی ہے۔ زرتاج، گاؤں کی دائی معراج کی بیٹی ہے اور معراج، چوہدری مراد علی کے مرحوم منشی قائم علی کی بیوہ۔ منشی قائم علی چند برس پہلے اپنے گاؤں خوشحال نگر سے اسی گاؤں میں آ گیا تھا۔ اپنے گاؤں سے وہ تجارت کے لیے شہر جاتا تھا وہیں اس کی ملاقات موچی بخش معراج سے ہوئی تو وہ دل ہار بیٹھا اور وہ اس سے شادی پر آمادہ ہوگئی۔ پھر ایک حادثے نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ معراج جس نے نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی، گاؤں میں عورتوں کے لیے ڈسپنسری بنائی اور اپنے تجربے سے ان کی مدد کرنے لگی۔ زرتاج سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹی ماہ تاج کسی درندے کی زیادتی کا شکار ہوگئی اور چھوٹی دو جو کہ جڑواں تھیں، گم ہو گئیں۔ بچیوں کی گمشدگی کو معراج کی غفلت جان کر قائم علی نے اس کو شہر بھیج دیا۔ زرتاج باپ کے پاس گئی اور گاہے بگاہے ماں سے ملنے جاتی تھی۔ معراج کو اپنے محلے کی ایک عورت نے دین کی روشنی سے فیض یاب کرنا شروع کیا تو اسے سکون مل گیا۔ قائم علی سکون کی تلاش میں ایک کوٹھے پر جا پہنچا۔ ماہ تاج سے زیادتی کرنے والا سہیل ایک آوارہ اور بدکردار نوجوان ہے جو ماں باپ کے باہمی اختلافات کے باعث ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اس نے اپنے ساتھ زبردستی اپنے دوست سلیم کو شریک جرم کر لیا۔ وہ اس گناہ پر خود کو معاف نہیں کر سکا اور خودکشی کر لیتا ہے۔ سہیل کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے اور وہ ہر وقت خوفزدہ رہتا ہے۔ اس کی ماں نسرین عرف نینا بیٹے کی حالت سے پریشان ہے۔ سہیل کا باپ اسلم کردار کا کمزور آدمی ہے۔ قائم علی کی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک، جہاں آرا نامی طوائف کے ہاتھ لگتی ہے جس کے پاس اس سے قبل ہر عمر کی چھ لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں۔ الماس سب سے بڑی ہے اور اس کا نام فیروزہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں آرا کا اپنا سگا بیٹا، دلاور ہے، جسے عرف عام میں دلی کہتے ہیں۔ جہاں آرا اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی ہے مگر وہ اپنے ماحول سے اثر لیتا ہے اور اسکول جانا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ اسکول میں بچے اسے طعنے دیتے ہیں۔ مریم ایک استانی ہے، جس کا آگا پیچھا اس کے محلے میں کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی ایک دور پار کی رشتے دار سائرہ ہے جس کے ہاں وہ پشاور جاتی ہے تو واپسی پر ایک گمنام، چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے لیٹرین میں ایک بچی اسے بے ہوش ملتی ہے، یہی قائم علی کی دوسری بیٹی ہے۔ اپنی ملازمہ بجیا کو وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی کزن سائرہ نے اسے یہ بچی دے دی ہے۔ یوں قائم علی کی بیٹیاں، حسن آرا، ستارہ بن کر مریم کے گھر میں اور نین تارہ فیروزہ بن کر جہاں آرا کے گھر میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ زرتاج جب چوہدرانی شکیلہ کا حکم سنتی ہے تو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں خبر آتی ہے کہ چوہدری اکبر علی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ پیدا ہونے والی بچیوں میں سے ایک تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے اور اکبر علی کی بیوی فاخرہ کی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ زرتاج بے اختیاری میں اس بچی کو اٹھا کر شاکر کے پاس جاتی ہے۔ شاکر گاؤں کا نوجوان سنار ہے اور اس کی بات زرتاج سے تقریباً طے ہے۔ زرتاج شاکر سے کہتی ہے کہ اس بچی کو چھپا لے۔ زرتاج کے علم میں لائے بغیر وہ زیور کے ترک کے اس بچی اور اپنا سامان وغیرہ لے کر گاؤں سے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں بس میں اس کی ملاقات ناہید نامی ایک نوجوان خاتون سے ہوتی ہے وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس شہر جا رہی ہے۔ بس میں وہ بچی کو سنبھال لیتی ہے اور جب شاکر بس سے اتر کر کچھ لینے کو باہر جاتا ہے تو واپسی پر وہ لڑکی غائب ہوتی ہے۔ بی بی جی گاؤں کی بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کا بیٹا عباس اور بیٹی کلثوم..... دو ہی اولادیں ہیں۔ عباس ہندو گھرانے کی ایک لڑکی سے دوستی قائم کر لیتا ہے اور جب بی بی جی کو علم ہوتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ عباس، دیا کو لے کر بھاگ جاتا ہے تو پنچایت..... کلثوم کی شادی ہندوؤں کے نوکر گھونو سے کرنے کا فیصلہ دیتی ہے۔ اسی رات کلثوم کی بیل کا جل خودکشی کر لیتی ہے کیونکہ وہ دیا کے بھائی شمبھو کی منگیتر ہے اور گھر والوں کو شک ہے کہ کاجل دیا کی شریک راز تھی، حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی رات کی سحر کو بی بی جی فجر کی نماز پڑھتے ہوئے ایسی سجدے میں گئیں کہ اٹھ ہی نہ سکیں۔ کلثوم بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ کیجیے



سہیل امتحان میں بری طرح فیل ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سخت گیر باپ سے پھر ڈانٹ کھانا پڑی تھی جنہوں نے کبھی اس کے ساتھ شفقت سے بات نہیں کی تھی اور اس کا یہی رویہ اسے ایک منفی شخصیت میں ڈھالنے میں بنیاد ثابت ہوا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا مگر والدین کے درمیان شخصیاتی تضادات نے اسے ایک الجھی ہوئی شخصیت بنا دیا تھا۔ اگر اسے گھر سے توجہ اور محبت ملتی، جو کہ اس کا حق تھا تو وہ ایک مثبت فرد کے طور پر پروان چڑھتا۔ اس پیار اور محبت کو وہ عمر بھر ترستا رہا اور خود کو دوسروں کی نظروں میں ممتاز کرنے کے لیے اس نے منفی سرگرمیاں اپنا لیں۔

”کاش میرے والدین اسی روز ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے جب انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ مختلف عادات و خصائل کے حامل ہیں اور ان کا ساتھ چلنا ممکن نہیں۔“ اسے کیا معلوم کہ ایسے مقامات بارہا آئے تھے اور دونوں کی علیحدگی کے فیصلے میں حائل ہونے والی رکاوٹ اسی کا وجود تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس کی وجہ سے تو وہ دونوں اب تک ساتھ نبھاتے چلے آ رہے تھے مگر دونوں کو ہی یہ احساس نہیں تھا کہ اسی کو سب سے زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ اس کی تربیت کون کرتا، اسے اخلاقیات کون سکھاتا، اسے اچھے اور برے میں تمیز کون سکھاتا۔

وہ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ گنواروں کی طرح لڑتے، گالی گلوچ ہوتی، کردار کشی، الزام تراشی اور پھر کتنے ہی دن کی قطع تعلقی...... کسی نے اس کی ذہنی پرورش کا نہیں سوچا تھا، مذہبی تعلیمات سے وہ کوسوں دور تھا، اس لیے کہ کسی نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہی نہ تھا۔ وہ دونوں دریا کے دو کناروں کی طرح بہ حالت مجبوری ساتھ ساتھ تو چل رہے تھے مگر اس طرح کہ انہیں ایک دوسرے کی خبر بھی نہ ہوتی اور اس سارے سلسلے میں سہیل کا وجود گھر میں پس رہا تھا تو اس نے گھر سے باہر اپنی مصروفیات ڈھونڈ لیں۔

کالج سے نکل کر وہ لڑکیوں کے کالجوں کے باہر اپنی سائیکل لے کر کھڑا ہو جاتا، آتی جاتی لڑکیوں پر آوازیں کستا، کسی کو چھیڑ دیتا...... کوئی نظر انداز کر کے نکل جاتی، کوئی مسکرا کر چل دیتی اور کوئی جوتا اتارنے کی دھمکی دیتی تو یہ بھاگ نکلتا۔ مگر انہی اداروں میں ایسی لڑکیاں بھی پڑھنے کی غرض سے آتی تھیں جو اسی کی طرح اپنے حالات کی ستائی ہوئی ہوتیں یا پھر وہ لڑکوں سے دوستی کو مشغلے کے طور پر اپنا لیتیں۔ لڑکپن سے ہی وہ اس طرح کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا اور اگر اس کے والدین اسے غور سے دیکھتے تو اس کے پہننے اوڑھنے اور اس کی بات چیت سے انہیں اس کے چال چلن کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو جاتا۔

باپ کو یہ بتانا کہ وہ فیل ہو گیا ہے اتنا آسان نہ تھا، وہ اس کی کالج کی فیس ہر بار ادا کرتے وقت اس پر احسان جتانا نہ بھولتے۔ اسے ڈانٹتے وقت اس کے ساتھ اس کی ماں کو رگیدتا ایک ایسا فرض تھا جسے وہ باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ ایک ایک پائی اسے ترلے منتوں کے بعد دیتے۔ اپنی ذات پر سیکڑوں روپے بھی خرچ کر دیتے مگر بیوی اور بیٹے کے لیے ان کے دل میں گنجائش نہ تھی۔

سہیل کی امی بھی ملازمت پیشہ تھیں اس لیے سہیل اپنے مالی مطالبات انہی سے منواتا تھا۔ وہ سہیل کے معاملے میں بہت شفیق تھیں، وہی زبان جو اپنے شوہر کے لیے انگارے اگلتی تھی اسی زبان سے سہیل کے لیے محبت بھرے کلمات بھی ادا ہوتے تھے۔ سہیل ماں کی شفقت اور محبت کا بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کی اتنی اچھی ماں...... اچھی بیوی کیوں نہ تھی۔ شاید اس کے باپ میں کوئی ایسی کمزوری تھی جو کہ اس کی ماں کو پسند نہ تھی۔ ان کا کنجوس ہونا تو سہیل کو بھی کھٹکتا تھا مگر اس کے علاوہ ان میں کیا کمزوریاں تھیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماں کی آنکھ کا تارہ تھا مگر پھر بھی ان سے یہ سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کر پاتا تھا۔ اگر پوچھ بھی لیتا تو وہ کیا بتاتیں! مردوں کی بعض عادات عورتوں کے لیے ناپسندیدہ ہوتی ہیں، اس حد تک کہ ان کا دل ہی ان کے ساتھ رہنے کو نہیں چاہتا مگر کوئی نہ کوئی مجبوری انہیں اس تعلق کو گھسیٹتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اپنی بیوی کے سوا جس مرد کو دنیا کی ہر عورت اچھی لگتی ہو اور وہ ہر بات میں اپنی بیوی کا مقابلہ دوسری عورتوں سے کرے خواہ وہ سڑک کے کنارے کھڑی کوئی عورت ہو یا ناچنے گانے والی...... جس مرد کی نظر سے کوئی محفوظ نہ ہو اور دسترس میں بھی کوئی مظلوم آجائے۔

کس طرح بھول سکتی تھیں وہ۔ کیسے فراموش کر دیتیں وہ سب، جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ تو انہیں اپنا کر کبھی تھیں کہ انہوں نے دو جہاں پالیے تھے مگر انہیں کیا علم تھا کہ اسلم کے دل میں ہوس کے پنجے کس گہرائی تک گڑے تھے۔

☆☆☆

گاؤں کی عورتوں کے بیچ میں ایک پیڑھے سے موڑھے پر وہ سر نیوڑائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ اپنی انگلیوں پر لٹکتی ہوئی تسبیح رولے جا رہی تھیں۔ عورتیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں، جس کی اپنی سگی ساس اس کی موت پر نہ رو رہی ہو...... جس کا شوہر مردان خانے میں بالکل اس طرح بیٹھا ہو جیسے وہ کسی اور کی موت کا گھر ہو...... جس کے مرنے پر اس کی ماں بین کر رہی ہو، بہنیں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہوں، اس کی بیٹیاں بلک بلک کر ماں کی لاش سے لپٹ لپٹ جا رہی ہوں۔

کس قدر خاموشی سے، کتنی تمکنت کے ساتھ عابدہ بیگم اس کی موت پر دل ہی دل میں نوحہ کناں تھیں کہ آنکھوں سے آنسو تسبیح کے موتیوں کے مانند لڑھکتے ہی آ رہے تھے۔ وہ کسی کو کیا کہتیں، کسی سے کیا شکوہ کرتیں، اس کی حالت دیکھ کر تو وہ کل ہی کتنی پریشان ہوئی تھیں۔ انہیں اس کے چہرے پر موت کی سی زردی نظر آئی تھی، مگر وہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ اگر نور علی اجازت دے تو وہ اس کو شہر لے جائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ ان کو اجازت کس طرح دے گا، جس کے پاس خود گاڑی تھی اور اپنی تکلیف اور ضرورت کے وقت وہ فوراً شہر کو چل پڑتے تھے۔

''شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ...... سب بیٹھے اس کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ انسانوں اور گدھوں میں کوئی تو فرق ہونا چاہیے...... '' انہوں نے سوچا۔ تھوڑی دیر اور بیٹھیں، جب تک کہ میت کو گھر سے اٹھانہ لیا گیا۔ گھر سے میت کا نکلنا تھا، مرد تو جنازے کے لیے روانہ ہو گئے اور کھانوں کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ انہوں نے اٹھ کر فاخرہ کی ماں کو گلے لگا کر تسلی دی، اپنی دیورانی کی طرف گئیں تو اس نے انہیں جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

''ایسے رونی کے وقت پر کیسے کوئی اٹھ کر جا سکتا ہے۔'' اس نے بلند آواز سے کہا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ تکلف صرف اپنی سبکی نہ ہونے کی وجہ سے تھا، کوئی یہ نہ کہے کہ چوہدری نور علی کی بہو کے مرنے پر کوئی کھانا کھائے بغیر چلا گیا۔

''کوئی خوشی کا موقع ہے نہ میں کہیں دور سے آئی ہوں شکیلہ۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔ ''فاخرہ کے میکے والے دوسرے گاؤں سے آئے ہیں، ان کے لیے کھانے کا انتظام وغیرہ تو مناسب لگتا ہے، ہمارے لیے نہیں۔''



''ہمارے ہاں کا کھانا تم نے اپنے اوپر یونہی حرام کر رکھا ہے عابدہ آپا۔'' اس نے جتلایا۔ ''آپ تو اکبر علی کی شادی کا کھانا بھی کھائے بغیر چلی گئی تھیں۔''

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے شکیلہ۔ اور تمہیں علم ہے کہ اس موقع پر ہم آ بھی گئے تھے مگر تم لوگوں کا رویہ نامناسب تھا اسی لیے۔'' انہوں نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا، جتنی بھی وضاحتیں دیتے جاؤ، بات کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے شکیلہ سے مصافحہ کیا کیونکہ ان کے پاس جانے پر بھی وہ اپنی نشست سے ابھی تک نہ اٹھی تھی، حالانکہ وہ عمر اور مرتبے دونوں میں اس سے بڑی تھیں۔ مگر انہیں اس بات کی توقع بھی نہ تھی، اس نے عمر بھر کسی کا احترام کیا تھا، نہ کسی سے کروایا تھا۔

☆☆☆

کبھی کبھار تو اس کا دل چاہتا کہ وہ مر ہی جائے۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ نکاح کے لیے اس کے سامنے پکارا گیا تو اسے علم ہوا کہ جس کو سارا عالم گھوٹو کے نام سے جانتا تھا، اسے اس کے ماں باپ نے بھی کسی نام سے پکارا تھا، جہانداد......

زندگی اسے عذاب کی طرح لگنے لگی تھی، کاش وہ اس سے کسی طرح چھٹکارا پا سکتی، کاش اس نے کا جل کی طرح کا کوئی فیصلہ کر لیا ہوتا تو یوں گھٹ گھٹ کر نہ جی رہی ہوتی۔ کوئی ذریعہ آمدن کا نہ تھا، وہاں ہندوؤں کے گھروں میں ان کے مال مویشی کو سنبھال لیتا تھا تو اس کے بدلے اسے روٹی مل جاتی تھی مگر ان کے جانے کے بعد اب وہ کلثوم کے در پر ہی آ پڑا تھا، کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ اس کا بس چلتا تو اسے ہر روز لوگوں کے گھر بھیک مانگنے کو بھیج دیتا، اس کی تو نشے کی لت نہ پوری ہوتی جس کی وجہ سے وہ کلثوم کو جب جی چاہتا تنگ کر کے رکھ دیتا۔

جسے اماں یوں گھر میں چھپا چھپا کر رکھتیں کہ کسی کی میلی نظر اس پر نہ پڑے اور جس کا لالہ اتنا سخت مزاج تھا اس کے معاملے میں کہ اس کے ڈر سے وہ کبھی اکیلی کنویں سے پانی تک نہ لینے جاتی تھی، جسے زمانے کی اونچ نیچ کا علم ہی نہیں ہوا تھا کہ کھانے اور اوڑھنے پہننے کا کوئی تعلق کام کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ اسے اپنے گھر کی پناہ گاہ میسر تھی، ماں کی تربیت اور ماں اور بھائی کا پیار۔ اس کی ماں کی پورا گاؤں عزت کرتا تھا اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس پر بری نظر ڈالے یا اسے کچھ کہے۔

ماں کی یاد اور بھائی کے عطا کردہ دکھ نے اسے اذیت میں مبتلا کر دیا، وہ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر روتی رہتی، سسکتی رہتی۔ اسے جہانداد نے ہی کہا کہ وہ چوہدری نور علی کے گھر کام کاج کے لیے جایا کرے تاکہ گھر کی دال روٹی چلے، وہ کر بھی یہی سکتا تھا کہ اسے کوئی کام ڈھونڈ دے، اس میں عقل اتنی کہاں تھی کہ وہ خود کوئی کام کرے۔ وہ اس کی ہدایت پر خاموشی سے عمل کرنے لگی، فریاد کا اسے حق تھا نہ شعور......

دن رات اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تو شکیلہ بی بی کو ہی شک پڑا اور انہوں نے اس کو معراج بی بی کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہ دو جے جی سے تھی۔ ان کے منہ سے یہ بات سن کر اس کی کوفت میں کتنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خود تو مصیبت میں تھی ہی، کہاں چاہتی تھی کہ وہ اس شخص کی اولاد پیدا کرے جس کے ہاتھ سے ہی اسے گھن آتی تھی مگر اس کی شادی کا منطقی نتیجہ تو یہ تھا ہی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی یہ سن کر؟'' ایک دوسری ملازمہ نے اس سے پوچھا تھا۔

''میں خود کون سا بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں جو کوئی اور آ جائے گا اس گھر میں اپنے حصے کے عذاب بھگتنے۔'' اس نے بیزاری سے کہا تھا۔

''یوں نہ کہو..... آنے والا تو اپنا مقدر خود لے کر آتا ہے، کیا پتا اس کے وسیلے سے تمہارے مقدر میں کوئی بہتری لکھی ہو۔'' اس نے اسے سمجھایا۔

''ہونہہ! بہتری..... میں نے تو اپنے نصیب میں اب کوئی بہتری آنے کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا تھا۔

''گھوماں۔'' اس ایک لفظ سے اسے شدید نفرت تھی مگر جس دن سے شادی کے بعد گھوٹو نے اسے اس نام سے پکارا تھا، اس کے بعد جیسے یہی اس کی پہچان بن گیا تھا، کلثوم کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی اور وہ..... جس کا نام بھی کسی کو معلوم نہ تھا، اسے کلثوم نے ہی تکریم دی کہ اسے جہانداد کے نام سے بلانا شروع کیا تو لوگوں کو بھی اس کے نام کا علم ہوا۔ کوئی گھوٹو کے بارے میں بات کرتا تو کلثوم یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو..... اس کے پیچھے کارفرما مقصد یہی تھا کہ کوئی اسے گھوٹو کی بیوی نہ کہے۔

''میں جاؤں گی شام کو معراج خالہ کی طرف۔'' اس نے اتنا کہہ کر اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

کسی کو دکھ پہنچا کر کب کسی نے سکون پایا ہے۔ ایسا ہی ہے کہ انسان ببول بو کر یہ توقع کرے کہ اس پر گلاب اگنا شروع ہو جائیں۔ اسے ساتھ لے کر بھاگ بھاگ کر بھی عباس کو سکون نہیں مل رہا تھا، پکڑے جانے کا خوف اس قدر تھا کہ ہر روز وہ ٹھکانے بدلتا، ایک سے دوسرے شہر جا جا کر بھی اسے سکون مل رہا تھا نہ کام۔ سب سے پہلے تو اس نے دیا کو برقع لے کر دیا تھا، کچھ زیورات وہ گھر سے لے کر آئی تھی، جو کہ پروگرام کے مطابق اس روز وہ صبح ہی ساتھ لے کر گئی تھی۔ ان زیورات کو انہوں نے کسی مشکل وقت کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔

دیا نے شہر کی مسجد میں جا کر قبول اسلام کیا اور اس کا اسلامی نام زہرہ رکھا گیا۔ اس کے بعد عباس نے اس کے ساتھ نکاح کیا تا کہ اگر کہیں پکڑے گئے تو کم از کم ان کا تعلق اتنا مضبوط ہو کہ کوئی ان پر قانونی کارروائی نہ کر سکے۔

ہر شہر میں چار دن گزارتے ہی خوف کا عفریت انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتا اور وہ پھر نئے شہر کو چل پڑتے۔ وقت اتنا گزر چکا تھا کہ اب ان کا خوف کم ہوتا جا رہا تھا، البتہ گاؤں واپس جا کر معافی مانگنے کے ارادے پر ابھی عمل درآمد کا وقت نہ تھا، وہ اسے بتاتا کہ بی بی جی اسے معاف کر دیں گی کیونکہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور کلثوم تو اس بات پر بہت خوش ہوگی کہ دیا اب زہرہ ہے اور اس کی بھابی ہے، اس بات سے بے خبر کہ اس کے جنون نے اس کے پیاروں کے ساتھ کیا کیا تھا، ماں زندگی کی قید سے نجات پا گئی تھی اور بہن زندگی کی ایک ایسی قید کا شکار ہو گئی تھی کہ جس سے رہائی کی صورت کا اسے اور کوئی چارا نظر نہ آتا تھا۔

سال بھر تک بھاگتے رہنے کے بعد بالآخر انہوں نے شہر میں اپنا ٹھکانا کر لیا تھا، چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ زہرہ پردے کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی، اکٹھے بھی وہ بہت کم باہر نکلتے ماسوائے



مجبوری کے..... وہ گھر پر ہی رہتی تھی۔ شاید عمر بھر کے لیے یہ احتیاط کرنا تھی۔

عاشق اور معشوق میں تو آنکھوں پر ایسی پٹی بندھ جاتی ہے کہ کسی کی کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر پول تب کھلتے ہیں جب انسان زندگی اکٹھے گزارنا شروع کرتے ہیں، زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے سے تمام تر تلخیاں عاشق اور معشوق کو بھلا دیتی ہیں اور عاشقوں کی خوبیاں بھی خامیوں کی صورت نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ سپنوں کے محل دھڑام سے گر جاتے ہیں، عباس اور دیا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، زندگی کے تلخ حقائق نے جلد ہی ان دونوں پر واضح کر دیا تھا کہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

☆☆☆

آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا، اماں گھر پر نہ تھیں، وہ اکیلی تھی۔ جب سے اوپر تلے گاؤں میں عجیب و غریب واقعات ہوئے تھے اماں نے اسے پڑوس میں بھیجنا چھوڑ دیا تھا۔ اس روز اسے ساتھ والے گاؤں جانا تھا اس لیے اس نے زرتاج سے کہا تھا کہ گھر کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند رکھے اور کسی کے آنے پر بھی نہ کھولے، جب تک وہ واپس نہ آئے۔ وہ اپنی چادر پر کڑھائی کا کام لے کر بیٹھ گئی، ہانڈی بنا چکی تھی اس لیے فراغت میں وہ اس طرح کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف کر لیتی تھی۔

اسے لگا جیسے چھت پر کوئی کودا ہو، اس نے کام روکا اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔ شاید کوئی بچہ وغیرہ پتنگ کے پیچھے کودا ہو، اس نے سوچا مگر اسی طرح چپکی بیٹھی رہی، چند ساعتیں گزریں تو ایک اور شخص کے کودنے کی آواز آئی، آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کودنے والے بچے نہیں تھے۔ کہیں شاکر ہی نہ شہر سے لوٹا ہو۔ اس نے سوچا مگر اسے یوں چھت سے کود کر آنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ ایک نہیں دو لوگ ہیں۔ شاکر کو گئے ہوئے جانے کتنا عرصہ ہو گیا تھا اور جانے وہ لوٹ کر کیوں نہیں آیا تھا۔

گاؤں میں لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں مگر کسی کو اس پر کسی غلط کام کا شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ تھا ہی ایسا نیک فطرت۔ لوگ باگ یہی کہتے تھے کہ جانے اسے کسی نے لوٹ کر مار دیا ہو گا یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو گا۔ اس طرح کی بات سن کر اس کے دل کی کتنی ہی دھڑکنیں منتشر ہو جاتیں، اماں بھی اسے یہی کہتی کہ اگر وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہوتا تو کسی نہ کسی طرح اپنے بارے میں کوئی اطلاع تو بھجواتا۔ اس نے شاکر سے محبت کی تھی، اسے مستقبل میں اپنے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھا تھا، وہ بھی اسے چاہتا تھا اور چپکے چپکے نظروں سے اسے محبت کے پیغامات دیتا تھا۔

چھت پر چلتے قدموں کی آواز نے اسے حال میں لا کھڑا کیا۔

وہ قدم سیڑھیوں سے اتر رہے تھے، اس نے پیش بندی کے طور پر کمرے کے دروازے کی کنڈی ابھی لگا دی تھی اور وہ خود اس کمرے میں محصور ہو گئی تھی، فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ کتنا بڑا گھر تھا کہ انہیں اندازہ نہ ہوتا کہ وہ کہاں تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، وہ چپکی بیٹھی رہی، دستک کی آواز مدھم تھی شاید آواز بلند ہوتی تو ہمسائے متوجہ ہو جاتے۔ اس نے سانس روک لی۔

''بجائے خود کو اندر محصور کرنے کے میں اس وقت باہر نکل جاتی جب وہ لوگ چھت پر کودے تھے تو شاید شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کر لیتی۔'' اس نے سوچا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب تو جس طرح اس نے خود کو مجبور کرلیا تھا سوائے انتظار اور دعا کے کوئی چارا نہ تھا۔ وہ دروازے سے کمر لگائے کھڑی تھی۔ ''کاش اماں آ جائیں یا کوئی اور!'' اس نے ہاتھ بلند کر کے دعا کی پھر وہ درود شریف پڑھنے لگی، اماں کہتی تھیں کہ درود شریف پڑھ کر کی جانے والی دعا رد نہیں ہوتی، اس نے زیرِ لب ورد کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

''بگے! دروازے کو ہلکا سا زور لگا کر اندازہ کرو کہ کتنا مضبوط ہے۔'' باہر سے آنے والی آواز سن کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''فیضی استاد کنڈی لگی ہوئی ہے، وہ اندر ہی ہے، اس نے خود کو اندر بند کرلیا ہے۔'' بگے نے کہا تھا۔

''کیا کرنا ہے پھر، دروازہ توڑنا ہے یا پھر اسے کہیں کہ دروازہ کھولے؟''

''تم جس طرح کہو استاد، میں تو تیار ہوں اپنا کام کرنے کو۔''

''بگے تمہیں یاد ہے نا حکم کیا ہے..... اسے تکلیف نہ ہو اور نہ ہی زیادہ شور مچے۔'' فیضی نے کہا تھا۔

زرتاج نے آہستگی سے رخ بدلا اور کوشش کرنے لگی کہ ان کو دیکھے، اسے صرف ذرا سی درز ملی اور اس میں سے اسے ایک شخص کی کالی پگڑی نظر آئی اور اس میں سے کہیں کہیں باہر نکلتے ہوئے گھنگرالے بال۔

''دروازہ کھولیں بی بی۔'' اسی نے دروازے کے قریب آ کر کہا تھا، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ باہر سے وہ بھی دروازے کی کسی درز سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ ڈر گئی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے اندر اندھیرا ہونے کے باعث کچھ نظر نہیں آئے گا، دروازہ بھی بند تھا اور بادل بھی تھے۔

''کون ہو تم؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''جو بھی ہیں، عزت سے آپ کو لے جانے کے لیے آئے ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

''کسی کے گھر کی چھت پھلانگ کر کسی کو لے کر جانا کیا عزت کے زمرے میں آتا ہے؟'' اس نے غصے سے کہا۔ ''تمہیں بھیجا کس نے ہے؟''

''یہ بتانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے بی بی۔'' بات تو وہ عزت کے ساتھ ہی کر رہا تھا۔

''جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں بھیجا کس نے ہے، میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔'' اس نے مصمم لہجے میں کہا۔

''بی بی آپ ضد کر کے ہمیں زبردستی پر مجبور نہ کریں۔'' اس نے کہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ انہیں زبردستی کرنے کی اجازت نہیں تھی... پھر وہ کس طرح لے کر جاتے اسے؟ اس نے سوچا اور کوئی جواب نہ پایا۔

''اللہ میرے مولا! تو ہی مدد فرما۔'' اور اللہ نے اس کا یقین قائم رکھا اور بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔

''یہ کون آ گیا استاد؟'' بگے کی آواز آئی۔ ''اس کی ماں تو ہو نہیں سکتی، اس کے آنے کی تو شام تک کوئی امید نہیں۔'' انہوں نے ساری خبر رکھی تھی۔ دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا تھا، زرتاج دعا کر رہی تھی کہ آنے والا مایوس ہو کر نہ لوٹ جائے، یقیناً کوئی ضرورت مند تھا۔

''اللہ کرے کوئی اتنا مجبور ہو کہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہی رہے۔'' اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مداخلت ان کے منصوبے کا حصہ نہ تھی۔ ''زرتاج! گھر پر ہی ہو نا تم بیٹا؟ کوئی تمہارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔'' پڑوسن کی



بلند آواز نے اس کا حوصلہ اور بھی بڑھا دیا مگر وہ دروازہ نہیں کھول رہی تھی کہ آنے والوں کے پاس کوئی بے ہوشی کی دوا ہوئی تو اسے سونگھا دیں گے۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا تو ہمسائی کی طرف سے چارپائی گھسیٹنے کی آواز نے انہیں سٹپٹا دیا اور وہ بھاگے۔ اس طرح وہ تیزی سے غائب ہوئے کہ جب تک ہمسائی کے چارپائی پر چڑھ کر دیوار سے اسے پکارنے کی آواز آئی اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی، تب تک وہ غائب ہو چکے تھے۔

''کیا ہو گیا زرتاج، کیا کر رہی تھیں تم؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''آپ سیدھے راستے سے یہاں آ گئیں خالہ جلدی۔'' اس نے کہا اور جا کر بیرونی دروازہ کھولا، آنے والی کا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ ''کلثوم! کیسی ہو تم، کتنے عرصے کے بعد دیکھ رہی ہوں تمہیں، خوش تو ہو نا تم؟''

''خوش؟'' اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''میری گڑیا میری جان۔'' وہ اسے گدگدا رہی تھی، اسکول سے آنے کے بعد وہ اس کی کل وقتی مصروفیت تھی۔ اسے نہلانا، اسے کھلانا پلانا اس کی دوا دارو کا خیال رکھنا، وہ یہ سب اسی طرح کرتی تھی جیسے اس نے اسے جنم دیا ہو۔ اس کی صحت بھی اب بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی، شروع میں تو وہ کئی بار تائی اور مائی کہہ کر روتی تو مریم کی یہی سمجھ آتا تھا کہ وہ اپنی ماں اور تائی کو یاد کرتی ہے مگر جب جینا نے سوال کیا تو اسے فوراً جواب سوجھ گیا تھا کہ یہ سائرہ باجی کی بیٹیوں کے پیار کے نام تھے اور اتنے عام تھے کہ اسے تو ان کے اصل ناموں کا علم بھی نہ تھا۔

اس کی ترستی ہوئی مامتا کو قرار آ گیا تھا اور وہ اتنی مصروف ہو گئی تھی اس کے ساتھ کہ اسے کوئی گلہ شکوہ کسی سے نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھار سوچ آتی کہ دوبارہ اس جگہ پر جائے اور دیکھے کہ کہیں اس کے والدین اسے تلاش نہ کر رہے ہوں، کسی کے جگر کے ٹکڑے سے وہ اپنی مامتا کو ایسے تو نہیں سیراب کر رہی کہ کوئی ماں تڑپ رہی ہو۔ مگر اب اتنا عرصہ اس کے ساتھ گزار کر وہ اس کی عادی سی ہو چلی تھی، اب اس میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ اسے کھو دیتی۔

جینا صبح سے لے کر اس کے اسکول سے واپس آنے تک اس بچی کے ساتھ ہی رہتی اور یہ وہ وقت ہوتا تھا جب جینا اپنی پیاس بجھاتی، اس کا خیال کرتی، اسے پیار کرتی۔ گڑیا اسے ماسی کہہ کر پکارتی تو وہ اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتی۔ بن دیکھے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سائرہ باجی کتنی مشفق ہوں گی کہ جن کی بیٹی اتنی پیار کرنے والی ہے، اتنی سی عمر میں بھی جینا اسے کوئی چیز دیتی تو وہ اس سے لپٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی۔

مریم کا تو اس کی محبت میں یہ حال تھا کہ وہ ذرا سا کھانستی بھی تو وہ متفکر ہو جاتی، گھر میں اس نے ہر قسم کی دوائیں کر رکھ چھوڑی تھی کہ کبھی وقت بے وقت اس کی طبیعت خراب ہو تو اسے دوا لینے کے لیے باہر نہ جانا پڑے۔ اس کے لیے طرح طرح کے کھلونے، جھجھنے وغیرہ لاتی اور خوب صورت پھولوں والے پرنٹ کے کپڑے خرید کر اس کے لیے فراکیں سلواتی اور اسے پہنے دیکھ کر نہال ہوتی۔

گڑیا بھی شروع شروع میں رونا شروع کرتی تو روتی ہی چلی جاتی، بتا تو نہیں سکتی تھی مگر انجان چہروں کو دیکھ کر منہ بسورتی..... مریم تو چٹا چٹ اس کی بلائیں لیتی، وہ سمجھتی تھی کہ کم عمر سہی مگر بچی اپنے قریبی رشتوں کو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہچانتی ہوگی اسی لیے وہ اسے اور جینا کو دیکھ کر کبھی کبھار رو پڑتی تھی مگر بچہ تو اسی سے واقف ہو جاتا ہے جس سے اسے پیار ملے۔ چند ماہ کا عرصہ لگا اور جینا کا بار بار کا کہتے رہنا تھا کہ اس نے ایک روز مریم کے گھر داخل ہوتے ہی اس کی طرف بازو وا کیے، مریم نے اسے فوراً اٹھا کر اسے پیار کیا۔ ''امو۔'' اس کا کہنا تھا کہ مریم اس پر فدا ہو گئی، اسی وقت اس کے سر کے اوپر سے ایک روپیہ وار کر جینا کو دیا کہ وہ جاتے ہوئے مسجد کے چندے والے ڈبے میں ڈال جائے۔

''امو۔'' اس نے پھر کہا۔

''میری گڑیا۔'' مریم نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''مینی گویا۔'' اس نے مریم کی نقل اتاری تو وہ اور جینا بے اختیار ہنس دیں۔

☆☆☆

موجی کی بے چین مامتا کو زرتاج کو مل کر چین آ گیا تھا مگر یہ ملاقات اسے یوں لگا کہ چٹکیوں میں ختم ہو گئی تھی۔ چار دن کے بعد قائم علی اسے لینے آ گیا تھا، اس سے ملا بھی نہیں اور بیٹی کو لے کر چلا گیا۔ موجی اس کے جانے کے بعد دھاڑیں مار مار کر روئی۔ ''کیوں کر رہا ہے وہ ایسے، کیوں مجھے اتنی لمبی سزا دے رہا ہے اماں؟'' اس کی ماں اس سے بڑھ کر پریشان تھی، بیٹی کا غم دیکھا نہ جاتا تھا۔ بیٹے اور بہوئیں اچھی تھیں مگر وہ کتنا عرصہ بیٹی کو گھر بٹھا سکتی تھیں، ان کی بیٹی کی جوانی اور حسن ماند پڑتا جا رہا تھا۔

ماتا کہ قائم علی کی ناراضی بجا تھی مگر یہ سب کچھ ہونا مقدر میں تھا، موجی کی غفلت ضرور تھی مگر کیا اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے نہیں کھوئے تھے، اس نے کچھ کو کھویا تھا اور جو بچ گئے تھے انہیں ملنے سے قاصر تھی۔ انہوں نے موجی کو زبردستی نماز کی طرف لگایا، اسے کوئی نماز چھوڑنے نہ دیتیں، اس کے بعد اسے محلے میں ایک بزرگ خاتون کے پاس بھیجنا شروع کیا تھا جو بچیوں کو دین کی تعلیم دیتی تھیں۔ وہ اگرچہ بچی نہ تھی مگر ان کا خیال تھا کہ موجی کو سکون ملے گا، دین کی باتیں سنے گی تو دھیان اپنی پریشانیوں کی طرف سے ہٹے گا۔

پہلے پہل تو موجی نے اسے صرف یہ سوچ کر سننا شروع کیا کہ ماں کا اصرار تھا، جو کچھ وہ سن رہی ہوتی تھی اس پر عمل کرنے کا اس کا ارادہ نہیں ہوتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھ میں آنے لگا کہ وہ کہ کہتی تھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ ہر مشکل کا حل اللہ سے لو لگانے میں ہے اور درود شریف پڑھ کر مانگی گئی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس نے قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور نماز کی پابندی کی، ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی اور اللہ سے لو لگا لی۔

آزمائش کا دور طویل تو تھا اور صبر آزما بھی مگر جن اندھیروں میں نام خدا اجالا کرتا ہے ان کی تاریکی خوفزدہ نہیں کرتی۔ اس نے اس آزمائش کو اپنے مقدر کا حصہ جان کر اس پر صبر کیا، علیم اور وسیم کے بعد دیگرے دبئی اور لندن چلے گئے اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کی بیویاں علیحدہ گھروں میں منتقل ہو گئیں کہ یہ گھر اب انہیں چھوٹا پڑنے لگا تھا، ظاہر ہے سب کے بچے تھے۔ اس گھر میں مزید اضافہ کرنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ ابا کے انتقال کے بعد نعیم نے ہی گھر اور بھائیوں کو سنبھالا اور نبھایا تھا۔

اس کی بیوی اس کی اور ان کی ماں کی بہت تابعدار تھی، موجی سے بھی اس کا پیار تھا اور اب جب موجی اس



پریشانی میں وہاں رہ رہی تھی تو وہ اس کا اور بھی خیال رکھتی تھی اس کی سب سے بڑی حسرت کہ زرتاج پڑھ جائے، اسے پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی، وہ اس کے پاس ہوتی تو کسی بھی طرح اسے اسکول بھجوایا کرتی مگر اب جب زرتاج آتی تو پوچھنے پر علم ہوتا کہ قائم علی اسے اسکول بھی نہیں بھیجتا تھا۔ جتنے دن بھی زرتاج اس کے پاس رہتی وہ باقاعدگی سے اسے پڑھاتی اور جاتے وقت اسے کتابیں اور نئے اسباق دے کر بھیجتی۔ زرتاج کو بھی شوق تھا، تین سال میں اس نے اسے پانچویں جماعت کا امتحان دلوایا تھا، اس وقت وہ چودہ برس کی ہونے والی تھی۔

اس بار قائم علی، زرتاج کو لینے آیا تو اس نے معراج سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نعیم نے اسے بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ایک دن بھی اس نے اس کو سوچے بنا نہیں گزارا تھا، اسے دیکھنے کے لیے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو جاتی تھی جب وہ زرتاج کو لینے کے لیے آتا تھا۔ اب تین سال کے بعد اس نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، وہ کشمکش میں تھی تاہم اس نے اسے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مجھے تم سے امی جان کی وفات کا افسوس بھی کرنا تھا اور کچھ پوچھنا بھی تھا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا، موجی کی سوالیہ نظریں اٹھیں، وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی نظر جھک گئی۔

''کیا تمہیں مجھ سے طلاق چاہیے؟'' وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے کوئی شوہر بیوی سے یہ پوچھے کہ کیا تمہیں خرچ کے لیے کچھ رقم چاہیے۔

☆☆☆

''الماس! میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے طور طریقے چند دنوں سے ٹھیک نہیں ہیں، کام پر تمہارا دھیان ہے، نہ تم باقاعدگی سے ریاض کر رہی ہو۔'' جہاں آرا نے اسے ٹوکا۔ ''طوائف کا کام اپنے وجود سے تھکے ماندوں اور دکھ کے ماروں کو سکون دینا ہے نہ کہ ان کا دکھ خود سمیٹ کر بے سکون ہونا۔ ہمارے پاس یہ لوگ چند گھڑیوں کے سکون کے لیے آتے ہیں اور ہمیں اس وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ یہاں آنے والا کوئی گاہک مستقل نہیں ہوتا، اس لیے کسی سے ربط اور وابستگی بھی مستقل نہیں ہو سکتی۔ اپنے کام پر دھیان دو، باقی لڑکیاں بھی تمہیں دیکھ کر اپنے کام پر دھیان نہیں دیتیں۔''

''پر وہ اس طرح کا گاہک نہیں ہے اماں...'' اس نے بے بسی سے کہا تھا۔ ''وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے!''

''الماس۔'' وہ گرجیں۔ ''اس کے بعد یہ نہ ہو کہ میں اس کا یہاں آنا بند کر دوں۔ خود بھی اپنی اوقات میں رہنا سیکھو اور اسے بھی اس کی جگہ پر رکھو۔''

''اب اگر اس کی جگہ ہی میرے دل میں بن گئی ہے اماں تو میں کیا کروں؟'' اس نے ماں کے سامنے دل ہوا۔ ''میں اسے چاہنے لگی ہوں اماں، اس کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا اماں، مجھے صرف وہ اچھا لگتا ہے، وہ میرے دل میں دھڑکتا ہے اماں۔'' جہاں آرا تو دھک سے رہ گئیں، انہیں علم تھا کہ کسی طوائف پر جب عشق کا بھوت سوار ہو جاتا ہے تو اسے کہیں کا نہیں چھوڑتا، اسے بے چین کر دیتا ہے اور اپنے پیشے سے متنفر۔ مگر وہ کس طرح برداشت کر سکتی تھیں کہ ان کے گوشے کا خاص ہیرا یوں لٹ جائے، بیٹی کو پیار سے سمجھانا پڑے گا، انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابھی تمہاری عمران باتوں کی نہیں، ابھی تم جوان ہو، تم میں ہمت ہے، ابھی سے گھر بسا کر بیٹھ جاؤ گی تو آگے کیا ہوگا۔ چند برس اور..... اسے اپنی مٹھی میں رکھو پھر جو کچھ تم چاہو گی اسے دیکھ لیں گے۔'' انہوں نے رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میرا تو من اچاٹ ہوگیا ہے اپنے کام سے اماں، وہ مجھے عزت دینا چاہتا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں ذلت بھرا یہ کام کرتی رہوں۔'' اس نے تنگ کر کہا تھا، جہاں آرا کو اپنی دنیا لٹتی نظر آ رہی تھی۔ جانتی تھیں کہ اسے کتنا ہی سمجھا لیں، وہ اگر اڑ گئی تو اسے باز رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ بحث کرنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا۔

''چلو اٹھو اور استاد صاحب آئے ہیں، ریاض کرو۔'' ان کے کہنے پر اس نے بیزاری سے منہ بنایا۔ اگر جہاں آرا نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کرنے کا سوچا تھا تو کچھ ایسی ہی سوچ الماس کو بھی آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ماں کو کس طرح منایا جا سکتا ہے..... اس کے لیے کچھ ٹھوس حقائق سامنے آنے تک ماں کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔

☆☆☆

''اس حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ناہید۔'' سلمٰی نے کہا۔

''جو بھی ہوتا ہو، نہیں واقع ہوتی تو میں خود عدالت سے طلاق لے لوں گی مگر واپس اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''میاں بیوی میں سو ناچاقیاں ہو جاتی ہیں، ہمارے درمیان بھی ہو جاتی ہیں..... تو کیا ہر بات پر طلاق کا مطالبہ کرنا شروع کر دیں؟'' سلمٰی نے اسے سمجھایا۔

''آپ بھی میری جگہ ہوتیں بھابی تو یقین کریں آپ بھی یہ سب کچھ نہ برداشت کر پاتیں..... میں نے بہت کوشش کی، میں اپنی ساس کی ہر اچھی بری بات کو خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی، یہ سوچ کر کہ وہ میری بزرگ ہیں، جیٹھ تو ہے ہی مٹی کا مادھو، اگر اسی میں دم ہوتا تو اس گھر میں حالات میرے لیے ناقابلِ برداشت نہ ہوتے۔''

''عورت ہی برداشت کرتی اور جھکتی آئی ہے، اب کچھ ہی دن میں تمہارے اپنے ہاں اولاد ہونے والی ہے اور اس کی خاطر ہی تمہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔'' سلمٰی نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''اپنی اولاد کو تو میں اس چکلے میں آنکھ بھی نہ کھولنے دوں۔'' اس نے پرے ہٹ کر کہا۔

''ناہید..... تمہارے شوہر کا گھر ہے، کچھ خیال کرو کہ تم کس انداز میں بات کر رہی ہو!''

''آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں بھابی..... وہ شوہر تو تھا میرا مگر اب اس نے مجھے طلاق دی دی ہے، اپنی اس کلموہی بھاوج کی وجہ سے..... جسے اپنے شوہر سے زیادہ انور سے پیار ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''اس میں اتنا ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے، بڑی بھاوج ماں کی طرح ہوتی ہے اور اسے اگر دیور سے پیار ہے تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔'' انہوں نے اسے پھر سمجھایا۔ ''تمہارے بھیا انور سے بات کرنے گئے ہیں اور اسے سمجھائیں گے، تم ابھی یہیں رہو، اب تو تمہیں ویسے بھی یہاں آنا ہی تھا، بچہ تو اپنے ننھیال میں ہی پیدا ہوگا نا۔''

''اور آپ سمجھتی ہیں کہ وہ سمجھ جائے گا، اس کی بھاوج اسے سعید بھائی کی بات پر کان دھرنے دے گی؟''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سب ٹھیک ہو جائے گا ناہید، تم اللہ سے اچھا گمان رکھو تو اچھا ہی ہوگا، انشاء اللہ۔''

''میرا اس سے علیحدہ ہو جانا ہی اچھا ہے بھابی۔'' اس نے کہا تو سلمٰی کو لگا کہ وہ پتھر کی دیوار سے سر پھوڑ رہی ہے۔

''ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے ناہید؟'' سلمٰی نے چڑ کر کہا۔

''کیا آپ مان سکتی ہیں کہ انور اور اس کی بھاوج کا آپس میں غلط نوعیت کا تعلق ہے۔'' اس نے لہجے میں رازداری پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''شرم کرو ناہید۔'' وہ بپھریں۔ ''تم یہ بھی بھول رہی ہو کہ کتنا بڑا بہتان لگا رہی ہو تم کسی پر..... ذرا سا جھگڑا کیا ہوا، تم ہر بات کو منفی انداز سے دیکھنے لگیں، تمہاری طبیعت ہمیشہ سے جلد بازی والی اور غصیلی رہی ہے مگر شادی کے بعد تو عورت میں متانت آ ہی جاتی ہے۔ ایسی بے بنیاد بات کو تم نے اپنی نظر سے ہی کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔'' سلمٰی نے اسے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ دیا۔

''میرا یقین کریں بھابی، میں جھوٹ نہیں بول رہی..... میں نے خود اپنی نظروں سے۔'' وہ رکی۔ ''اور میں نے اپنی ساس کو بتایا تو وہ..... وہ کہنے لگیں کہ وہ جانتی ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتیں کیونکہ بڑا بیٹا سیدھا سا ہے وہی کسی قابل نہیں تو وہ کیا کریں۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' سلمٰی نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ بے شک جا کر خود اس کی ماں سے پوچھ آئیں۔'' ناہید نے انہیں مزید یقین دلانے کو کہا۔

''لو بھلا میں جاؤں گی تو وہ مجھے بتائیں گی کہ ایسی کوئی بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ ان سے چاہے نہ پوچھیں، سارا محلہ اس بات کو جانتا ہے، آپ باہر کسی سے بھی پوچھ لیں۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔'' وہ بولیں۔ ''میں جا کر کسی سے کیوں تفتیش کرتی پھروں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا کیا غلط ملط خبریں پھیلاتے ہیں۔''

''میں غلط ملط بات نہیں کر رہی بھابی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''بس اب تم آرام کرو، میں شاکر کی بچی کو بھی دیکھ لوں۔'' وہ اٹھیں۔ ''اس کے لیے کسی دیکھ بھال والی کا بندوبست بھی کرنا ہے۔''

''کہاں گیا ہے شاکر؟'' اس نے پوچھا۔

''صبح تمہارے بھائی صاحب کے ساتھ ہی نکلا ہے، شاید اسے کوئی کام وام ڈھونڈ کر دیں گے۔ ویسے بھی انہیں تو انور کے پاس جانا تھا، شاکر کو اسی لیے ساتھ لے گئے ہوں گے کہ وہ گھر پر کیا کرے گا۔'' طبیعت نے بتایا۔

''چلو اب اٹھو تم سستی جھاڑو اور نہا لو۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھابی، شاید تھکاوٹ ہو گئی ہے، کمر میں بہت درد ہے..... ذرا ٹھہر کر نہا لوں گی!''

''تم بھی نا..... سستی کی پوٹ ہو، کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہو۔''

''نہیں بھابی، سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ کراہی۔ ''اور اس کے علاوہ۔'' اس کی بات مکمل ہوتے ہی سلمٰی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔

☆☆☆



''ہاں مجھے طلاق چاہیے۔'' موجی نے متانت سے کہا تھا، قائم علی کو یہ موجی اس موجی سے مختلف لگی تھی جسے وہ جانتا تھا، جسے اس نے بلبلاتے اور تڑپتے ہوئے اس کی ماں کے ہاں چھوڑا تھا۔ اس کی زندگی کو محرومیوں کا مجموعہ بنانے میں تقدیر کے ساتھ ساتھ قائم علی کا ہاتھ بھی تھا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے مختصر سوال کیا۔

''میں آزادی چاہتی ہوں اگر آپ کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق ہے تو یہی حق ہمارا مذہب مجھے بھی دیتا ہے، میں نے جو جرم کیا ہے اس کی کافی سزا پا لی ہے، اب مجھے پوری زندگی تو سزا کی صورت نہیں گزارنی ہے۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔ قائم نے تو ایسا ہونے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... بھلا موجی کیا کرے گی اس سے علیحدہ ہو کر..... وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ وہ اس کے نام پر بیٹھ کر زندگی گزار دے گی۔

''اور اگر میں انکار کر دوں تو؟'' اس نے سوال کیا۔

''تو میرے پاس متبادل راستہ ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''میں عدالت میں آپ سے خلع کے لیے درخواست دے سکتی ہوں۔'' موجی نے سر کو اسی طرح جھکا رکھا تھا جیسے وہ اپنے جرم کی سزا سننے کے انتظار میں ہو مگر اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ یہ اعتماد انہی آپا جی کا دیا ہوا تھا، جنہوں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح کی زندگی گزارنا اس کی پریشانیوں میں مزید اضافے کا باعث ہوگا، بہتر ہے کہ وہ ایسے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے جو اس کی بھول کو معاف کرنے کو تیار ہی نہیں۔

''مگر میں اس کے بغیر رہ سکتی ہوں، نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کا تصور کر سکتی ہوں۔'' اس نے ان کے سامنے اپنی قائم علی سے محبت کا اعتراف کیا تھا۔

''محبت تو ہمیں بہت سی چیزوں سے ہوتی ہے معراج۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔ ''مگر ہر چیز ہمارے نصیب میں نہیں ہوتی، کسی چیز کا ہماری زندگی سے چلے جانا مقدر میں ہو تو ہم اس کے بغیر مر نہیں جاتے۔ تم نے تو اپنی چار بیٹیاں کھوئی ہیں، تمہیں اللہ نے بہت خاص بنایا ہے کہ تم زندہ ہو ورنہ عام برداشت کی عورت اتنے صدمے سے مر جاتی یا گھبرا کر خودکشی کر لیتی۔''

''میں نے بھی بہت دفعہ خودکشی کا سوچا تھا مگر میں نے خود دیکھا ہے کہ انسان کے لیے اللہ کا بہترین تحفہ زندگی ہے، میں نے لوگوں کو ایک ایک سانس کے لیے ترستے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے مر جانے والوں کے لواحقین کو ماتم کرتے، سینہ کوبی کرتے، بین کرتے اور زندہ درگور ہوتے بھی دیکھا ہے اور پھر زرتاج سے مہینے میں ایک بار چند دن کے لیے ملنا میرے لیے اتنا خوشی کا وقت ہوتا ہے کہ باقی دن انتظار میں گزر جاتے ہیں۔'' وہ سسکی تھی۔

''دیکھو بیٹی۔'' انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ وہ طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی جانے لگا ہے، جانے وہاں اس کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے، وہ تمہارے جیسی نیک عورت کے قابل رہا بھی ہے کہ نہیں تم اس سے طلاق کا مطالبہ کرو..... وہ نہ آمادہ ہو تو اسے خلع کی دھمکی دو، اگر اس میں نیکی کی رمق ہے تو وہ تمہاری طرف لوٹ آئے گا، ورنہ تمہیں آزاد کر دے تو تم اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو۔'' ان کی بات موجی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ماں کی زندگی تک تو اسے اس گھر میں کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی مگر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب اسے لگنے لگا تھا کہ اس کا وجود اس گھر میں فالتو تھا۔

''ٹھیک ہے آپا جی، میں اس سے بات کرتی ہوں۔'' اور وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا سامنا کس طرح کرے گی، نعیم کے ذریعے اس نے قائم علی کو کہلا دیا تھا کہ اسے طلاق چاہیے۔ پہلے پہل تو نعیم اس کی بات سن کر حیران ہوا مگر جب اس نے موجی کی حالت دیکھی اور قائم علی کے طور طریقے، جو اسے اس کے کسی قریبی دوست نے بتائے تھے، اسی نے موجی کو بھی بتایا تھا کہ قائم علی کی کیا سرگرمیاں ہیں۔

''تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے موجی؟'' نعیم نے پوچھا تھا۔ ''بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔'' نعیم کو تو بہن کا کوئی بوجھ نہ تھا مگر اسے اس حال میں دیکھ دیکھ کر پریشان رہتا تھا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ قائم علی کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ موجی کو واپس لے جائے گا مگر اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی اس کے کوئی آثار نہ تھے اور اس کی وجہ تو یہی تھی نا کہ اسے پیسے کے عوض عورتیں میسر تھیں، اسے کیا کمی تھی۔ چار دن کے لیے زرتاج کو ان کے ہاں چھوڑ کر اس کا وقت وہیں گزرتا تھا۔ اس دکھ نے اس کی ماں کی جان لے لی تھی اور اب موجی خود گھل رہی تھی۔

''اچھا ہے موجی نے خود ہی یہ فیصلہ کیا ہے، کچھ عرصہ گزرے گا تو میں اسے سمجھا بجھا کر کسی جگہ اس کی شادی کروا دوں گا۔ اس کا گھر بھی بس جائے گا اور بال بچے ہوں گے تو اسے اپنا دکھ بھولنے میں آسانی ہوگی۔'' نعیم نے سوچا تھا۔

''ٹھیک ہے، زرتاج کو لینے آئے گا تو میں اسے تمہارا پیغام دے دوں گا۔''

موجی نے تو کسی اور کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا مگر آپا جی نے اسے سمجھایا تھا ''بلاوجہ تجرد کی زندگی گزارنا بھی گناہ ہے۔ اگر اللہ نے تمہارے لیے کسی اور کو مقدر بنا دیا ہے تو خود بخود تمہارے سامنے وہ سارے حالات بنتے چلے جائیں گے۔'' اس نے اللہ کی رضا کے آگے، آپا جی کے سمجھانے پر سر جھکا دیا تھا۔

☆☆☆

''تم تو میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئی ہو۔'' وہ کلثوم سے لپٹ گئی تھی۔ پڑوس والی خالہ بھی آ گئی تھیں اور سختی سے اس سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ سے وہ ہرگز گھر پر اکیلی نہ رہے۔ زرتاج نے دانستہ ان کے سامنے آنے والوں کے نام نہیں لیے تھے، وہ جانتی تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھے کسی طاقت ور کے کارندے تھے اور یوں کسی کا منہ پھاڑ کر نام لے یا کسی پر شک ظاہر کرے گی تو مشکل میں پڑ سکتی ہے۔ ہاں البتہ اماں آئے تو اسے حرف بہ حرف بتانے کا سوچ رکھا تھا اس نے۔

پڑوسن تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی مگر اسے کہہ گئی تھی کہ وہ اس کی ماں کے آنے تک بار بار چکر لگاتی رہے گی۔ ''کہو تو پپو کو بھجوا دوں، یہیں بیٹھتا ہے جب تک تمہاری اماں نہیں آتیں؟''

''نہیں خالہ ٹھیک ہے، ابھی تو کلثوم آئی ہے، یہ کچھ دیر بیٹھے گی اور تم خود چکر لگاتی رہو۔'' اس نے پپو کے آنے کو ٹالا۔ اتنا اچھلا بچہ تو شاید ہی کوئی ہوگا اور اسے گھر پر بلا کر اپنی شامت کو دعوت دینے والی بات تھی۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی اور زرتاج نے بیرونی دروازے کا کھٹکا لگا دیا۔

''شکر ہے کہ تمہیں میری یاد بھی آئی۔'' زرتاج اسے پھر لپٹ گئی تھی۔ ''کیسی ہو؟''

''بس ٹھیک ہی ہوں۔'' اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔



''تمہارے انداز سے تو لگ رہا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔'' وہ مسکرائی۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو.....'' اس نے کہا۔ ''چوہدرانی جی نے کہا تھا کہ میں تمہاری اماں کو دکھاؤں، بس طبیعت ذرا گری گری سی رہتی ہے۔'' اور زرتاج اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر حیران تھی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''ان کا مطلب ہے کہ تم..... یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم..... میرا مطلب ہے کہ گھونٹو تو اتنا گندا ہے۔'' زرتاج معصومیت میں ایک غلط بات کہہ کر پچھتانے لگی۔

''وہ تو ہے زرتاج..... مگر میری شادی ہوئی ہے اس سے۔'' اس کے لہجے میں کیا تھا کہ زرتاج کے دل میں کوئی پھانس سی چبھی۔ ''کیا میں اس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے ہاتھ بھی نہ لگائے..... کاش میں اسے کہہ سکتی۔'' اس نے سینے کی گہرائی سے کھینچ کر لمبی سانس لی۔

''چوہدرائی جی کا اندازہ ٹھیک ہے۔'' زرتاج نے اسے چیک کر کے کہا تھا۔ ''کیا تم یہ بچہ پیدا کرنا چاہتی ہو یا۔''

''اس غریب کو پیدا نہ کرنے والی میں کون ہوں، کون سا یہ میری ناجائز اولاد ہے۔'' کلثوم نے کہا۔ ''اور اسے پیدا نہ کروں گی تو کیا قتل کر دوں گی اور اسے نہ پیدا کروں گی تو کیا اس کے بعد کوئی نہیں آنے والا؟'' وہ سسکنے لگی۔

''ارے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔'' زرتاج ہکلائی۔ ''میں سمجھی کہ تم اس مقصد کے لیے آئی ہو گی اور اگر ایسی بات ہوتی تو میں خود تمہیں سمجھاتی۔''

''جہانداد سے بیاہ ہوا ہے میرا زرتاج، دنیا کی نظر میں شوہر ہے میرا، اسے میرے اوپر کلی اختیار ہے۔ میں اس کے ساتھ کیسے رہتی ہوں، کس طرح برداشت کرتی ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔'' رو رو کر اس کا چہرہ تر ہو گیا تھا، اتنے دنوں کے بعد اسے کسی سہیلی سے دل کی بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ ''مگر میں اپنی اولاد کو کس طرح مارنے کا سوچ سکتی ہوں، اس کا کیا قصور..... اسے کس ناکردہ جرم کی سزا دوں۔ جن کے جرم تھے، ان کی سزائیں بھی میں بھگت رہی ہوں..... کبھی تو میرا اللہ مجھ پر رحم کرے گا ناں!''

''اس طرح کی حالت میں اچھی اچھی باتیں سوچا کرو، یوں پریشان نہ ہوا کرو۔'' زرتاج نے اسے تسلی دی۔ ''جب دل چاہے میرے پاس چلی آیا کرو!''

''میرے پاس کہاں وقت ہوتا ہے کہ ادھر اُدھر گھومتی پھروں، سارا دن کام کاج میں گزرتا ہے۔''

''کتنا بڑا گھر ہے تمہارا جو کام کاج میں وقت گزرتا ہے اور دو بندوں کا کام ہوتا بھی کتنا ہے؟'' زرتاج نے ہنس کر پوچھا۔

''میں چوہدری نور علی کی حویلی میں کام کرتی ہوں زرتاج، اپنی روزی کمانے کے لیے کیونکہ جہانداد کچھ بھی نہیں کرتا اور اس کے نشے کی لت بھی تو پوری کرنا ہوتی ہے۔'' اس نے کہا تو زرتاج کو غصہ آ گیا۔

''وہ کام کیوں نہیں کر سکتا۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''اسے ہڈحرامی کی عادت تھی تو شادی کے بعد ہی تم اسے مجبور کرتیں، خود کام کرنے سے انکار کر دیتیں۔ تم نے کبھی کیا ہے ایسا کام جو تم کر رہی ہو، اتنے نیک لوگوں کی اولاد کے ساتھ۔ کچھ انہوں نے کیا اس کے بعد بھی انہیں سکون نہیں آیا کہ اسے اپنی حویلی کی چاکر بنا ڈالا۔ تم اب اس کے بعد کام کرنے سے انکار کر دو کلثوم، کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اسے سیدھا کروا دیتی۔''

زرتاج کا پیچ و تاب کھانا بالکل قدرتی تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کس کے اختیار میں کیا کرنا تھا، وہ کلثوم بھی جانتی تھی۔ اسے علم تھا کہ اس کی بری عادتوں کو چھڑوانا ممکن نہ تھا مگر زرتاج کے سمجھانے کا اس پر کچھ تو اثر ہوا تھا۔ خاموشی سے سر جھکا کر وہ ساری بات سن رہی تھی، اپنے آنے والے بچے کی خاطر اسے کوئی نہ کوئی حکمتِ عملی وضع کرنا تھی کیونکہ بچے کی آمد کے بعد وہ کس طرح چوبدریوں کے گھر کا کام جاری رکھ سکتی تھی، بچے کو ساتھ لے کر حویلی جاتی یا اسے گلی محلے میں رُلنے کے لیے چھوڑ جاتی۔

''میں تمہاری بات تو سمجھ گئی ہوں مگر مجھے اپنی کامیابی کی قطعی کوئی امید نہیں ہے۔''

''چلو تم اس پر عمل درآمد تو شروع کرو، عورتیں تو بڑے بڑے سورماؤں کو مات کر لیتی ہیں۔'' زرتاج نے کہا۔

''سورما ہی تو نہیں ہے وہ زرتاج۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''سورما ہوتا تو میں یوں بے قدری سے نہ رُل رہی ہوتی!''

''صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' زرتاج نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

''وہی تو کر رہی ہوں اور میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔'' اس نے آہ بھری۔ معراج بی بی کے گھر لوٹتے ہی اس نے اجازت چاہی اور چل دی، گھر میں جانے کتنے ہی کام اور جہانداد کی شکل میں عفریت اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

اسے کہاں عادت تھی یوں گھٹ گھٹ کر جینے کی، آزاد فضاؤں میں پل کر جوان ہوئی، ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ سارا سراد نگر اس کے لیے اپنے گھر جیسا تھا اور اب دو کمروں کے گھر میں گھٹنے سے ماحول میں وہ کتنے عرصے سے ''محصور'' تھی۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی، عباس کام پر جاتا تو دروازہ کھولنے پر پابندی عباس کی محبت میں وہ کتنی ہی محبتوں کو پیر سے ٹھوکر مار کر ماں باپ کو عمر بھر کے لیے گھاؤ دے آئی تھی۔

واپس جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، اسے علم تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔ ماں باپ سے رحم کی توقع عبث تھی، ماں تو اسے بارہا کہہ چکی تھی کہ جس دن اس کے باپ کو علم ہوگا، وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا... مگر اس نے وہ دن آنے ہی نہ دیا تھا۔ جب سے کاجل نے اس کی ماں کو بتایا تھا اس کے بعد سے اس نے ہی عباس کو جلد از جلد اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کو کہا تھا کیونکہ اسے اپنی ماں پر شک تھا کہ وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے، کسی بھی وقت اس کے باپ کو بتا سکتی تھی... اس وقت عباس کے عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، کسی اور کی بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

اب اسے یاد آتا تھا کہ کوثر نے بھی اسے اس کے گھر سے بھاگنے کے ارادے سے منع کیا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ شکیلہ سے بات کر کے اسے منا لے گی، شکیلہ اس کا بھائی، اسے بھائی کی یاد اُمڈ کر آئی، جانے وہ کیسا ہوگا۔ اب تو یقیناً اس کی اور کاجل کی شادی ہو گئی ہوگی، ہو سکتا ہے کہ کوئی بال بچہ بھی ہونے والا ہو... اس نے اپنی حالت کا سوچ کر اندازہ لگایا۔ کاجل دو بچوں کی بن کر کتنی پیاری لگتی ہوگی... اس نے سوچا، اماں نے کیسا خوب صورت لال جوڑا اس کے ماموں سے منگوایا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ لال جوڑا کلثوم کو پہننے کو ملا تھا، جس کی شادی ان کے گھر کے ملازم گھوٹو سے ہوئی تھی۔ اسے کیسے علم ہوتا کہ اس کی سکھی کاجل کی چتا کی راکھ کو گنگا جل کے بجائے گندی نالی میں بہنا نصیب ہوا تھا۔

اسے کیا خبر کہ اسے اتنا پیار کرنے والے ماں باپ اور بھائی پر اس کے اس اقدام کے بعد کیا بیتی، وہ کسی



منہ دکھانے کے قابل رہے تھے، نہ سر اٹھا کر مراد نگر کی گلیوں میں چلنے کے لائق۔ وہ تو اپنی دنیا میں مست تھی اور اس امید پر دن گن رہی تھی کہ جب اس کا بچہ پیدا ہوگا تو عباس اسے لے کر گاؤں جائے گا۔ اپنے بچے کے لیے وہ جو بھی نام سوچتی وہ ہندوؤں کا ہی ہوتا تھا... وہ بھی نام کی ہی مسلمان ہوئی تھی۔ بھلا جو کوئی کسی انسان کی محبت میں اپنا مذہب تبدیل کرے اس کی نظر میں مذہب کی کیا اہمیت۔

حافظ کرم اللہ اور بی بی جی جیسے نیک جوڑے کی اولاد... عباس نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنے مذہب پر بھی بٹا لگایا تھا۔ پنج وقتہ نمازی... اب اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ نماز کا وقت ہوتا کس وقت ہے۔ محنت مزدوری اس کی ضرورت بن گئی تھی، فکرِ معاش نے اسے نماز روزے سے بھی دور کر دیا تھا۔ جب اسے ہی سب کچھ بھول گیا تھا تو وہ زہرہ کو کیا سکھاتا۔ محلے میں بھی وہ کسی سے نہیں مل سکتی تھی کہ کوئی اس کا اور عباس کا آگا پیچھا پوچھ بیٹھتا تو...

ایک دور دراز کے سرکاری اسپتال میں عباس اسے لے کر جاتا تھا تاکہ نزدیکی اسپتال جانے سے محلے میں کسی سے واقفیت نہ بنانی پڑ جائے۔ عباس نے اس پر اتنی پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ تنگ پڑ گئی تھی، کئی بار سوچتی کہ جب عباس گھر سے نکلے تو اسے باہر نکلنے میں کیا ممانعت ہے۔ دل میں عباس کا خوف تو تھا ہی کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے، اس سے زیادہ ڈر یہ تھا کہ اس کے گھر والے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک نہ آن پہنچیں۔

بیٹی کی پیدائش تک وہ گھر کا کام بھی خود کرتی رہی تھی کیونکہ عباس کو کسی کا ان کے گھر آنا بھی گوارا نہ تھا مگر جب اس پر اسپتال جانے کا وقت آیا تو وہی ہمسائے کام آئے تھے جن کو کبھی انہوں نے سلام تک نہیں کیا تھا۔ عباس شام کو کام سے لوٹا تو اس کا استقبال بستر پر پڑی زہرہ اور اس ننھی سی معصوم آواز نے کیا تھا۔ وہ سمجھا کہ والدت گھر پر ہی ہو گئی ہے، فوراً بچے کی طرف لپکا۔

''کیا ہوا ہے؟'' زہرہ کے جواب سے اس کا دل ذرا سا مرجھا گیا۔

''کس کو بلایا تھا مدد کے لیے؟''

''ہمسایوں کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا تھا، تمہیں کہاں سے بلاتی... نہ کسی سے مدد لیتی تو مر جاتی میں تو!'' اس نے صفائی دی تو وہ خاموش ہو گیا۔

''کچھ پکایا ہے؟'' اس نے بھوک سے بے چین ہو کر پوچھا۔

''ہمسائی ہی کچھ پکا کر گئی ہے، روٹیاں لانی پڑیں گی اور میرے لیے یخنی گرم کر کے دے دینا۔'' زہرہ کے کہنے پر وہ خاموشی سے روٹیاں لینے کے لیے باہر نکل گیا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی بیٹی کو اٹھانا تو درکنار، ایک بار دیکھا بھی نہ تھا۔

☆☆☆

سہیل کے باپ نے اسے سخت سست کہا تھا، نہ صرف اسے بلکہ اس کی ماں کو بھی کئی طرح سے باتیں سنائی تھیں کہ اس کی بے پروائی کی وجہ اس کی ماں ہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اولاد کی تربیت میں سختی زیادہ ہونی چاہیے اور رعایت کم، انہیں کچھ بھی چاہیے ہو تو ان کی فرمائش بغیر کسی وجہ کے پوری نہیں کر دینی چاہیے۔ انہیں کوئی نہ کوئی وجہ بتانا چاہیے کہ ان کی مطلوبہ فرمائش اسی صورت میں پوری ہوگی جب وہ خود کو اس کا اہل ثابت کریں گے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کا منفی رویہ ہی تھا کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی سہیل اور وہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر نظر آتے تھے۔ سہیل کے بعد کوئی اور اولاد بھی نہیں ہوئی تھی، ایک وہی دنیا میں آ گیا تھا، اسی کا پچھتاوا تھا کہ وہ نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے کے پابند نہ ہوتے۔ نسرین عرف نینا، لاکھ کوشش کرتیں، اسلم کی نظر بازی کی عادت نہ چھڑوا سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ گھر سے باہر نکلتیں تو انہیں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کے علاوہ دنیا کی ہر عورت اور لڑکی نظر آتی، اسے دیکھنا اور گھورنا ان کا فرض تھا اور کھلے لفظوں میں اس کی چال ڈھال، اداؤں اور جسمانی ساخت پر تبصرے نینا کو بہت ناگوار گزرتے تھے۔

"جوان اولاد سے بات کرنے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ..... اور آپ ہمیشہ اس کے سامنے مجھے غلط کہہ دیتے ہیں، کبھی میں نے بھی اسے کہا کہ آپ غلط ہیں یا اس کے ذہن میں آپ کے خلاف کوئی سوچ ڈالی ہو۔" نینا نے نرمی سے کہا۔

"تم نے جو کچھ اس کے ذہن میں میرے خلاف ڈال رکھا ہے، میں سب جانتا ہوں۔ سب سمجھتا ہوں، میرے سامنے تم کچھ کہو نہ کہو مگر میں اس کے انداز دیکھ کر ہی سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لیے کیا سوچ رکھتا ہے۔" اسلم نے غصے سے کہا۔ "اس کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے بنا کسی شرط کے اسی لیے یہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا..... اب کے یہ فیل ہوا تو میں اس کی ٹانگیں بھی توڑ دوں گا اور گھر سے باہر بھی نکال دوں گا اسے، جائے اور بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرے۔"

نینا نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی مگر دل ہی دل میں سوچا کہ بعد میں اسے کہے گی کہ اسے ہاتھوں سے نہ ہی نکالے تو بہتر ہے۔ جس اولاد کی خاطر انہوں نے اپنی عمروں کے بہترین سال آپس میں مجبوراً ساتھ رہ کر بسر کیے ہیں، اگر اس کے ساتھ یہی سلوک روا رکھنا تھا تو چھوڑ دیا ہوتا اسے اپنے مقدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے اور دونوں اپنی اپنی زندگیوں کو اپنے انداز اور اپنے ڈھب سے گزارتے۔ مگر ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا اور ہر بار یہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مصداق ثابت ہوتا تھا۔

اسلم ایک بدنیت آدمی تھا اور بیوی کے معاملے میں بدزبان بھی۔ نینا کو صرف یہ ڈر تھا کہ سہیل کے فیل ہونے کی وجہ اس کی کوئی اور سرگرمی نہ ہو۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ عادتوں میں سہیل، اسلم پر نہ جا پڑے مگر چاہنے سے بھلا ہونی کو کون روک سکا ہے۔ جس بات سے وہ خوف زدہ تھی، وہ ہو چکی تھی۔ عمر کے جس دور میں سہیل تھا، اس میں اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے، جو حرکتیں وہ وقتی لطف اٹھانے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، ان حرکتوں کی وجہ سے لوگوں کی زندگیاں تہس نہس ہو جاتی ہیں۔

"سن رہے ہو تم؟" اسلم نے دھاڑ کر پوچھا۔

"کیا ابو؟" اس نے یوں بے پروائی سے کہا جیسے اس کا باپ اتنی دیر سے دیواروں سے باتیں کر رہا ہو۔

"تمہاری ماں کا سر..... خبیث ہو تم پورے۔" انہوں نے حسبِ عادت اسے بری طرح جھاڑا اور سہیل نے حسبِ عادت ان کی ڈانٹ کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔

☆☆☆

"ہاں یہ رہے تمہارے اس دن کے پیسے۔" منشی نے ان کا حساب چیک کر کے رقم ان کے ہاتھوں میں تھمائی۔ "اور ہاں کس کس کی بیٹیاں ہو تم لوگ؟"

"جی، میں بالے ترکھان کی اور یہ دینو ماچھی کی۔" نگی نے اپنا اور رانی کا تعارف کروایا۔



"کیا نام ہے تمہارا لڑکی؟" منشی نے اپنی عینک کے پار سے رانی کو گھوری ماری۔

"جی میرا نام رانی ہے اور اس کا نگی۔" اس نے تھوک نگل کر کہا۔

"میں نے تم سے فقط تمہارا نام پوچھا ہے۔" اس نے اسے پھر گھرکا۔ "کس گاؤں کی ہو؟"

"جی گاؤں سے باہر جو بھٹہ ہے اینٹیں بنانے کا ... اس کے پاس ہی ہماری جھگیاں ہیں۔" اس نے سہم کر جواب دیا۔

"اور تم لڑکی، کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے نگی کی طرف گھور کر دیکھا۔

"جی نگی ... میرا مطلب ہے نگینہ۔" اس نے وضاحت کی۔ "ابا کا نام دین محمد ہے جی!"

"میں نے کوئی تمہارا نکاح پڑھانے کے لیے تو تفصیل نہیں مانگی جو تم مجھے اپنے ابے کا نام بھی بتا رہی ہو۔" اس نے غصے سے کہا۔ "ایک تو ان نیچ لوگوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے کہ اپنی حیثیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی عادت ہوتی ہے۔" وہ بڑبڑایا مگر انہیں سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا گل افشانی کر رہا تھا۔

"اب ہم جائیں جی؟" نگی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا کرنا ہے تم نے اگر جانا نہیں ہے تو۔" اس نے کہا تو وہ دونوں مڑیں اور چل دیں۔

"منشی صاحب۔" رانی نے دو قدم چل کر ہی کچھ سوچا اور رک گئی۔

"اب کیا یاد آیا ہے، کیا کوئی اور رقم باقی رہ گئی ہے تیری؟"

"نہیں نہیں ... وہ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ چوہدری صاحب کب آئیں گے؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔

"کیوں؟" چتون چڑھا کر منشی نے پوچھا تھا۔

"یونہی، بس ان سے ملنا تھا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"جو بھی بات کرنی ہے، مجھ سے کہو، چوہدری صاحب یوں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو ملنا شروع کر دیں تو اور کوئی کام نہ کریں پھر تو۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"جی کام تو کوئی نہیں تھا ... بس یونہی۔" اس نے بہ مشکل کہا، منشی کا انداز ہی اتنا بے عزت کر دینے والا تھا۔

"چل اب رانی، دیر ہو رہی ہے۔" نگی نے اسے گھسیٹا، منشی کے ہتک آمیز انداز نے اسے خاصا مایوس کیا تھا۔

"مجھے اس سے بات تو کرنے دیتیں تم، کیوں گھسیٹ لائی ہو تم؟" رانی نے احتجاج کیا۔

"اگر تم نہ سمجھنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے رانی مگر میں اس سے زیادہ بے عزتی منشی کے ہاتھوں اپنی برداشت نہیں کر سکتی۔ دیکھ نہیں رہی تھیں تم کہ وہ کیسے گھور رہا تھا اور اس کی گفتگو ... کوئی تمیز ہی نہیں ہے اسے کہ لڑکیوں سے بات کیسے کرتے ہیں۔" نگی روہانسی ہو رہی تھی۔ "تو اگر پاگل ہو گئی ہے رانی تو جو تیرا من چاہتا ہے کر مگر میں اس کے بعد تیرے ساتھ نہیں آنے والی بے عزتی کروانے کے لیے، ہاں بتائے دیتی ہوں!"

انہیں دور جاتے دیکھ کر منشی سوچ رہا تھا کہ جانے ان غریبوں کے گھروں میں ایسے ہیرے اور لعل کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں، روکھی سوکھی کھا کر اور آدھا سال فاقے کر کے بھی ان کے چہروں پر کیسے تازگی نظر آتی ہے، جب میں کام کر کے ان کی رنگت جلنے کے بجائے کشمیری سیبوں جیسی لال کیسے ہوتی ہے؟ ان کا دور رہنا ہی بہتر ہے، اپنے ماں باپ کے گھروں میں تو یہ چھپی بیٹھی رہتی ہیں مگر جس دن حالات انہیں گھروں سے باہر نکالتے ہیں،



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ کسی نہ کسی کی نظر میں آ جاتی ہیں۔ گھروں سے کمانے کو نکلتی ہیں کہ ماں باپ عزت سے انہیں رخصت کر دیں اور یہ اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہیں۔ اسی لیے بچو، اسی لیے میں تم سے غصے سے بات کر رہا تھا کہ تم دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرو، کہیں چوہدری اکبر علی پا اس کے بھائیوں..... اور تو اور ان کے باپ کی بھی نظر تم پر پڑ گئی تو تم بچ نہ سکو گی۔"

"ٹھیک ہے، دفع رہ تو، مر کہیں جا کر..... مجھے نہیں چاہیے تیرے جیسی سہیلی۔" رانی نے غصے سے کہا۔

"تجھے میری خوشی کا خیال ہے نہ مجبوری کا احساس۔"

"رانی..... دیکھ۔"

"بس دیکھ لیا تیرا پیار رانی نے، اب جو بھی کرنا ہوگا میں خود ہی کر لوں گی۔ چوہدری صاحب سے ملنے کے لیے رانی کو منتی سے دس بار بھی بے عزتی کروانی پڑی تو کروا لے گی۔" یہ کہہ کر گنگی کا ہاتھ جھٹک کر وہ مخالف سمت کی پگڈنڈی پر چل دی، گنگی اسے خود سے دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ رانی سمجھنے سمجھانے کی حد سے باہر جا چکی ہے۔

☆☆☆

جس طرح قائم علی کی بیٹیوں کا کچھ اتا تھا نہ پتا..... اسی طرح سلیم کی خودکشی کا واقعہ بھی ایک معما ہی رہا تھا۔ کالج سے پولیس کو کوئی سراغ ملا تھا نہ اس کے دوستوں میں سے ہی کوئی تسلی بخش جواب دے سکا تھا۔ اس کے ساتھی طالب علموں کے لیے تو اس حادثے کو بھلانا مشکل تھا ہی مگر اس واقعے کے جو اثرات سہیل پر ہوئے تھے، انہوں نے اس کی تعلیمی کارکردگی کو بہت متاثر کیا تھا۔ پرنسپل صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلایا تھا۔

"مجھے حیرت ہے سہیل کہ تم ایک اوسط قسم کے طالب علم سہی مگر اب کی بار جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ ناقابلِ یقین ہے، مجھے تمہارے اساتذہ نے بتایا ہے کہ زیادہ تر پرچے تم نے خالی ہی ممتحن کے حوالے کر دیے ہیں۔" پرنسپل نے اس سے کہا تو وہ یوں ان کا منہ دیکھنے لگا جیسے انہوں نے کوئی انکشاف کیا ہو۔

"خالی۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "خالی پرچے دے دیے؟"

"تو کیا میں مذاق کر رہا ہوں تم سے سہیل؟" پرنسپل صاحب نے غصے سے اسے کہا۔ "میں تمہارے والد صاحب کو بلا کر شکایت کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ اتنے غصیلے آدمی ہیں کہ ہر بار ان کا آنا یہاں پر تماشا کھڑا کر دیتا ہے، اس لیے میں نے تم سے بات کرنے کا سوچا اور اگر تم چاہتے ہو تو میں انہیں بلا لیتا ہوں؟"

"نہیں سر..... ایسا نہ کریں، میں خود نہیں سمجھ پا رہا کہ ایسا کیسے ہوا، میں کیسے خالی پرچے دے سکتا ہوں میں نے بہت اچھی تیاری کی تھی۔" وہ گڑگڑایا۔

"میں سمجھتا ہوں سہیل کہ سلیم کی خودکشی نے تمہارے ذہن پر خاصے برے اثرات مرتب کیے ہیں، وہ تمہاری پڑھائی میں مدد بھی کرتا تھا، اور اس کے نوٹس سے تم تیاری کرتے تھے۔" پرنسپل نے کہا۔

"سر میں نے افضال اور ندیم سے نوٹس لے لیے تھے اور سلیم کے نوٹس بھی میرے پاس ہی تھے، میں نے بہت محنت کی تھی سر، میرے ابا نے مجھے الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ میں فیل ہوا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ آپ دوبارہ میرا امتحان لے لیں، مجھ سے زبانی سب کچھ سن لیں بے شک۔" اس نے گھگیا کر کہا۔

"یہی بات تو مجھے مخمصے میں ڈال رہی ہے، تیرھویں جماعت کا طالب علم اتنا غیر ذمے دار اور غیر حاضر دماغ تو نہیں ہو سکتا کہ پرچے پر اپنے نام اور رول نمبر کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھے اور وہ بھی کہ وہ پورے تین گھنٹے



تک امتحانی ہال میں بیٹھا بھی رہے۔"

"سر میرا یقین کریں، مجھے پورا یقین تھا کہ میں پاس ہو جاؤں گا، مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا سر..... مجھے ایک اور موقع دیں سر!"

"مجھے افسوس ہے سہیل کہ تمہارا پورا ایک سال اور محنت ضائع گئی مگر ہم اپنے کالج کے قوانین و قوانین ایک ایک طالب علم کے لیے تبدیل نہیں کر سکتے۔ مجھے امید ہے اس بار تم محنت کرو گے اور اپنا امتحان پاس کر لو گے۔" انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو..... اور ہاں اگر تم نے پہلے ششماہی امتحان تک اپنی کارکردگی میں بہتری نہ دکھائی تو مجبوراً تمہارا نام کالج سے کاٹ دیا جائے گا۔" اس نے رک کر ان کی بات سنی اور اسے سمجھ کر اس کی سانس رک گئی۔

اگر یہ بات پرنسپل صاحب اس کے باپ سے کہتے تو وہ کسی بات کا لحاظ نہ کرتے اور یہاں سے اسے جوتے مارتے ہوئے گھر تک لے کر جاتے۔

☆☆☆

ناہید نے بیٹی کو جنم دیا تھا، گھر پر بچوں کے پاس ہی اس نے شاکر کی بیٹی کو چھوڑا تھا اور اپنی ہمسائی کو بچوں کے پاس ہی رہنے کو کہا، تب تک، جب تک شاکر یا سعید میں سے کوئی لوٹ کر نہ آ جائے۔ اس نے ہمسائی کو بتایا تھا کہ شاکر ان کا دور پار کا رشتے دار ہے اور اس کی بیوی اس بچی کی پیدائش کے دوران ہی انتقال کر گئی تھی اس لیے وہ اسے لے کر شہر آ گیا تھا۔ ہمسائی سلمیٰ کو اچھی طرح جانتی تھی اور اس کے پاس اس بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شاکر ہی پہلے لوٹا تھا، اس کے بعد ہمسائی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ ہاجرہ نے شاکر سے چائے یا روٹی کا پوچھا، بھوک تو اسے تھی مگر اس نے سوچا بچی کو کیا تکلیف دے۔

"بیٹا چائے بنا دو اور اگر ساتھ کوئی بسکٹ وغیرہ ہیں۔ ورنہ میں جا کر دکان سے لے آتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے ماما جی، میں چائے بناتی ہوں۔" وہ اٹھی تو شاکر بچی کو لٹا کر بسکٹ لینے چلا گیا بسکٹ کے دو تین ڈبے اس نے لیے اور پھر جانے کیا سوچ کر اس نے بچوں کے لیے ٹافیاں بھی لے لیں۔

"آپ نے یہ تکلف کیوں کیا ماما جی؟" ہاجرہ بہت سمجھدار بچی تھی۔

"ماما جی بھی کہتی ہو اور کہتی ہو کہ تکلف بھی کیا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے..... اس کا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نام تو ابھی رکھا ہی نہیں۔" وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں میں لوٹ کر گاؤں جائے گا اور زرتاج سے پوچھے گا کہ اس بچی کا نام کیا رکھنا تھا اسے..... اور وہ تھی کس کی بچی۔

"اب تو یہ سات دن کی ہو گئی ہے اس کا نام رکھ لینا چاہیے۔" ہاجرہ کے کہنے پر اسے خیال آیا کہ کب تک وہ بچی بے نام رہے گی، کوئی نہ کوئی نام عارضی طور پر رکھ لے اور اگر زرتاج کو پسند نہ آیا تو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

"تم بتاؤ، تمہیں کون سا نام اچھا لگتا ہے؟" شاکر نے اس سے پوچھا۔

"مجھے۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "آج امی گھر آئیں گی تو انہیں کہیں گے کہ اس کا کوئی نام رکھیں، انہیں بہت سے ناموں کا پتا ہوگا، ہم سب بہن بھائیوں کے نام انہوں نے رکھے ہیں۔" چائے پینے کے دوران ہی سعید بھی لوٹ آیا تھا، بچوں نے اسے بتایا کہ ماموں ان کے لیے ٹافیاں لائے تھے۔ سعید نے اسے آئندہ کے لیے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسے تکلفات سے منع کیا تھا..چائے پی کر اس نے کہا کہ وہ اسپتال جاتا ہے شاید اس کی ضرورت ہو وہاں۔

''دکان پسند آئی تمہیں؟'' سعید نے اس سے پوچھا تھا۔ شاکر نے اس سے کہا تھا کہ وہ کوئی دکان کھولنا چاہتا ہے، ابھی تک اس نے اپنے کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی۔ اپنا سارا سونا بھی اس نے اسی طرح اپنے پاس سنبھالا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں تو رہ رہا تھا مگر ابھی تک انہیں اتنا نہیں جانتا تھا کہ انہیں اپنے بارے میں سب سچ بتا دیتا۔

''اچھی ہے، ذرا بڑی ہے اور کرایہ بھی زیادہ ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''کرایے کے لیے تو میں بات کرلوں گا مگر بڑی دکان تو اچھی ہے، جو بھی کاروبار تم شروع کرو گے اسے انشاء اللہ آگے بڑھنا ہی ہے، بعد میں دکان تبدیل کرنے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی بڑی دکان لے لو۔'' سعید نے تجویز دی۔

''میں وہاں سے ہو کر آپ کی دکان پر جا بیٹھا تھا، میں نے ان کو بتایا کہ میں آپ کا دور پار کا سسرالی رشتے دار ہوں، تھوڑی دیر وہاں بیٹھا تھا، میں نے سوچا کہ آپ نہیں ہیں تو مالک کی غیر حاضری میں بے پروائی نہ کریں۔''

''بہت مہربانی، تم نے ایسا سوچا اور اتنا خیال کیا۔'' سعید نے احسان مندی سے کہا۔

''میں نے کتنے دن آپ کا نمک کھایا ہے، جانے کب میرے لیے کوئی بندوبست ہو، کب گھر ملے یا کوئی کرایے کا کمرہ اور میں وہاں منتقل ہوں گا، تب تک تو آپ لوگوں کے گھر پر ہی ہوں ...... آپ ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' شاکر نے کہا۔

''ہر کوئی اپنے نصیب کا کھاتا ہے، ایسی بات کر کے تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔'' سعید نے کہا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

''آپ جس کام سے گئے تھے، اس کا کیا بنا؟'' شاکر نے اس سے پوچھا۔

''کوئی امید نظر نہیں آتی۔'' سعید نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ ''دیکھو شاید بچی کی ولادت کا سن کر اس کا دل موم ہو جائے!''

☆☆☆

''کیا اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑی ہو، اٹھو مجھے چائے بنا کر دو اور اپنے کام پر جاؤ۔'' جہانداد نے غصیلے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، خود ہی چائے بناؤ اور مجھے بھی بنا کر دو۔'' اس نے سستی سے کہا۔ ''اور کام پر بھی نہیں جا سکتی میں، منع کیا ہے!''

''کس نے منع کیا ہے تمہیں، کیا چوہدرانی جی نے منع کیا ہے؟'' وہ چلایا۔ ''کیا ہوگا؟ تم نے کوئی لفڑا یا کوئی چوری چکاری کی ہے۔'' وہ خود ہی قیافے لگا رہا تھا۔

''مجھے چوری کی عادت ہے نہ لفڑے کی اور نہ ہی چوہدرانی صاحبہ نے منع کیا ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔

''تو پھر کس مائی کے لال نے تجھے روکا ہے کام پر جانے سے؟''

''بتایا ہے تمہیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور معراج خالہ نے منع کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ پھوپھی لگتی ہے تیری کہ تجھے منع کرے ...... اور ملی کہاں تجھے، وہ تو دوسرے محلے میں رہتی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میں گئی تھی اس کے پاس، کہیں راستے میں نہیں ملی تھی وہ۔''



''تو گئی تھی؟'' اس نے آنکھیں چندھیا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کس لیے گئی تھی تو وہاں پر؟''

''چوہدرانی جی نے بھیجا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا، جانتی تھی کہ اس کے آگے اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

''انہوں نے کس کام سے بھیجا تجھے وہاں ...... ابھی تو ان کی بہو مری ہے اور باقی بیٹے تو ابھی کنوارے ہیں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کہیں خود ہی تو چوہدرانی پر جوانی پلٹ کر نہیں آگئی۔'' اس نے آنکھ مار کر کہا۔

''جا کر پوچھ لے اُن سے۔'' کلثوم نے کہا تو وہ بدکا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا کہ میں جا کر ان سے پوچھوں اور تو بھی سن لے۔'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔ ''خبردار جو جا کر ان سے یہ اول فول بکی تو۔''

''جب تجھے پتا ہے کہ یہ اول فول ہے تو کون کہتا ہے کہ ایسی باتیں کیا کر۔'' ہونہہ کہہ کر اس نے سر کو جھٹکا۔

''سارے نخرے نکال دوں گا میں تیرے۔'' اس نے اسے ڈانٹا۔ ''سیدھی طرح اٹھ اور اٹھ کر چائے بنا کر مجھے بھی دے اور خود بھی پی کر کام پر دفع ہو۔''

''بتا دیا ہے میں نے تمہیں، کہ میں نہ کام پر جا سکتی ہوں نہ اٹھ کر چائے بنا سکتی ہوں، مجھے منع کیا ہے معراج خالہ نے۔'' اس نے پھر دُہرایا۔

''کیوں منع کیا ہے اس نے تجھے؟'' وہ ذرا سا دبک گیا۔

''کیونکہ میں......'' وہ رکی۔ ''کیونکہ میں ماں بننے والی ہوں۔'' کہہ کر وہ شرما گئی۔

''دماغ ٹھیک ہے تیرا ...... کس کی ماں بننے والی ہے تو اور کس طرح؟'' وہ گرجا۔

''ماں کس طرح بنتے ہیں۔'' اس نے اس کا چہرہ دیکھا جو غضب سے لال ہو رہا تھا۔

''جس طرح بھی بنتے ہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ تو ماں بنے ...... بس بہت ہوگئی بک بک، ختم کر اس قصے کو!''

''یہ قصہ نہیں ہے جسے ختم کر دیا جائے، بچہ ہے، اولاد ہے ہماری۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے اولاد کی، میرا کون سا تخت پڑا ہے جس کے لیے میں اولاد پیدا کرواؤں تم سے؟'' اس نے کہا تو وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

''انسان شادی اولاد کے لیے ہی تو کرتا ہے، اگر تمہیں اولاد پیدا نہیں کرنا تھا تو پھر شادی کیوں کی تھی مجھ سے؟''

''شادی میں نے نہیں کی تھی تم سے، زبردستی تمہیں میرے سر منڈھ دیا گیا تھا۔'' اس نے انکشاف کیا شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کلثوم سے شادی کر کے اس پر کوئی احسان کیا ہے۔

''اللہ جانتا ہے کہ کسے کس کے سر منڈھ دیا گیا تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔

''مجھے تو بس اتنا کہا تھا رام لال نے کہ میں تمہاری زندگی کو سزا بنا دوں۔'' اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا اس لیے وہ نئے نئے انکشاف کر رہا تھا۔ ''تمہارے بھائی نے میرے مالکوں کی زندگی کو عذاب بنا دیا تو انہوں نے بدلہ لینے کے لیے اپنے دشمن کی بہن کو چنا اور اسے میرے حوالے کر دیا۔''

''جیسے اس سزا کا لالے کو علم ہے اور اسے کوئی فرق پڑ رہا ہے۔'' کلثوم نے کہا۔

''بہت بدزبانی کرنے لگی ہے تو۔'' وہ اٹھا اور اس سے قبل کہ وہ اس کی طرف بڑھتا، وہ تیزی سے باہر کو بھاگی، دروازہ کھولا اور اس کے ہتھیوں چڑھ گئی ... گم نہ ہو گئی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ایک قدم بھی اس سے آگے بڑھایا تو میں سارے محلے کو اکٹھا کرلوں گی اور انہیں بتاؤں گی کہ تم مجھے مارتے ہو۔'' وہ حیرت سے شیرنی بنی اس عورت کو دیکھ رہا تھا، جس نے بارہا اس سے مار کھائی تھی اور کبھی اُف تک نہ کی تھی۔

''دروازہ بند کرو اور مجھے دھمکیاں دینے کا انجام جانتی ہے نا کہ کیا ہوسکتا ہے؟'' اس نے اسے دھمکایا۔

''کیا کرلو گے تم میرا؟'' اس نے جواباً اسے کہا۔ ''اب تم مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ!''

''اگر میں نے تمہیں طلاق دے دی تو تم کہیں کی نہ رہو گی۔'' اس نے کہا۔

''طلاق دو گے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی، ہونہہ! میں تو اب کہیں کی نہیں ہوں..... ہاں البتہ طلاق دے کر تم کہیں کے نہ رہو گے، نہ کوئی گھر ہوگا نہ گھاٹ۔ بھیک مانگتے پھرو گے!''

''میں سب سے کہوں گا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔'' اس نے اس کی دھمکی سے ڈر کر اسے ڈرانا چاہا۔

''یہ کہہ کر بھی دیکھ لو..... لوگوں کو یقین آ جائے گا کہ تم مرد ہی نہیں ہو۔'' اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے کہا تھا۔

''اچھا بڑا دم ہے تجھ میں۔'' وہ نزدیک آیا کہ اس کو بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر لائے اور اسے اتنا دھنکے کہ اس کے اندر بچے پیدا کرنے کا شوق ہی دم توڑ جائے۔ ''چل اب اندر آ اور آ کر مجھے چائے بنا کر دے۔'' اس نے فوراً اپنا لہجہ بدل لیا۔ اسے ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانا اچھی طرح آتا تھا، ایک یہی بات تو اس نے ہندوؤں کے گھروں کی چاکری کرتے ہوئے سیکھی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں چائے بنا دیتی ہوں تمہیں مگر کام پر نہیں جاؤں گی..... تم خود کام کرو، ساری دنیا کے مرد ہی کام کرتے ہیں۔'' اس نے دروازہ بند کیا اور صلح جو لہجے میں بولی۔ ''اگر تم کام پر نہیں جاؤ گے تو میں چوہدرانی جی سے کہہ دوں گی۔'' اس نے ٹھیک تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

''میں کیا کام کرسکتا ہوں؟'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''میں کتنا کمزور اور بیمار ہوں تمہیں تو علم ہے!''

''تم کمزور ہو نہ بیمار..... نشے کی لت نے تمہیں مستقل مریض بنا دیا ہے۔'' اس نے سمجھایا۔ ''نشہ کوئی اچھی عادت تو نہیں، اگر تم چاہو تو اسے چھوڑ کر بالکل تندرست ہو سکتے ہو۔''

''میں کیسے ٹھیک ہوسکتا ہوں۔'' اس نے کہا، دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ٹھیک ہو کر کرنا بھی کیا ہے۔

''اللہ کرے گا تو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ جہانداد اپنے ذہن میں کیا منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی بات اس کے شوہر کے دل کو لگ رہی تھی۔ ''تو پھر جاؤ گے نا تم آج سے کام پر؟''

''آج تم چلی جاؤ آخری دفعہ، میں کل سے کام پر جاؤں گا، آج دیکھتا ہوں کہ میں کیا کام کرسکتا ہوں۔'' اس کے کہنے پر جیسے اسے یقین آ گیا۔

''ٹھیک ہے..... لیکن کل یہ بہانہ نہ کرنا۔''

''کل..... وعدہ ہے کہ کل یہ بہانہ نہیں کروں گا۔'' اس نے کہا، مسکرا کر اسے دیکھا۔ ''کل تمہاری زندگی میں آئے گی تو نا!'' اس نے سوچا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کلثوم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس پر عمل کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

۳ جاری ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# تم ملو تو عید ہو

تحسین اختر

مناہل کی شادی تھی اور وسیمہ خاتون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے دنیا جہان کی چیزوں اور نعمتوں کا ڈھیر لگادیں۔ چونکہ گھر کی پہلی شادی تھی اس لیے جوش وخروش تو دیدنی تھا ہی مگر وقت کے تقاضے کے مطابق وہ اپنی بیٹی کو آسائشات سے مالا مال کردینا چاہتی تھیں۔ مناہل کا بر بھی انہوں نے بڑی تگ ودو سے ڈھونڈا تھا۔ کامران مرزا وجیہہ و شکیل بھی تھا اور ایک سلجھا ہوا نوجوان بھی، اچھا گھر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی تھا اور اس کے پاس اچھی جاب بھی، انہوں نے خوب چھان پھٹک کر رشتہ کیا تھا۔ باقی کہتے ہیں قسمت زور آور تھی جو منا ہل اور کامران مرزا کی جوڑی بن گئی پھر اُن کی اپنی بیٹی کون سا کسی سے کم تھی، خوب صورت، پڑھی لکھی، ہر ہنر سے آراستہ دھیمے مزاج والی منا ہل کے طلب گار خاندان سے اور خاندان سے باہر بہت تھے مگر قرعۂ فال صرف اور صرف کامران مرزا کے نام ہی نکلا تھا۔

''اُف بڑے بکس تو رہ ہی گئے، تین سفری بکس بھی تو ہونے چاہئیں۔ اللہ خیر کرے، کامران میاں کی رشتے داری دور دراز کے شہروں میں ہے۔ میری بیٹی جب اس کے ساتھ جایا کرے گی تو کیا اِدھر اُدھر سے بیگ یا بکسے مانگا کرے گی۔'' انہوں نے چیزوں کی لسٹ بناتے ہوئے گھبراہٹ میں سر پر ہاتھ مارا تھا۔

''بیگم اور سوچ لیں اور کیا کیا رہ گیا ہے؟'' ظفری صاحب ان کے پاس ہی بیٹھے کسی حساب کتاب میں مصروف تھے' ان کی بات سن کر مسکرا کر بولے تھے۔

''سوچ رہی ہوں مگر اس وقت تو اور کچھ یاد نہیں آ رہا۔''

''ہاں، اس وقت تو نہیں مگر تھوڑی دیر بعد آپ کو یاد آ جائے گا یہ چیز بھی رہ گئی ہے فلاں بھی رہ گئی ہے۔'' انہوں نے بیگم کا مذاق اڑایا تھا۔

''ابو جی جب تک منا ہل اس گھر سے رخصت نہیں ہو جاتی یہ شاپنگ کا سلسلہ تو جاری رہے گا۔'' محسن بھی چائے کا کپ لے کر ماں کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''ہاں تو ماشاء اللہ اس کے بھائی اور باپ زندہ سلامت رہیں اور جگ جگ جئیں جو اتنا تو کما رہے ہیں کہ بٹیا رانی کو آرام سے رخصت کر سکتے ہیں۔'' بوا بھی کچن کا کام سمیٹ کر اُن کے پاس چلی آئی تھیں۔

''سب پر اللہ خیر کرے بوا ...... یہ تو تم نے پتے کی بات کہی۔'' باہر سب لوگ یہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی اپنی فکریں تھیں' اپنے مسائل تھے جو ہر بیٹی کی شادی پر والدین کے ہوتے ہیں مگر اپنے کمرے میں بند منا ہل ان سب فکروں سے بے نیاز ان سب مسئلے مسائل سے ماورا کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔ جب سے کامران مرزا سے منسوب ہوئی تھی تب سے دل و دماغ اس انجانے شخص کے قبضے میں جاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ کورے اور صاف ستھرے جذبوں پر جو پہلی تصویر ثبت ہوئی تھی وہ کامران مرزا کی ہی تھی۔ خیالوں ہی خیالوں میں اس نے کتنے شیش محل تعمیر کر لیے تھے جس میں بس وہ اور کامران مرزا بستے تھے، بس وہ تھے اور ان کی محبت۔

جب سے شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی تب سے اس کی تصویر منا ہل کے تکیے کے نیچے دبی رہتی تھی جونہی رات کا پہلا پہر شروع ہوتا وہ تصویر تکیے کے نیچے سے نکل کر اس کے موی ہاتھوں میں آ جاتی پھر اس تصویر کے چہرے پر آنکھیں بولنے لگتیں لب کلام کرنے لگتے اور منا ہل گھنٹوں اس سے باتیں کیے جاتی۔

پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب منا ہل کو بابل کے گھر سے رخصت ہونا تھا۔ دو دن پہلے دو ٹرک بھر کر اس کا جہیز سسرال پہنچایا جا چکا تھا۔ سسرال میں بھی بہت واہ واہ ہوئی تھی اور اس کے اپنے خاندان والوں نے بھی اس کی قسمت کو رشک و حسد سے دیکھا تھا۔ جس دن اس کے جہیز کا سامان گھر سے اٹھوایا گیا تھا اس دن بے حد مہمانوں کے ہونے کے باوجود سارا



گھر خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔ اسی دن سے بچھوڑے اور جدائی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے اور جس دن وہ خود رخصت ہوئی تھی اس دن تو اداسی اور جدائی گویا ہر شے سے لپٹ لپٹ گئی تھی، ماں غمزدہ تھی تو بابل کی آنکھیں بھی اشک بار یہ گھڑی ہی ایسی ہوتی ہے جان سے عزیز دل کے بہت قریب جگر کا ٹکڑا جب اپنے ہاتھوں اپنی خوشی سے کسی دوسرے کو سونپنا پڑتا ہے تب تو گویا بدن سے جان نکلنے والا حال ہوتا ہے۔

وہ بیاہ کر کامران مرزا کے آنگن میں آئی تو اس کے لیے فرش پر پھول نہیں گویا پلکیں بچھائی گئی تھیں۔ اس کی ساس نندوں اور سب رشتے داروں نے اس کو خوب اچھے طریقے سے خوش آمدید کہا تھا اور اپنے اپنے طریقے سے اسے ہر طرح کی یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ بیاہ کر غیروں میں نہیں اپنوں میں ہی آئی ہے۔ اس نے اپنا گھر نہیں چھوڑا اپنے گھر سے اٹھ کر اپنے ہی گھر میں چلی آئی ہے۔ اس کے سارے خدشے ہوا ہو گئے تھے چند گھنٹوں پہلے تک کا خوف آہستہ آہستہ زائل ہونا شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنی قسمت پر رشک کرنے لگی تھی کہ جسے اتنا اچھا گھرانہ اور اتنے اچھے لوگ ملے تھے پھر شام ڈھلی اور رات کی سیاہی ہر سو پھیل گئی تھی تب کامران مرزا بڑی فرصت کے ساتھ اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اس کے تکیے کے نیچے دھری ہوئی تصویر آج مجسم ہو کر اس کے پاس آ گئی تھی مگر آج دل و دماغ کی عجب ہی کیفیت تھی، شرم و حیا سے پلکیں بوجھل اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے جب سلام کیا حال چال پوچھا اور رونمائی کے طور پر انگوٹھی اس کے ہاتھ میں ڈالی تب تو گویا دل کے دھڑکنے کی رفتار ایسی تھی کہ دل ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے گرم ہاتھوں سے واپس کھینچا تھا اور اس مزاحمت پر کامران مرزا کے چمکتے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ ماشاء اللہ کیا رنگ و روپ ہے۔'' کامران مرزا کے تو منہ سے یہ صرف الفاظ نکلے تھے مگر اس کی تو زندگی بن گئے تھے۔ سہاگن تو وہی ہوتی ہے جسے پیا من چاہے اور آج وہ وہی خوش قسمت سہاگن تھی جسے اس کا پیا خوب سراہ رہا تھا خوب ہی چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

کامران مرزا بہت اچھا انسان بہت اچھا ساتھی ثابت ہوا تھا مگر اس میں ایک خامی تھی اور جو کبھی کبھی بہت بڑی بڑی خوبیوں پر حاوی ہو جاتی تھی اور وہ تھی وہ کانوں کا بہت کچا تھا اور ماں بہنوں کی باتوں پر تو آنکھیں بند کر کے یقین کرتا تھا۔ شادی کی پہلی رات ہی اس نے منا ہل سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت پیار کرتا ہے اور اس سے بھی توقع کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے تاکہ اس گھر کا سکون قائم و دائم رہے۔ منا ہل نے اس کی اس رضا پر پورے دل سے سر جھکا دیا تھا۔ اس کی بھی ماں تھی اس کی اپنی بہن بھی تھی اس نے دل میں یہی سوچ لیا تھا کہ جیسے رشتے وہ پیچھے چھوڑ آئی ہے یہ سب بھی ویسے ہی ہیں اور پھر جب اس کا شوہر اسے کہہ رہا ہے تو اس کا حکم ماننا اس پر اور بھی فرض ہو گیا تھا مگر دلہناپے کے دن تمام ہوتے ہی اس نے جب سے عملی زندگی اور گھرداری میں قدم رکھا تھا تب اس کو احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ یہ سب کہنا آسان ہے اور کرنا بے حد مشکل۔

کامران مرزا اکلوتا بھائی ہے اور ماں بہنوں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اس پر ایسے قبضہ جما رکھا ہے کہ وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتی ہیں۔ پہلے پہل تو اس نے اتنا ان رویوں پر غور نہیں کیا مگر جوں جوں دن گزرتے رہے اس نے جانا کہ کامران مرزا تو پورے کا پورا اس کو ملا ہی نہیں..... جسمانی طور پر وہ ضرور اس کے پاس ہوتا ہے مگر وہ دل اور دماغ ماں اور بہنوں کے پاس ہی چھوڑ آتا ہے۔ وہ جو کہتی ہیں وہ کرتا ہے جو چاہتی ہیں ویسا ہی ہوتا ہے اور جو اسے دکھاتی ہیں وہ ویسا ہی دیکھتا ہے۔ اپنی نظر اپنے کان اپنا دل اور دماغ اس کے پاس کچھ نہیں ہے سب ماں اور بہنوں کے پاس گروی رکھا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے بہت مشکل اور تکلیف دہ تھی۔ مثال کے طور پر اگر وہ کامران کے ساتھ کہیں باہر جانا چاہتی تو وہ راضی ہوتا اس کو ساتھ لے جانے میں ایسے میں اگر ماں ٹوک دیتی یا کسی بہن کو اپنا کام یاد آجاتا تو اس کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ کامران ان کے کام کرنے نکل جاتا اور وہ تیار ہو کر اس کا انتظار کرتی رہ جاتی۔ پہلے پہل تو اس نے زیادہ توجہ نہیں دی اور یہی سمجھتی رہی کہ اس کے کام سے زیادہ ضروری ان لوگوں کے کام ہوں گے مگر جب ایسا اتفاقاً نہیں جان بوجھ کر بار بار ہونے لگا اور ساتھ ہی اگر کامران آفس سے آکر سیدھا اپنے کمرے میں آجاتا یا گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آواز دے لیتا تو پھر تو ساس کی تیوریاں چڑھ جاتیں اور شام تک کامران کو اتنا مصروف رکھا جاتا کہ اسے اپنے کمرے میں جانے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ بہت پریشان تھی مگر جلنے کڑھنے کے سوا کیا کر سکتی تھی، وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی اور صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی مگر پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''مجھے بس آج ہی امی کی طرف جانا ہے۔'' وہ تیار ہو کر بیٹھی تھی اور کامران عین وقت پر حسبِ معمول چھوٹی بہن کے دوپٹے رنگوانے جا رہا تھا۔

''میں نے کہا نا کل جائیں گے، مجھے بازار سے واپس آکر امی جان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہے۔ آج کل آفس میں مصروفیت اتنی رہی ہے کہ ان کو بہت کم وقت دے پاتا ہوں۔''

''کامران پلیز، یہ بہانے بازیاں بند کریں۔ مجھے لے کر جانا ہے تو لے جائیں ورنہ میں رکشا سے چلی جاؤں گی، میری امی کی طبیعت خراب ہے اور آپ کے غیر ضروری کام ہی ختم ہونے میں نہیں آرہے ہیں۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''بھابی میرے کام کیا غیر ضروری ہو گئے ہیں؟'' اس کی ساس نندیں تو اس کے کمرے کی دیوار سے لگی رہتی تھیں اِدھر اس نے بات کی اُدھر انہوں نے تاک کر نشانہ مارا۔ چھوٹی نے فوراً ہی دروازے میں کھڑے ہو کر جواب دیا تھا۔

''میرا مطلب تھا کہ دوپٹے تو کل بھی رنگوائے جا سکتے ہیں، آج ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا دل وضاحت دینے کو تو نہیں چاہ رہا تھا مگر سسرال میں نہ چاہتے ہوئے بھی سو باتوں کی وضاحت دینا پڑتی ہے۔

''آپ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں، آپ نے کہا تھا کہ غیر ضروری کام..... مان لیا کہ شادی کے بعد بھائی لوگ بدل جاتے ہیں اور ان کے بیچھے آپ جیسی بھابیاں ہی ہوتی ہیں مگر خدارا ہمارا ایک ہی بھائی ہے، ان کو اتنا نہ پھیریں کہ ہم ان سے بات کرنے سے بھی جائیں۔'' بے شک وہ عمر میں چھوٹی تھی مگر گنوں میں پوری تھی۔ اسد نے کھڑے کھڑے بات کا بتنگڑ بنا لیا تھا۔



''دیکھو ناہید، میری ایک چھوٹی سی بات کو افسانہ مت بناؤ۔ میں کوئی جھگڑا نہیں چاہتی اور ویسے بھی تمہارے بھائی صاحب نہیں بدل سکتے تم یہ فکر ذہن سے نکال دو، یہ جتنا خیال تم لوگوں کا کرتے ہیں بیوی کا ہرگز نہیں کرتے۔'' آج سے پہلے اس نے کبھی اس طرح بحث نہیں کی تھی مگر آج امی کی بیماری کا سن کر وہ ان کو آئینہ دکھانے کھڑی ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا، کیا شور ہے؟'' اتنے میں ساس صاحبہ بھی خراماں خراماں تشریف لے آئی تھیں۔

''امی جان بھابی کہہ رہی ہیں ہم افسانے بناتے ہیں اور بھائی جان کو ہم نے قابو کر کے رکھا ہوا ہے اور یہ ہمارا خیال کرتے ہیں ان کا نہیں۔ امی جان بھابی نے اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔'' چھوٹی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ماں کو بھی بھڑکا دیا۔

''میرا تو سیدھا سادہ بیٹا جس طرح اس نے قابو کر کے رکھا ہوا ہے کیا کسی نے کیا ہوگا۔ میں تو معصوم صورت دیکھ کر بیاہ کر لائی تھی، کیا خبر تھی اس معصوم صورت کے پیچھے کیسا چہرہ ہوگا۔''

''کامران پلیز امی جان کو منع کریں..... یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا ناہید نے تو ایسے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔'' لڑائی سے اس کی جان جاتی تھی امی کا پارہ ہائی ہوتا دیکھ کر اس نے کامران کی طرف دیکھ کر کہا تھا کہ وہی اپنی امی اور بہن کو چپ کروا سکتا ہے مگر کامران کے لب خاموش تھے، وہ بیوی کے سامنے کہاں ماں اور بہن کو کچھ کہہ پاتا تھا۔

''امی جان پلیز میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا آپ تو خوامخواہ...'' کامران کو خاموش دیکھ کر اسے خود ہی اپنا دفاع کرنا پڑا تھا۔ یہ الگ بات کہ آنسو پھسلنے لگے تھے اور آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کی ساس اور نندیں دونوں بے تحاشا بول کر چلی گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جب کامران دوپٹے اٹھا کر رنگوانے چلا گیا تو اس نے خاموشی سے چادر اوڑھی اور رکشے میں بیٹھ کر ماں کی طرف آگئی۔

امی کا بلڈ پریشر ہائی تھا اور بخار بھی بہت تیز تھا۔ دو تین دن تو اسے ماں کی تیمارداری سے ہی فرصت نہ ملی پھر جب ان کی طبیعت سنبھلی تو انہوں نے کامران کی بابت پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آیا تو منال نے ساری بات ماں کو بتا دی۔ اب وہ یہ سب سہتے سہتے تھک چکی تھی۔ ماں کو بتا کر گویا دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

''منال تم نے یہ کیا بے وقوفی کی..... تمہیں اس طرح شوہر اور ساس کو بتائے بغیر گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ تمہارے بارے میں اور ہماری تربیت کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ منیر ادھر آؤ اور ابھی بہن کو اس کے گھر چھوڑ کر آؤ۔'' منال کو بڑھاوا دینے کے بجائے انہوں نے اسے ڈانٹ دیا تھا اور ساتھ ہی اپنے بیٹے کو بلایا تھا کہ وہ منال کو ابھی اور اسی وقت چھوڑ آئے۔

''امی جان، میں چلی جاؤں گی ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کچھ دن تو رہنے دیں۔'' منال بیمار ماں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔

''مجھے کیا ہوا ہے، بالکل بھلی چنگی ہوں، اٹھو تم منہ ہاتھ دھو لو اور اپنے کپڑے وغیرہ رکھ لو منیر تمہیں چھوڑ آتا ہے۔'' وہ بے دلی سے اٹھ کھڑی ہوئی کچھ غصہ بھی تھا کہ جس دن سے وہ آئی تھی اس دن سے کامران نے کوئی فون کیا تھا نہ وہ اس کے پیچھے خود آیا تھا ایسی بھی کیا ناراضی وہ ایک فون تو کر سکتا تھا بہرحال وہ خود ہی آئی تھی اور خود ہی ماں کے کہنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر چل پڑی تھی۔

☆☆☆

”بھیا بہو بیٹیوں کی تربیت ایسے کی جاتی ہے کہ جب اور جیسے چاہو منہ اٹھا کر گھر سے نکل پڑو۔ ہمارے خاندان میں یہ رواج نہیں ہے جیسا کہ تمہاری بہن نے کیا ہے۔ وہ تو اس کا میاں بہت گرم تھا اور اس کی ایسی حرکت پر کوئی انتہائی قدم اٹھانا چاہتا تھا مگر میں نے اس کو ایسا کرنے سے روک دیا، آخر میری بھی بیٹیاں ہیں مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ ہماری بہورانی اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتی نہیں ہے۔“ اس کی ساس صاحب نے منیر بھائی کو خاصی میٹھی میٹھی سنائی تھیں۔ وہ شرمندہ ہوتی رہی تھی اور منیر بھائی پہلو بہ پہلو بدلتے رہے تھے چونکہ ان کو بہن کا گھر بھی بسانا تھا اس لیے اس کی ساس صاحب کو کیا کہتے۔

”آنٹی اس بار جو بھی غلط فہمی ہوئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم نے مناہل کو بہت سمجھایا ہے آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گی۔“ منیر بھائی نے جب تک یہ سب نہیں کہا تب تک انہوں نے ان کی جان نہیں چھوڑی تھی۔

”السلام علیکم! کامران کمرے میں ہی تھا اور بیڈ پر نیم دراز بڑے انہماک سے ٹی وی پر مووی دیکھ رہا تھا۔ چونکہ اس کی ساس اس کو سنا چکی تھیں کہ باقی سب گھر والوں کی طرح اس کے میاں کا موڈ بھی خراب ہے تو اب جبکہ وہ سب کچھ بھلا کر یہاں تک آچکی تھی تو سب کے خراب موڈوں کو مدنظر رکھتے ہوئے منانے میں پہل بھی اسے ہی کرنی تھی۔ کامران نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی اور سلام کا جواب دیے بغیر منہ پھلا لیا تھا۔ اس نے کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنی شروع کر دی تھیں

اس کو ادھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھ کر بھی کامران نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا بلکہ اب اس نے ٹی وی آف کر کے بازو سر پر رکھا تھا اور لیٹ گیا تھا۔

”کیا ہوا، نیند آرہی ہے؟“ کچھ دیر بعد مناہل خود ہی ڈھیٹ بن کر اس کے پاس آئی تھی اور اس کا بازو ہٹا کر پوچھنے لگی تھی۔ جواباً کامران مرزا نے لال لال آنکھوں سے اس کو گھورا تھا۔

”کیا ہوا...... ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ کچھ گڑبڑا کر پوچھنے لگی تھی۔ جان سے زیادہ پیار کا دعویٰ کرنے والے شوہر کی آنکھیں اس طرح بدل جائیں تو حیرانی تو ہوتی ہے۔

”دیکھ رہا ہوں محترمہ مناہل کامران مرزا کب سے اتنی بہادر ہوگئیں کہ بڑے بڑے فیصلے کرنے لگ گئیں۔“ وہ بندہ جو ماں بہنوں کے سامنے سانس بھی آہستہ سے لیتا تھا بیوی کے سامنے شیر بنا بیٹھا تھا۔

”میں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ امی جان کا پتا کرنے گئی تھی، آپ لینے آئے نہ آپ نے فون کیا، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ میرے ساتھ اس طرح کریں گے۔“ اس کے بھی جو دل میں تھا اس نے کہہ دیا۔

”امی جان کا پتا کرنے کس کی اجازت سے گئی تھیں، تم سے تو اتنا صبر نہ ہوا کہ ایک دو دن ٹھہر جاتیں، مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں جو شوہر کو کچھ نہیں سمجھتیں اور اپنا آپ دکھانے اور منوانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔“ ماں بہنوں نے اتنے دنوں میں جو بھی اس کے کانوں میں انڈیلا تھا وہ آج مناہل کو سامنے پا کر باہر آرہا تھا۔

”کامران میری امی بہت بیمار تھیں، میں ان کا پتا کرنے چلی گئی تو کون سی قیامت آگئی، آپ تو



دو چار دن ٹھہر کر جانے کا ایسے کہہ رہے تھے جیسے میں وہاں کسی ایمرجنسی میں نہیں بلکہ سیر سپاٹے کے لیے جارہی تھی۔“ وہ روہانسی ہوگئی تھی آخر اس کا شوہر اس کی بات سمجھ کیوں نہیں رہا تھا۔

”بہرحال جو کچھ بھی تم نے کیا اچھا نہیں کیا...... امی جان کہہ رہی تھیں اس گھر میں جوان بہنیں بھی ہیں میری۔ ان پر تمہارے اس فعل سے کیا اثر پڑے گا، وہ بھی اپنے اپنے سسرال جا کر یہی وتیرہ اپنائیں گی۔“

”کامران میں......“

”بس اب آگئی ہو تو ٹھیک ہے...... کس بحث میں پڑی ہوئی ہو، ایک غلطی کی ہے اور اس پر طرہ کہ باتیں بھی نہیں ہو۔“ کامران نے اس کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اٹھ کر اپنے کپڑے بیگ سے نکالنے لگی تھی۔ ویسے بھی اب اپنی صفائی میں کچھ کہنا بیکار ہی تھا۔

☆☆☆

وہ ماں بننے کے خوش کن مراحل طے کر رہی تھی سب بہت خوش تھے، کامران بھی بہت خوش تھا۔ مناہل بھی سب کچھ بھلا کر سب کی خوشی میں خوش اور اپنے ہونے والے بچے کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔

”کامران کے بعد میرے کان دوبارہ بچے کی آواز سننے کے لیے ترستے رہے، اب میں اپنا پوتا دیکھوں گی، اسے گود میں کھلاؤں گی اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنوں گی تو میں بیان نہیں کر سکتی وہ کس خوشی کی گھڑی ہوگی۔“ امی جان سب کو پاس بٹھا کر ہمہ وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ بھی جب تنہا ہوتی تو بیٹے کا تصور کرتی ساتھ ہی اک ننھی منی سی

گڑیا گلابی گالوں والی ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر اس کی گود میں آنے کو ہمکتی تو اس سے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ اسے بیٹے کی شدت سے چاہ ہے یا بیٹی کی۔ پھر وہ سوچتی کہ اولاد تو ہر ماں کو ایک جیسی عزیز ہوتی ہے خواہ وہ بیٹی ہو یا بیٹا...... وہ تو بس رب کریم کا اس بات پر شکر ادا کرتی رہتی تھی کہ اس آنے والے ننھے مہمان کی وجہ سے گھر کی کشیدگی کچھ تو ٹلی ہے اور شوہر سمیت سب اس کا خیال رکھتے ہیں۔

پھر وہ ہو گیا جس کا تصور کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس دن چھوٹی نند کپڑے دھو رہی تھی کپڑے دھونے کے بعد اس نے صابن والا پانی فرش پر گرا کر فرش دھو دیا۔ وہ سدا کی کام چور اس نے صابن والا پانی اچھی طرح صاف نہیں کیا تھا مناہل کی بدقسمتی کہ وہ کسی کام سے صحن میں آئی اور اس کا پاؤں پھسل گیا پھر اس کی چیخوں نے در و دیوار ہلا دیے تھے۔ ایسا درد تھا جسم و جاں میں کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ ہوش آیا تو اپنا سب کچھ لٹا کر اسپتال کے سفید بستر پر پڑی تھی اور بس کامران پاس بیٹھا تھا یا اس کی اپنی ماں......

”مت رو میری جان! اللہ اور دے گا، شکر کرو تمہاری جان بچ گئی۔“ اپنے نقصان کا سن کر اس کی تو آنکھیں ساون برسانے لگی تھیں۔ درد جو تھم گیا تھا پھر بڑھنے لگا تھا۔ گود بھرنے سے پہلے ہی اجڑ گئی تھی اسے کسی پل چین و قرار نہیں آتا تھا۔ اس کی امی نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی تھی ساتھ لگایا تھا آنسو پونچھے تھے اور بے تحاشا پیار کیا تھا جبکہ کامران تھس سامنے دھری کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔

”میں اسے ساتھ لے جارہی ہوں، جب اس کی صحت اچھی ہوگی تو یہ اپنے گھر آجائے گی۔“ اسپتال سے جب چھٹی ملی تو اس کی امی اسے اپنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ لے آئی تھیں کیونکہ وہ اس کے میاں اور ساس نندوں کا سلوک اچھی طرح دیکھ چکی تھیں۔ انہیں تو اپنی بیٹی کی جان ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی اس لیے ان کا دل ہی نہ چاہا تھا کہ وہ اسے اس حال میں چھوڑ کر جائیں۔

''چلو بڑے دن آرام کرلیا ہے، اب کچھ گھر بار کی بھی خبر لو، آخر کتنے دن یہاں رہو گی۔'' وہ دھوپ میں بیٹھی مزے سے کینو چھیل کر کھا رہی تھی جب کامران مرزا چلا آیا تھا گو کہ اس کی صحت اب کافی بہتر تھی مگر کمزوری ابھی بہر حال باقی تھی۔ جس طرح اس کے گھر والوں نے اس کا خیال رکھا تھا اور اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر سنبھالا تھا یہ اسی کا ثمر تھا کہ وہ دنوں میں اپنے پیروں پر واپس آ گئی تھی۔

''میں کون سا خوشی سے یہاں رہ رہی ہوں۔'' وہ تلخی سے بولی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ اس کے شوہر اس کے دکھ سکھ کا ساتھی اسے تسلی دے، پیار کرے اور جو نقصان ہو گیا اس کے بارے میں اس کے درد کو اپنے الفاظ سے کم کردے مگر کامران کا رویہ تو ایسا تھا جیسا یہ سب اس نے جان بوجھ کر کیا ہے۔

''چلو مان لیا خوشی سے نہیں رہ رہی ہو پھر بھی اب گھر چلنے کی تیاری کرو۔''

''کامران دو تین دن اور رہنے دیں پھر میں خود ہی آجاؤں گی۔'' اس نے لجاجت سے کہا تھا۔

''نہیں، تمہیں میرے ساتھ ہی جانا ہے۔ امی جان نے کہا تھا ساتھ لے کر آنا۔'' کامران مرزا کے لیے امی جان کا کہا حرفِ آخر تھا سو اسے ہر قیمت پر منابل کو ساتھ لے کر ہی جانا تھا۔ منابل خاموشی سے اٹھ کر اپنا سامان پیک کرنے لگی تھی کیونکہ جانتی تھی امی جان نے کہہ دیا ہے تو کامران اب اسے مزید نہیں رہنے دے گا۔

وہ اپنے گھر واپس آئی تو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی کیونکہ دیوار پر خوب صورت بچوں کی تصاویر آویزاں تھیں جو شاید اب اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''اب کیوں رو رہی ہو، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' وہ گھر آئی تو سب اپنے کمروں میں بند تھے کوئی اس کا استقبال کرنے والا نہیں تھا۔ کامران جانے کس جذبے کے تحت اٹھا اور فریج سے کولڈ ڈرنک کا گلاس بھر لایا اور اس کے قریب بیٹھ کر اسے روتے دیکھ کر کہنے لگا تھا اور ساتھ ہی گلاس اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا تھا۔ کامران کے اتنا کہنے کی دیر تھی وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر مزید رو پڑی۔ اسے شاید ایسے کندھے کی تلاش تھی جس کے سہارے وہ اپنا درد نکال سکے۔

''چپ کرو پھر طبیعت خراب کرلو گی، بچوں کا کیا ہے اللہ پاک اور دے گا، صبر کرو۔'' اس کے دکھ کو کامران نے سمجھا یا نہیں سمجھا مگر اس نے اسے اپنے ساتھ لگا کر ڈھیروں ڈھیر تسلی دی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے اور کولڈ ڈرنک کا گلاس اس کے لبوں سے لگا کرتا دیر اس کے ہاتھ سہلاتا رہا تھا۔ اس لمحے منابل کی اذیت بھی کم ہو گئی تھی۔ اس کے آنسو رک گئے تھے اور وہ کئی لمحوں تک کامران سے اپنے بچے کی باتیں کرتی رہی تھی۔

''بی بی تم ہماری تو کوئی خوشی نہیں دیکھ سکتی ہو مگر ایسی اجڑی صورت سے اس گھر میں نحوست نہ ڈال دینا، سر جھاڑ منہ پھاڑ ایسے پھرتی ہو جیسے یہاں انسان نہیں بستے کوئی اور بستا ہے۔'' وہ پچھلے صحن میں بیٹھی چوکیدار کے ننھے ننھے بچوں کو کھیلتا دیکھ



رہی تھی جانے کیسے آنسو بہنے لگے تھے، اس کی ساس اس کے سر پر پہنچ کر بولی تھیں، وہ فوراً آنسو پونچھ کر وہاں سے ہٹ گئی اور منہ پر پانی کے چھینٹے ڈال کر کچن میں آ گئی۔

''بھابی تو اسٹار پلس کا روتا دھوتا کردار بن کر رہ گئی ہیں۔'' چھوٹی نند نے قہقہہ لگایا تھا اور اس پل منابل کا دل چاہا کہ جو دودھ وہ کچن میں رکھ کر ابال رہی ہے وہی ابلتا ہوا دودھ اس کے منہ پر ڈال آئے جس نے اس کی کوکھ اجاڑ دی۔ چھوٹی نند کی تمسخرانہ نگاہوں سے کبھی کبھی اسے لگتا تھا اس نے اس دن جان بوجھ کر صابن والا پانی فرش پر گرا دیا تھا تاکہ وہ پھسل جائے مگر ایسا وہ سوچ سکتی تھی کر نہیں سکتی تھی کسی کو نقصان پہنچانا اس کی فطرت کا حصہ ہی نہیں تھا۔

''امی جان یہ کیسے ٹوٹ گیا؟'' اس کا قیمتی ڈنر سیٹ جو اس نے بڑے چاؤ سے خریدا تھا اس وقت اس کی دو پلیٹیں اور ڈش ٹوٹی ہوئی کچن میں پڑی تھیں۔ اس نے تو ویسے ہی پوچھا تھا مگر اس کا پوچھنا قیامت ہو گیا تھا۔

''ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی مگر بہو اگر تم کہتی ہو تو آئندہ ہم تمہاری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ اٹھو ناہید اس کے سارے برتن سمیٹ کر الماری میں رکھ دو، لوگ اسی دن کے لیے تو بیٹے بیاہتے ہیں کہ نکے نکے کی لڑکیوں سے باتیں سن لیں۔ اپنی چیز کا مان ہوتا ہے پرائی چیز پر کیا ان ... اس دن میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ مہمانوں کے لیے اپنا ہی گھر والا سیٹ نکال دو مگر نہیں تو فکر تھی کہ بھائی کے آفس سے لوگ آئے ہیں، اچھے برتن ہونے چاہئیں لو اب سن لو باتیں۔''

''امی مجھے کیا پتا تھا بھابی ایسا کہیں گی۔'' وہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھ کر کچن میں چلی آئی جہاں جا کر اس نے منابل کے جہیز کے برتن سمیٹنے شروع کر دیے تھے۔

''ناہید رہنے دو، میرا یہ مطلب تو نہیں تھا، یہ چیزیں استعمال کرنے کے لیے ہیں رہنے دو۔'' وہ تو ایک ذرا سا پوچھ کر پھنس گئی تھی اسے کیا پتا تھا کہ وہ لوگ تو اس کے خلاف محاذ کھڑا کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔

''نہیں بھابی، آپ انہیں سنبھال کر رکھ لیں۔'' اس کے منع کرنے کے باوجود ناہید نے سب کچھ سمیٹ کر الماری میں رکھ دیا تھا۔

''ہم لوگوں نے تمہارے باپ سے جہیز مانگا نہیں تھا، ہمیں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جب تمہارے برتن اس گھر میں نہیں آئے تھے تو گویا ہم بغیر برتنوں کے ہاتھوں میں رکھ کر کھانا کھاتے تھے۔''

شام کو کامران کمرے میں آتے ہی اس کے سر پر کھڑا گرج رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں ایک پل نہیں لگا تھا کہ اس کے کان ان لوگوں نے آتے ہی بھر دیے ہیں۔

''کامران آپ میری بات تو سن لیا کریں کہ کیا ہوا ہے، میں نے کچھ نہیں کہا بس کچن میں ٹوٹے برتن دیکھ کر پوچھا ہی تھا کہ کیا ہوا ہے، آگے تو بس ایک لفظ بھی نہیں بولی، آپ پتا نہیں کیا کچھ کہے جا رہے ہیں۔''

''ہاں سارے جہاں میں ایک تم ہی سچی ہو میری ماں بہنیں تو جھوٹ بولتی ہیں، منابل تمہارا مسئلہ کیا ہے، کیوں ہر وقت گھر میں اِک محاذ کھڑا رکھتی ہو؟'' وہ کچھ بھی کہہ لیتی کامران نے اس کی بات سننی ہی نہیں تھی۔

''پہلے تو میں نہیں کہتی تھی مگر اب کہتی ہوں ہاں، ہاں وہ جھوٹ بولتی ہیں، مجھ پر الزام لگاتی ہیں اور آپ بھی اُن کی باتوں میں آ کر مجھے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر لیتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ قصور میرا ہے یا ان کا۔'' آج وہ بھی پھٹ پڑی تھی۔

''بکواس بند کرو، انہیں کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی یا تم پر الزام لگانے کی؟''

''نہ میاں ہمیں کیوں ضرورت نہیں ہے، ہم اسے بیاہ کر لے آئے، اپنے اکلوتے چاند کی دلہن بنا کر اسے سر آنکھوں پر بٹھایا اسے عزت دی، مان دی یہ ہمارا بہت بڑا قصور ہے، تبھی تو ہمیں ضرورت ہے اس پر الزام لگانے کی، جھوٹ بولنے کی، ہمارا دماغ جو خراب ہے۔'' امی جان نے بروقت انٹری دی تھی اور ٹھنڈے پڑتے بیٹے کو بری طرح بھڑکا دیا تھا۔

''امی جان آپ نے مجھے عزت دی، مان دیا تو میں نے بھی آپ کو ماؤں کی طرح چاہا مگر آپ کے کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی بیوی بنا کر لائے تھے تو پھر اسے برداشت بھی کرنا تھا۔ مائیں بیٹے بیاہ تو لیتی ہیں مگر پھر بہوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ پاتیں۔'' اس نے پہلی بار ساس کو آئینہ دکھایا تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' کامران مرزا دہاڑا تھا اور ساتھ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور گال پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا آخر اسے ماں کے سامنے سرخرو بھی تو ہونا تھا۔

''ہونہہ... بڑی آئی کہیں کی مجھے باتیں سنانے والی۔'' ساس صاحبہ بیٹے سے بہو کو پٹوا کر اٹھلاتی ہوئی چلی گئیں۔

''کچھ دنوں کے لیے اسے ماں کے گھر چھوڑ آؤ جب تک اس کی عقل ٹھکانے نہیں آتی تب تک وہیں رہے تو اچھا ہے۔'' جاتے جاتے بیٹے کو حکم بھی دے گئی تھیں۔

☆☆☆

''منابل افطاری کا وقت ہونے والا ہے، اس طرح باہر کیوں بیٹھی ہو اندر آ جاؤ۔'' اسے میکے آئے ہوئے دوسرا مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ کامران ماں کے کہنے پر اسی دن اسے چھوڑ گیا تھا اور آج تک پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ اس نے اپنے گھر والوں کو ساری بات من و عن بتا دی تھی اب اتنے بے غیرت تو وہ لوگ نہ تھے، نہ ہی اپنی بیٹی کی دو روٹیاں ان پر بھاری تھیں کہ وہ بنا قصور گھر سے نکالی جانے والی بیٹی کو دوبارہ ہاتھ پکڑ کر اُن کے در پر چھوڑ آتے۔ پہلے ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ منابل کو ہی قصور وار ٹھہراتے تھے اور اسے گھر واپس بھیج دیتے تھے مگر اب کی بار منابل جانے پر رضامند نہیں تھی۔ منیر بھائی نے اسے باہر سیڑھیوں پر گم صم بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔

''منابل اندر آ جاؤ، تمہارے بھائی تمہیں بلا رہے ہیں۔'' اس کی بھابی نے افطاری کے لیے ٹیبل سیٹ کرتے ہوئے اسے آواز دی۔ وہ اٹھی اور ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھی تھی۔ وہ دو ماہ سے معمولاتِ زندگی انجام تو دے رہی تھی مگر اس طرح کہ اس کا دل مرجھا سا گیا تھا۔ کوئی خوشی، کوئی امید کچھ بھی تو پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ بیٹیوں کو ٹرک بھر بھر جہیز دیتے وقت ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس طرح ان کی بیٹی کا مقدر بھی بھر جائے۔ سسرال میں اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو مگر جنہیں تکلیف دینا ہوتی ہے وہ کہاں کچھ دیکھتے ہیں کہ بیٹی والوں نے نہ صرف ہیرے جیسی گڑیا اُن کی جھولی میں ڈالی ہے بلکہ خون پسینے کی کمائی سے ان کا گھر بھی بھر دیا ہے۔ وہ یہ کچھ نہیں دیکھتے، وہ تو بس حاکم بن جاتے ہیں اور لڑکی والے محکوم ہی رہتے ہیں۔

''شام تک تیار رہنا آج..... تم، میں اور منابل عید کی شاپنگ کے لیے جائیں گے۔ امی جان سے بھی پوچھ لینا انہیں کیا کیا چاہیے؟'' منیر بھائی نے آفس جاتے ہوئے بھابی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم لوگ تیار ہو جائیں گے۔'' بھابی نے سر ہلا کر کہا تھا۔

عید کی آمد قریب تھی۔ لوگ جوش و خروش سے عید کی تیاریوں میں مصروف تھے مگر اس کا دل تو ہر چیز سے اچاٹ سا تھا، کامران سے اسے بہت گلے تھے تو ساتھ ساتھ اس کا بہت انتظار بھی تھا کہ شاید اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اسے لینے آ جائے۔ عید پر تو ظالم سے ظالم لوگ بھی دل کی رنجش دور کر لیا کرتے ہیں۔ وہ بھی روز اس کا انتظار ہی کرتی رہ جاتی تھی مگر شاید اس کو ابھی گھر والوں کی طرف سے منابل کو لانے کی اجازت نہیں تھی۔

بھابی کب سے اسے بازار جانے کے لیے آوازیں دے رہی تھیں وہ بے دلی سے کپڑے بدلنے چل دی حالانکہ دل میں اِک ٹیس سی اٹھی تھی جو یہ کہہ رہی تھی۔

یہ چاندنی کھلی ہوئی
ہزاروں سال سے یونہی
کہیں ہنسی کہیں خوشی
ہزاروں رنگ میں ملی
مگر نظر کی تشنگی
کسی طرح نہ مٹ سکی
ہمارے واسطے بھی تو
یہ عید خوش نصیب ہو
جو تم ملو تو عید ہو
جو تم ملو تو عید ہو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناول

قسط: 7

# ایک تھی نیناں

راحت وفا

کچھ کھٹی سی، کچھ میٹھی سی... کبھی شعلہ سی... کبھی شبنم سی... تھوڑی بھولی سی... تھوڑی نادان سی... محبت، نفرت اور اعتبار کے تکون میں سرگرداں... رشتوں کے ٹکراؤ اور الجھاؤ کی داستان... جس میں بھول اور نادانی کی کسک اور گناہِ بے لذت کی حقیقت کا اسرار ہر قدم پر کچوکے لگاتا ہے۔

**ایک نابغۂ روزگار، پرتجسس، نفسیاتی اور رومانوی ناول جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا**

گزشتہ قسط کا خلاصہ

خان جی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر مہ جبیں کو لاکھ خواہش اور فرمائش کے باوجود نہ ملازمت کی اجازت ملی اور نہ ذاتی کلینک اور اسپتال بنانے کی اجازت ملی۔ راجا صاحب متوسط طبقے کے بیروزگار نوجوان تھے۔ خان صاحب نے جانے کیا سوچ کر اکلوتی بیٹی ان سے بیاہ دی تجوریوں کے منہ کھول کے جہیز اور بنگلا، گاڑی، خدمت کے لیے مہ جبیں کی ہم عمر ملازمہ سکھاں بھی ساتھ میں رخصت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دی۔ سکھاں کے والدین نے رقم لے کر بیٹی ساتھ بھیج دی۔ بیٹی کے ارمانوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر مہ جبیں کو راجا صاحب نے میٹھی زبان سے رام کیا ان کی خواہش پر بنگلے کے وسیع کشادہ لان میں چھوٹا سا اسپتال نما کلینک بنا دیا یوں مہ جبیں کی خواہش کو راجا صاحب نے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنا دیا۔ دولت بڑھتی گئی مگر مہ جبیں بستر سے لگ گئیں۔ وسیمہ، باپ کی دی ہوئی آزادی اور ناجائز دولت کی ریل پیل سے مادر پدر آزاد ہو گئی۔ بیٹا ریحان اختر بھی اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ وسیمہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کی حادثے کا شکار ہوئی اپنا بیٹا لاوارث چھوڑا۔ پولیس نے بچہ راجا صاحب تک پہنچایا۔ جس کا نام طلال رکھا گیا۔ مہ جبیں کے والدین اور سکھاں کے والدین اپنے آبائی علاقے میں خان جی کے سوتیلے بھائی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ راجا صاحب اور ڈاکٹر مہ جبیں کے انتقال کے بعد ریحان اختر نے بھانجے کی بہت لاڈ پیار سے پرورش کی مگر تشنہ رہ گئے۔ طلال ایک ضدی، ہٹ دھرم نوجوان تھا۔ ریحان اختر نے امیر کبیر گھرانے کی رابعہ سے محبت کی شادی کی، اس سے بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نیناں رکھا گیا۔ نیناں میں ریحان اختر کی جان تھی۔ اچانک رابعہ کو کچھ ایسا ثبوت دیکھنے کو ملا کہ وہ ریحان اختر سے نفرت کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان فصیل قائم ہو گئی۔ نیند کی گولیوں اور اعصابی تناؤ کے کمی کے لیے رابعہ تقریباً ذہنی مریضہ بن گئی مگر ریحان نے وہ ثبوت غائب کر دیے۔ طلال کی نیناں پر نظر تھی جبکہ رابعہ کی بڑی بہن عارفہ کا اکلوتا بیٹا رمان احمر جو کہ ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی میں ریجنل منیجر ہے وہ اور نیناں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر رمان کی پھوپھو کی بیٹی دعا فاطمہ، رمان سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہے لیکن وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے۔ دعا بار بار رمان سے کھلم کھلا نیناں کی وجہ سے وہ بدظن ہوتی ہے مگر رمان کے دل میں صرف نیناں ہے۔ عارفہ، رابعہ ان کی دادی زیتون بیگم بارہا اس موضوع پر بات کر چکی ہیں۔ عارفہ کو نیناں پیاری ہے تو دعا بھی عزیز ہے مگر رمان نہیں مانتا۔ نیناں کی سہیلی مدیحہ جو کہ اس کی کلاس فیلو ہے اس کا تعلق غریب گھرانے سے ہے اس کے گھر میں بڑا بھائی زکی، اماں اکبری اور پھوپھو موجود ہیں پھوپھو کو وہ آپا کہتے ہیں آپا کی زندگی سنگین حادثے کا شکار ہے اس لیے مدیحہ اور زکی ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپا مدیحہ کو امیر سہیلی سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں۔ سبحان رابعہ کے بہترین دوست ہیں مگر ان سے انہوں نے محبت نہیں کی جبکہ سبحان نے اپنی پیاری دوست کے بعد نہ شادی کی نہ اپنے تایا ابا کی بات مانی۔ بیرون ملک ملازمت کر لی اب وہ واپس آئے ہیں یہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کر کے باہر ہی مستقل سیٹ ہونے کے لیے جس پر تایا ابا راضی نہیں ان کے خیال میں سبحان کو سعدیہ سے شادی کر لینی چاہیے۔ جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ کہانی میں نیا موڑ آیا ہے کہ رابعہ کی ملاقات میڈیکل اسٹور پر سیلز مین ذوالفقار سے ہوئی ہے جس نے دواؤں کے شارٹ ہونے اور نہ کھانے کا مشورہ دیا۔ رابعہ نے اس ہمدرد کی بات مان لی۔ رابعہ میں آنے والی خوش آئند تبدیلی سے نیناں بہت خوش ہیں۔ ریحان اور طلال متحیر ہیں۔ طلال کی اور نیناں کی تلخ کلامی ہوئی ہے۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

"طلال ہاؤ ڈیر یو..." رابعہ نے شدید غصے سے کہا۔

"مامی! آہستہ بولیں، میں بہرا نہیں ہوں۔" وہ بڑی بے پروائی سے کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"تم نہ صرف بہرے ہو، اندھے، بدتہذیب انسان ہو، تمہیں رشتوں کا احترام بھی معلوم نہیں۔" رابعہ نے اس کے پیچھے آ کر اور زیادہ بلند آواز میں کہا تو وہ ابرو چڑھا کر مقابل آ گیا۔

"جی ہاں! ہر الزام لگائیں مجھ پر کیونکہ میں ریحان اختر کا بھانجا ہوں، میری مرحومہ ماں نہ رہی تو اس کو جو جی میں آئے آپ ماں بیٹی کہیں لیکن نہیں۔" وہ ایک دم غرایا۔

"نہیں مامی حضور! نیناں کو سمجھا دیں بلکہ تہذیب دیں کہ رشتوں کا احترام کیسے کرتے ہیں......؟"

"وہ نادان نہیں، تم نے اسے تھپڑ مارا یہ انسانیت ہے۔"

"اس نے میری ماں کو برا بھلا کہا یہ انسانیت ہے؟" وہ دوبدو ہو گیا۔

"تمہاری ماں نے جو کیا وہ اگر تمہیں نہیں معلوم تو پوچھو اپنے چہیتے ماموں سے، نیناں نے جھوٹ نہیں کہا۔" وہ بہت کڑک آواز میں بولیں۔

"تو یہ ٹریننگ کر رہی ہیں آپ اپنی لاڈلی کی، کچھ سوچنا پڑے گا۔" وہ بڑی ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ بیڈ



پر دراز ہو گیا۔ رابعہ کو بہت برا لگا...... یہ سراسر بدتمیزی تھی کہ وہ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔

"تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں، اب آج میں ریحان اختر سے پوچھوں گی کہ تمہاری حد کیا ہے؟" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئیں تو طلال کی آنکھوں میں شیطانی رقص کرنے لگی۔

"رابعہ مامی! ایک بار نیناں کو میرے قبضے میں آنے دیں پھر بتاؤں گا کہ میری حد کیا ہے؟ اور آپ کی رسائی تک کیا ہے؟ میں بھی اس گھر کا حقدار ہوں۔ میری ماں نے غلطی کی ہے میں نہیں کروں گا...... ہونہہ...... نیناں کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر جبڑے مضبوطی سے دبا کر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کافی دیر ٹہلنے کے بعد بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی بھرا اور غٹا غٹ پی گیا۔

"آہ بے چاری نیناں! اسے تو اندازہ ہی نہیں کہ شراب پسندیدہ ہو تو کیسے پی جاتی ہے؟" اس پر سوچ کر ہی خمار طاری ہو گیا۔ خود بخود آنکھیں مخمور ہو گئیں اور ہولے ہولے ہنسنے لگا...... اسے کمرے کی ہر شے میں نیناں دکھائی دینے لگی...... اپنے پسندیدہ گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس، زلفوں کے آوارہ بادلوں میں چھپے گلابی چہرے کے ساتھ...... اس نے بے تاب ہو کر اسے بانہوں میں بھر لیا...... رنگین شرارتوں میں ڈھیر سارا وقت بتا دیا...... سرگوشیاں، ترنم اور غنایت سے بھرے لفظ اس کے کانوں میں اترتا رہا۔

کتنے پل، کتنے لمحے، کتنے گھنٹے اور کتنا وقت بیتا...... اسے یہ ہوش ہی نہیں رہا...... خمار تو خمار ہوتا ہے جب چڑھ جائے تو اپنی مرضی سے اترتا ہے یہی حال اس کا تھا، جس کو تھپڑ مار کے رُلایا وہی حواسوں پر طاری تھی، یہ سچ تھا کہ نیناں اس کی پسند اور ضد تھی...... مگر ماں سے متعلق جملے سن کر وہ ضبط نہ کر سکا۔ یہ بھی اسے اندازہ تھا کہ ماموں کو اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ کیوں تھپڑ مارا؟ ریحان اختر نے اسے بیٹے کی طرح پالا تھا، وہ ان کے نزدیک بہن کی آخری نشانی تھی، سب کچھ اس کے سامنے تھا، کاروبار، کاروباری معاملات سب میں وہ خود مختار تھا اور اسے یقین تھا کہ نیناں اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔

"نیناں صرف طلال کی ہے...... صرف طلال کی، سن لیں سب۔" اس نے خاصی اونچی آواز میں نعرہ سا لگایا، اپنی دانست میں سب کو سنایا مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

ریحان اختر رات کافی دیر سے لوٹے تھے۔ رابعہ نے فون پر طلال کی بدتمیزی کی خبر دی تھی اس لیے وہ سیدھے اس کے کمرے میں گئے۔ کچھ دیر بعد ڈائننگ روم میں آئے تو بوا اُن کی ہمیشہ کی طرح منتظر تھیں کھانا میز پر لگا ہوا تھا، ان کی کرسی کے سامنے پلیٹ صاف شفاف موجود تھی، باقی دو کرسیوں کے سامنے والے خالی برتن یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہاں کھانا کھایا جا چکا ہے...... موڈ پہلے ہی خراب تھا، پیشانی پر ہزار ہا سلوٹیں ڈال کر بوا سے پوچھا۔

"باقی لوگ کھانا کھا چکے ہیں؟"

"ہاں!"

"تو میز پر کھانا لگانے کی ضرورت کیا ہے؟" کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بجھا ہوا طنز کیا۔

"طلال کو کچھ کہا کہ......" بوا ان کا طنز نظر انداز کر کے اصل مقصد کی طرف آ گئیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سمجھا دیا ہے...'' انہوں نے دھیمے اور نرم لہجے میں کہا۔
''صرف سمجھایا ہے یا تاکید کی ہے...؟''
''کسی کی مری ہوئی ماں کی بے عزتی نہیں کرتے، طلال کو سمجھانے سے زیادہ رابعہ کو بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ نیناں کے دماغ میں زہر نہ بھرے۔'' وہ الٹے ہی طریقے سے بولے تو بوا کو غصہ آ گیا۔
''رابعہ کہاں سے آ گئی۔''
''نیناں کو الٹے ٹریک پر نہ چلایا جائے...'' وہ اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے بولے۔ بوا کی سمجھ میں آ گیا کہ ریحان نے زیادہ سے زیادہ طلال کو کیا کہا ہوگا؟ یہی تضاد اُن کی شخصیت کو مشکوک بناتا تھا کہ ایک طرف نیناں اُن کی کل کائنات تھی دوسری طرف طلال کی نیناں کے ساتھ کی ہوئی ہر بدتمیزی کو وہ بڑے سلیقے سے برداشت کر جاتے تھے، اگر کچھ کہتے بھی تو بہت قرینے سے یہی چھوٹ طلال کو خودسر بنانے کی بڑی وجہ تھی۔ بوا نے طلال اور نیناں کے درمیان کبھی التفات نہیں دیکھا تھا مگر انہیں یقین تھا کہ ریحانؔ طلال کے لیے کون سا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں، نیناں کے لیے انہیں طلال سے زیادہ کون مناسب لگے گا، یہی فکر وقت کے ساتھ ساتھ رابعہ کے ذہن میں پختہ ہوتی جا رہی تھی۔
ریحان اختر خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھے، بوا کچن میں جا چکی تھیں، تبھی فیضو نے آ کر دلشاد صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ ریحان اختر بھنا اٹھے، طیش میں آ کر غلیظ سی گالی دی اور کہا۔
''اسے کہو تمہیں انسانیت کی زبان سمجھ نہیں آتی۔''
''جی...'' فیضو خوف اور حیرت سے دیکھتا رہا تو وہ دہاڑے۔
''جاؤ نکلوا سے اور ہاں، کہنا کہ آئندہ یہاں نہ آئے...'' فیضو جلدی سے چلا گیا تو وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے کمرے میں آ گئے... تیور بگڑے تھے... رابعہ کو طلال کی بداخلاقی پر غصہ اور اشتعال تھا روٹین میں تو وہ واجبی سی موجودگی کا احساس دلاتی تھی لیکن آج بہت کچھ کہنے کی تیاری کے ساتھ منتظر تھی۔
''اوہ! آپ جاگ رہی ہیں، کھانا اکیلے کھا لیا تھا تو سو بھی جاتیں۔''
''یہ موضوع غیر اہم ہے، میں کسی مشورے کی قائل نہیں۔''
''ہوں، تو پھر یقیناً طلال کے موضوع پر بات کرنی ہوگی...'' وہ جوتے اتارتے ہوئے بڑے سرسری سے انداز میں بولے۔
''نہیں، مجھے اپنی بیٹی کی ریسپیکٹ کے لیے بات کرنی ہے۔''
''نیناں میری بیٹی ہے اور طلال بھانجا... اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بڑے سادہ اور روکھے سے تاثرات دے کر واش روم میں گھس گئے۔ رابعہ سلگ اٹھیں انہیں اندازہ تھا کہ ریحان، نیناں کے معاملے میں بہت ایکسٹریمسٹ ہیں وہ طلال کی اس بدتہذیبی کا سختی سے نوٹس لیں گے مگر ایسا ہوا نہیں... یہی کسک رابعہ کو جھنجھوڑ کر رکھ گئی... مگر کچھ بھی پوچھنا اب غیر ضروری تھا۔ اندر ہی اندر زہر کا گھونٹ بھرا اور کروٹ لے کر لیٹ گئیں... کچھ دیر بعد ریحان اختر باہر آئے لائٹس آف کیں اور ان کے برابر لیٹتے ہوئے فقط اتنا کہا۔
''رمان سے کہنا کہ کل مجھے آفس آ کر ملے۔'' وہ چونکیں رمان کا تذکرہ اور اس وقت... کچھ پوچھنا چاہا



دولت کا خزانہ۔ کام
ایک شخص کا بیٹا بڑا نا کارہ تھا [illegible] وہ اور اس کے بیٹے گھر رہتے تھے۔ جب وہ ضعیف العمر شخص مرنے لگا تو اس نے اپنے تمام بیٹوں کو بلا کر کہا۔
[illegible]
(روایات و حکایات۔ تاج کمپنی لمیٹڈ)
(مرسلہ: ریحانہ یوسف۔ اورنگی ٹاؤن کراچی)

مگر وہ کروٹ لے کر اجنبی سے بن گئے۔
پھر رات بھر غصے، اضطراب، ذہنی خلفشار اور اسرار نے انہیں سونے نہیں دیا نہ گولی تھی اور نہ کوئی طریقہ جس سے نیند قریب آتی... انہیں رہ رہ کر گولی نہ ہونے کا افسوس ہوتا رہا... اس اجنبی ہمدردی نے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

☆☆☆

اگلے دن ناشتا کرتے ہی رابعہ نے پرس سے ذوالفقار کا کارڈ نکالا... کارڈلیس پر اس کا نمبر ڈائل کیا... کافی دیر بیل بجتی رہی لیکن فون ریسیو نہ ہوا... بار بار نمبر ملانے کی کوئی آٹھویں کوشش کامیاب ہو گئی۔
''ہیلو!'' دوسری طرف سے خمار آلود مردانہ آواز ابھری۔
''ہیلو، ذوالفقار؟'' انہوں نے براہِ راست پوچھا۔
''اوہوں، جی بول رہا ہوں...'' شاید نیند بھگانے کی کوشش کے ساتھ کہا گیا۔
''میری میڈیسن ملیں۔''
''جی...'' وہ مستقل ہوش میں آ گیا۔
''میں مسز رابعہ بول رہی ہوں، آپ نے میری ٹیبلیٹس ڈھونڈنے کا وعدہ کیا تھا؟'' انہوں نے عجلت میں تعارف بھی کرایا اور وجہ بھی بیان کر دی۔
''اوہ اچھا، اچھا! لیکن میں نے ایک گزارش کی تھی...'' وہ پہچان کر بڑی اپنائیت سے بولا۔
''چھوڑیں وہ گزارش، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی، آپ پلیز وہ ارینج کر دیں ورنہ...''
''ورنہ کیا...؟'' بے تکلفی سے پوچھا گیا۔
''ورنہ میں خود تلاش کرتی ہوں۔'' وہ بیزار سی تھیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مسز رابعہ ریحان! آپ کوئی اور نشہ لگالیں۔''

''کیا مطلب؟ اور آپ کو میرا پورا نام کس نے بتایا؟''

''آپ کو کون نہیں جانتا؟ اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہیں آپ، خیر یہ چھوٹا کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں.....؟''

''آپ پرسنل ہو رہے ہیں۔''

''سوری! گولیاں کہاں پہنچانی ہیں؟'' رابعہ کے خشک جملے پر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

''میں ابھی تو اپنی سسٹر کی طرف جارہی ہوں واپسی پر آپ سے لے لوں گی۔''

''او کے!''

''شکریہ! اللہ حافظ.....'' رابعہ نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

رابعہ نے ناشتے کے وقت ہی اونچی آواز میں نیناں کو تیار ہونے کو کہا تھا تاکہ ریحان سن لیں، طلال اور ریحان دونوں نے ان کی طرف دیکھا مگر وہ نظریں جھکا کر ٹوسٹ کھانے میں مصروف رہی تھیں..... ریحان نے انہیں ناشتا ختم کر کے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

''کہاں کا پروگرام ہے؟''

''کہیں بھی.....''

''نیناں کے ایگزام ختم ہوگئے ہیں، میں چاہتا ہوں یہ آفس میں کام سیکھے۔''

''نیناں سے بات کریں، کیا اس میں مزید تھپڑ کھانے کا حوصلہ ہے؟'' انہوں نے براہِ راست طلال پر وار کیا، وہ تلملا کر اٹھ گیا۔

''رائی کا پہاڑ مت بناؤ، جاؤ دونوں جہاں جی چاہے جاؤ.....'' وہ مشتعل سے ہو کر چلے گئے۔ نیناں بالکل تیار تھی..... وہ خود جلدی سے تیار ہوئیں اور پرس، گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلیں..... نیناں بھی پیچھے آگئی۔

''مما! کسی طرح مدیحہ کا پتا کرنا ہے؟''

''رمان سے کہوں گی لے جائے گا۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''گاڑی وہاں نہیں جاتی۔''

''رمان کے پاس موٹر سائیکل ہے وہ اس پر لے جائے گا۔'' انہوں نے تسلی بھرا جواب دے دیا تو وہ خاموش ہوگئی۔

''آئندہ کبھی طلال کے منہ نہیں لگنا، مت ذکر کیا کرو اس کی ماں کا۔'' مین روڈ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے انہوں نے تنبیہہ کی۔

''وہ اور برے لگنے لگے ہیں۔''

''آپ کے بابا کو تو پسند ہیں، کس طرح سپورٹ کرتے ہیں۔'' انہوں نے اندر کا غصہ دبا کر کہا۔

☆☆☆

ہوا کے گھوڑے پر سوار پینٹ کی بیلٹ لگاتا وہ صحن میں آیا تو اکبری بیگم نے تنبیہہ کی۔

''زلفی! پولیس پیچھے لگی ہے یا قیامت آگئی ہے، کاہے کی جلدی پڑ گئی؟''



''اماں! دیر ہوگئی ہے، بس اور کچھ نہیں۔''

''کوئی دیر نہیں ہوئی، ڈھنگ سے بات سنو بیٹھو، میرے پاس۔''

''اوہ جی! بولیں.....'' چاروناچار وہ پلنگ کی پٹی پر ٹک گیا۔

''مدیحہ کو سمجھاؤ کہ اب آگے داخلہ نہیں لینا، بس جو پرچہ رہ گیا ہے وہ دے کر فارغ۔''

''آگے، آگے بولیں۔'' وہ جلدی کے باعث موبائل کی اسکرین پر ٹائم دیکھتے ہوئے بولا۔

''آگے کیا..... پہلی بات تو سنی نہیں.....'' اکبری بیگم کو غصہ آگیا۔

''بھئی مدیحہ کو پرچہ تو دے لینے دیں پھر سمجھا دیں گے، ویسے آگے داخلے سے کیا مسئلہ ہے.....؟''

''میرا اور آپا کا خیال ہے کہ اس کی شادی کردیں۔''

''یہ آپ دونوں کو کیا ہوگیا ہے.....؟'' اب کی بار وہ چونکا۔

''مدیحہ، آپا سے بہت پیار کرتی ہے ان کی وجہ سے دیکھا نہیں پرچہ تک چھوڑ دیا۔'' اکبری بیگم بہت سنجیدگی سے بولیں۔

''آپا سے تو میں بھی بہت پیار کرتا ہوں اور آپ بھی تو انہیں چاہتی ہیں۔'' زلفی نے جیسے یاد دلایا۔

''میں کب انکاری ہوں مگر مدیحہ لڑکی ہے وہ جس طرح اثر قبول کررہی ہے، اس سے تو نفسیاتی مریض بن جائے گی، آپا پر تو جو گزری سو گزری مدیحہ کی حالت بہت عجیب ہوجاتی ہے۔''

''خون تو میرا بھی کھولنے لگتا ہے، بس برداشت کرتا ہوں۔'' زلفی نے دبے دبے لہجے میں اظہار کیا۔

''سانپ گزرنے کے بعد لکیر پیٹنے سے حاصل، آپا کی عمر ساری کٹ گئی، مدیحہ ابھی کچی عمر میں ہے، چڑچڑی بدمزاج ہوجاتی ہے، آپا نے یہ مشورہ دیا ہے۔'' اکبری بیگم نے اٹھ کر بیٹے کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا..... ان کی تو عمر بھر کی کمائی یہ دو بچے ہی تھے انہیں داؤ پر لگانے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔

''لکیر پیٹی نہ بھی جائے تو لکیر پر چلا تو ضرور جاسکتا ہے، خیر آپ نے خود مدیحہ سے بات کرنی ہے.....'' وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ماں کے ہاتھ کا اثر تھا یا مصلحت پسندی کا تقاضا۔

''شادی کی بات تو اس سے کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے رشتے کرانے والی سے کہہ دیا ہے کہ میرے بیٹے اور بیٹی کے لیے مناسب رشتے کرائے۔''

''کیا بیٹے کے لیے بھی کہہ دیا.....؟'' وہ ہنسا۔

''ہاں، مدیحہ کے بعد کوئی سہارا بھی تو ملے۔''

''گویا آپ کو بہو نہیں ملازمہ چاہیے.....'' اس نے شرارت سے کہا

''چل بدتمیز.....'' انہوں نے ڈانٹا۔

''اچھا، ٹھیک ہے پھر آپ کریں اپنی مرضی.....'' وہ وقت کا احساس کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''پھر جلدی.....''

''اب کیا ہے.....؟''

''کچھ سبزی ترکاری کا بندوبست کر کے جاؤ، میرے گھٹنے میں بہت درد ہے، بازار نہیں جاسکتی۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ! کچھ بھی پکالیں مجھے دیر ہوگئی ہے۔"
"بھائی اتنی جلدی کیا ہے.....؟" کمرے سے مدیحہ نے آکر ٹانگ اڑائی۔
"یہ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں....."
"اچھا آپا کے لیے بکرے کا گوشت لاکر دیں، یخنی بنا کر دینی ہے۔"
"ہیں، ہیں بکرے کا گوشت، معلوم ہے کس بھاؤ مل رہا ہے؟" وہ حیرت سے بولا۔
"آپا سے اتنی محبت ہے....." مدیحہ نے جذباتی بلیک میلنگ کی تو وہ گڑبڑا سا گیا۔
"ہوں! اچھا لیتا آؤں گا۔"
"آپا نے کہا ہے تم سے....." اکبری بیگم نے مدیحہ سے پوچھا۔
"نہیں، وہ تو بس گم صم سی لیٹی ہیں، بہت کمزور ہورہی ہیں۔" مدیحہ نے کہا۔ زلفی فوراً موٹر سائیکل لے کر نکل گیا..... البتہ اکبری بیگم نے مدیحہ کو نرمی سے سمجھایا۔
"کچھ ہانڈی چولھا بھی دیکھا کرو، آپا کو آرام کرنے دو ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہو۔"
"وہ تو بہت اکیلی ہیں، اماں آپ تو جانتی ہیں جب کئی کئی دن وہ چپ ہوجاتی ہیں۔"
"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ وہ خود اس چپ سے باہر نکلتی ہیں گا ایسے میں تم اپنے کام کاج سیدھے کیا کرو....." اکبری بیگم نے اپنی دانست میں اس قدر نرمی سے کہا کہ مدیحہ نے زچ ہوکر قطعاً بحث نہیں کی۔

☆☆☆

کافی دنوں بعد دونوں بہنیں ملی تھیں۔ عارفہ خوشی سے کھل اٹھیں..... رمان باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر ارادہ ترک کردیا۔
"میری نیناں بٹی کیسی ہے، پرچے کیسے ہوئے؟" عارفہ نے نیناں کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔
"اچھے ہوئے ہیں۔" نیناں نے کہا۔
"آؤ بیٹھو یہاں میرے پاس....." عارفہ نے دُلار سے کہا تو رمان شوخ ہوگیا۔
"واہ! آپ دونوں اپنی باتیں کریں، ہم اپنی گپ شپ لگائیں گے۔"
"شریر! نیناں کو مدیحہ کے گھر لے جاؤ۔" رابعہ نے رمان سے کہا..... عارفہ نے واضح طور پر بہن میں تبدیلی محسوس کی..... دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔
"توبہ، توبہ..... مدیحہ کے گھر میں نہیں لے جاسکتا....." رمان نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"بھئی اپنی موٹر سائیکل پر لے جاؤ....." رابعہ نے جھٹ انکار کی وجہ سمجھ کر مشورہ دیا تو اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔
"ہاں! یہ ٹھیک ہے، میں ذرا موٹر سائیکل اچھی طرح صاف کرتا ہوں۔" رمان نے مشورہ قبول کرتے ہی پورچ کا رخ کیا جہاں ایک کونے میں کھڑی موٹر سائیکل تقریباً مٹی مٹی ہورہی تھی۔
"رابعہ کتنی اچھی لگ رہی ہو۔" عارفہ نے تعریف کی۔
"اب اچھی ہی لگا کروں گی۔"



"ریحان سے صلح کرلی؟" عارفہ نے ایسے ہی کہہ دیا۔
"ریحان نے سچ بول دیا۔"
"کیسا سچ.....؟"
"خوش فہمی کا سچ، اب مجھے ریحان سے کوئی شکوہ نہیں رہا، یہاں ستر، اسی فیصد عورتیں بنا محبت کے بیوی بن کر گھروں میں رہتی ہیں، میں نے بھی یہی سمجھ لیا ہے۔" وہ کچھ گھما پھرا کر کہہ گئیں مگر نیناں وہاں سے اٹھ کر پورچ کی طرف آگئی۔
طاہرہ پھپھو کا دروازہ پورچ میں کھلتا تھا..... دعا جھاڑن کی آواز پر وہاں آگئی..... رمان نے شرارت سے منہ چڑایا..... وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نیناں بھی وہیں آگئی، جینز پر کرتہ کٹ اپر پہنے، بالوں کی پونی ٹیل بنائے..... دعا نے سنجیدہ سا چہرہ بنا کر اسے سر سے پیر تک دیکھا اور بات رمان سے کی۔
"خیریت ہے، موٹر سائیکل کیوں چمکا رہے ہو.....؟"
"دعا تم نے وہ فلم دیکھی ہے، پرانی فلم ندیم، شبنم کی.....؟" بڑی سادگی سے پوچھا۔
"جی نہیں، میں پرانی نہیں ہوں۔" دعا نے چڑ کر کہا۔
"معلوم ہے، ویسے یار کیا فلم ہے؟ موٹر سائیکل پر ندیم اور پیچھے شبنم سڑکوں پر، ساحلِ سمندر پر جھومتے لہراتے ہیں گاتے ہیں۔" وہ فلم کے سین کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے بولتا چلا گیا دعا جل بھن کے نیناں کو گھورنے لگی، نیناں تو رمان کی اداکاری پر مسکرانے میں مصروف تھی۔
"فلم، فلم ہوتی ہے....." دعا نے کہا۔
"ہاں! لیکن دیکھنا ابھی یہ فلم، یہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہورہی ہے، ہیرو نے ہارن بجا کر ہیروئن کو اشارہ کیا..... وہ پیار سے ہیرو کی کمر میں بازو ڈال کر بیٹھ گئی اور....."
"اور آنکھ کھل گئی....." دعا نے ہنس کر مذاق اڑایا اور اندر چلی گئی..... نیناں کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"اے ہنسو نہیں، آؤ بیٹھو شبنم....." اس نے نیناں سے کہا تو وہ پیچھے بیٹھ گئی..... موٹر سائیکل گیٹ سے نکلی..... سڑک پر پہنچی تو اس نے زور سے چلا کر کہا..... اور گنگنایا۔
"اے اب وہ گانا بھی گاؤ، وعدہ کرو سجنا چھو کے مجھے تم ابھی، جیون کی ان راہوں میں، اے ہے اے ہے ہے....."
"اللہ بس چپ ہوجائیں....." نیناں نے قریب سے گزرنے والوں کو دیکھ کر پریشانی سے کہا۔
"خاموش! ذرا قریب ہوکر بیٹھو بالکل شبنم کی طرح، یار! تم بالکل ان رومینٹک لڑکی ہو....." وہ گردن موڑ کر بولا۔
"پلیز! آپ ٹھیک سے موٹر سائیکل چلائیں....." وہ موٹر سائیکل لہرا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو کر ڈری ڈری سی اس کی شرٹ پکڑنے پر مجبور ہوگئی۔
"چلو، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی....." کمر کی جگہ شرٹ پکڑنے پر ہی اس کو اکتفا کرنا پڑا..... وہ تو پہلی بار موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی اس لیے کافی خوف زدہ سی تھی..... وہ انجوائے کررہا تھا، جان بوجھ کر ڈرا رہا تھا، اسے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب کرنے کی مستی سی طاری تھی..... نیناں باقاعدہ رونے والی ہوگئی۔

''رمان! پلیز میں گر جاؤں گی۔''

''تو میں اٹھالوں گا۔''

''اوہ گاڈ! وہ طلال بھائی تھے.....'' ایک دم ہی وہ چلائی تو اس نے جھٹکے سے موٹر سائیکل روک دی۔

''تو، سڑک ہے، یہاں کوئی بھی کہیں آجاسکتا ہے، سارا موڈ کرکرا کردیا۔'' مصنوعی خفگی سے وہ منہ پھلا کر بولا۔

''آپ کو اپنی فکر ہے بس.....'' وہ زور سے چیخی..... رمان نے غصہ انجوائے کیا۔

''ایسے، ایسے بہت اچھی لگتی ہو۔'' وہ شوخی سے کہہ کر دوبارہ موٹر سائیکل چلانے لگا..... چار و ناچار وہ چپ رہی..... کچھ دور پہنچ کر جونہی مدیحہ کے گھر کی گلی نظر آئی تو اس کا دل چاہنے لگا کہ موٹر سائیکل کہیں نہ رکے بس چلتی رہے، چلتی رہے..... کچھ دیر پہلے اسے رمان فلمی ہیرو جیسی چھچھوری حرکت کرنے والا لگ رہا تھا لیکن اب جانے کیوں بہت اچھا سا لگ رہا تھا..... اس کے دائیں بازو نے خود بخود پھیل کر اس کی کمر کو تھام لیا تھا..... وہ اس تبدیلی پر ہولے سے مسکرایا۔

☆☆☆

''میں اپنے دل کو کیسے روک کر رکھوں، یہ میرے بس میں نہیں ہے، یہ میرا کہنا نہیں مانتا.....'' بستر پر تڑپ کر اشک بہاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

یہ بات سچ ہے کہ دل محبوب کے حسن و جمال سے اس قدر متاثر ہوجائے کہ محبت کے میدان میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا، انسان اسے بارہا سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ باز آجاؤ، محبوب بدعہد بھی ہے، بدخو بھی ہے، اس کا طرزِ عمل انتہائی ظالمانہ ہے، ایک بار اگر تم نے محبت کی دنیا میں قدم رکھ لیا تو پھر تجھے محبوب کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑے گا۔ تیرے لیے زندگی دوبھر ہوجائے گی، معمول کی بات غیر معمولی ہوجائے گی مگر کہتے ہیں نا کہ دل پر اختیار نہیں ہوتا..... دعا کو بھی دل پر اختیار کا حق حاصل نہیں تھا..... اس کی بے قراری کو قرار نہیں تھا، اس کا محبوب بے نیاز رہ کر اپنے محبوب کے پہلو میں سمٹ سمٹ کر دل جلا رہا تھا..... اس کی تمام تر بے نیازی اور لاتعلقی کے باوجود اسے بھولنے اور چھوڑنے پر دل آمادہ نہیں تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد سے وہ بستر پر بڑی اشک بہا رہی تھی..... اسے کسی سے گلہ شکوہ نہیں تھا، اپنی قسمت کو کوس رہی تھی..... رمان سے اس سرد مہری کی توقع اب تک نہیں ہوئی تھی۔

''میں نیناں سے کیا کہوں؟ رمان تم میری خوشیوں کے قاتل ہو، میرا دل تو تمہی نے ہاتھ میں لے کر مسل دیا، تم نیناں کی چاہت میں مجھے اور میری چاہت کو بھلا کیوں کر سمجھو گے؟'' روتے روتے اشکوں کے سیلاب نے تکیہ بھگو دیا۔ طاہرہ کسی کام سے اس کے کمرے میں آئیں تو بے چین ہوکر اس پر جھک گئیں۔

''دعا! وہ انسان جو تنہائیوں میں اپنے گناہوں پر روتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ان آنسوؤں کو موتی سمجھ کر چنتی ہے، ایسے آنسو فطرت کا انمول تحفہ ہوتے ہیں..... انسانوں کے لیے انہیں ضائع نہیں کرتے۔'' وہ ماں سے لپٹ گئی۔



''میری بچی! اس میں رمان کا بھی کوئی قصور نہیں، نہ ہی عارفہ بھابی کی خطا ہے، بس کچھ معاملات میں انسان بے اختیار ہوتا ہے۔'' طاہرہ کی ممتا قطرہ قطرہ آنکھوں کے رستے اس کے چہرے پر برسنے لگی۔ دعا ممتا کے احساس سے پرسکون سی ہوگئی تو طاہرہ نے اس کی بھیگی پلکیں صاف کیں، بے ترتیب بال سنوارے۔

''رمان کو نیناں کے لیے چھوڑ دو، اپنا من صاف کرلو۔'' وہ بولیں۔

''نیناں بہت خوب صورت اور امیر ہے اس لیے رمان کو پسند ہے۔'' دعا نے تاسف سے کہا۔

''یہ وجہ اتنی یقینی بھی نہیں۔''

''میرا رمان پر زیادہ حق ہے۔''

''حق نہ مانگتے ہیں، نہ چھینتے ہیں، اٹھو منہ دھو کر باہر آؤ۔'' وہ ٹال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''آپ جائیں، مشورے کا شکریہ.....'' اس کے دل نے صاف مسترد کردیا۔

''میں نے گوشت پکنے کے لیے رکھا ہے خیال سے بھوننا، میں عارفہ بھابی کے پاس جارہی ہوں، رابعہ آئی ہوئی ہیں.....'' وہ یہ کہہ کر چلی گئیں، تو اسے اٹھنا پڑا..... منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے سیدھے کچن میں آگئی..... اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی، وہ ستم گر، دشمنِ جاں جس کے لیے وہ ماہی بے آب کے مانند تڑپ رہی تھی وہ تو اپنی محبوب بستی کے ساتھ باہر تھا، اس کی ہر تڑپ سے بے نیاز..... پریشر ککر کی سیٹی پوری قوت سے بج رہی تھی، مسالا لگنے کی سی مہک بھی آرہی تھی وہ تیزی سے چولھا بند کرکے وہیٹ اٹھا کر تیزی سے نکلتی بھاپ کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

رمان اسے مدیحہ کے گھر چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے تسلی تھی کیونکہ وہ قریب کی مارکیٹ میں وزٹ کرنے گیا تھا..... جس کا تعلق اس کی ملازمت سے تھا۔ مدیحہ اس کے آنے پر بہت خوش تھی اسے ملوا کر سیدھی آپا کے پاس لے آئی تھی..... آپا نے اس کو گہری جامدی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر ایک ٹک دیکھتی ہی رہیں..... نیناں کو کچھ عجیب سا لگا۔

''آپا! اٹھ کر بیٹھیں، باتیں کریں.....'' مدیحہ نے آپا سے کہا۔

''یہ بیمار ہیں۔'' نیناں نے پوچھا تو آپا نے نفی میں گردن ہلادی۔

''نہیں، بس کبھی کبھی بہت چپ ہوجاتی ہیں.....'' مدیحہ نے ہلکے سے کہا اور آپا کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگالیا۔

''مدیحہ! آپا کے بچے وغیرہ.....'' وہ جھجک کر رک گئی۔

''آؤ باہر چلتے ہیں، اماں نے کھانا بنالیا ہوگا۔'' مدیحہ نے ایک دم کہا تو آپا جلدی سے بولیں۔

''یہ میری بیٹی ہے اور زلفی میرا بیٹا ہے.....'' ان کے لہجے میں اچھی خاصی تلخی تھی..... نیناں کچھ خجل سی ہوگئی۔

''میرا مطلب تھا.....''

''چھوڑو اپنا مطلب۔'' وہ منہ موڑ کر لیٹ گئیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نیناں! آؤ باہر آؤ۔'' مدیحہ نے اس کا بازو پکڑا اور باہر نکل آئی۔ صحن میں اماں نے انہیں دیکھ کر کرسیاں چھاؤں میں رکھ دیں۔

''تم نے آخری پیپر کیوں نہیں دیا.....؟'' نیناں کو یاد آیا۔

''ہاں یہ پوچھو اس سے۔'' اکبری بیگم نے نیناں کی بات سن کر کہا۔

''نیناں! آپا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔''

''ایسی طبیعت.....''

''ہاں! یہ طبیعت خاصی خراب ہوتی ہے، انہیں میں ہی سنبھالتی ہوں۔'' مدیحہ نے دھیرے دھیرے بتایا۔

''ارے بیٹا! پرانے زخم ہیں جو جب کھلتے ہیں ہرے ہی نظر آتے ہیں۔'' اکبری بیگم وہیں آبیٹھیں۔

''آپا کے ساتھ کوئی حادثہ وغیرہ.....؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو مدیحہ کی اپنی حالت متغیر ہوگئی..... چہرہ تمتما اٹھا۔

''ہاں! آپا کو ایک شخص نے اس حال کو پہنچایا ہے۔''

''کسی انسان کے من میں کیا ہے یہ کسے پتا، آپا کا شوہر بھی فرہی تھا۔'' اکبری بیگم نے کہا۔

''اوہ! کتنے برے لوگ ہوتے ہیں؟'' نیناں کے منہ سے درد بھری آہ نکلی۔

''دولت کی چمک اندھا کر دیتی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ وہ کبھی لوٹ کر آئیں تو میں گولی مار دوں.....'' مدیحہ نے دانت کچکچائے۔

''چھوڑو، اب تک جانے کہاں ہوگا، شاید مر کھپ گیا ہوگا۔'' اکبری بیگم نے اسے مخاطب کیا۔

''بڑا افسوس ہوا۔'' نیناں دکھی ہوگئی۔

''ساری عمر آپا نے اسی دہلیز پر گزار دی، مدیحہ میں اُن کی جان ہے۔'' اکبری بیگم نے کہا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' نیناں نے تائید کی۔

''وہ کردار میں نے اسی لیے نہیں کیا تھا۔'' مدیحہ نے یاد دلایا۔

''کردار تو فرضی ہوتے ہیں۔''

''حقیقت سے فرضی بنتے ہیں، میں آپا کی نقل نہیں اتار سکتی تھی.....'' مدیحہ نے چبا چبا کر خود کو تسکین دی۔

اسی اثنا میں موٹر بائیک کی آواز آئی اور زلفی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''اخاہ! راجا صاحب کی پوتی اور راجا ریحان اختر کی صاحبزادی تشریف لائی ہیں۔'' زلفی نے خاصی ترنگ میں آ کر کہا تو نیناں کے ساتھ ساتھ اکبری بیگم اور مدیحہ نے کچھ سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''آپ.....'' نیناں فقط اتنا ہی کہہ پائی۔

''جی میں اور یہ ہمارا غریب خانہ، آپا سے ملوایا نہیں ہے'' زلفی بڑی موج میں تھا۔

''جی ملی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''یہ کیا ہے زلفی.....؟'' اکبری بیگم نے ایک سفید چھوٹا سا شاپر اس کے ہاتھ میں دیکھ کر پوچھا۔



''یہ پاؤ بھر بکرا ہے۔'' اس نے مزاح پیدا کیا۔

''بھائی!'' مدیحہ نے نیناں کے سامنے ایسا بولنے پر کچھ شرمندگی سی محسوس کی۔

''ارے، ان سے کیا چھپانا، انہیں پتا ہونا چاہیے کہ غریب کیسے جیتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر واپس جانے لگا تو مدیحہ نے پوچھا۔

''بھائی جا رہے ہو؟''

''ہاں! بس یہ گوشت دینے آیا تھا.....'' وہ یہ بتا کر باہر نکل گیا۔ نیناں نے اپنے پرس سے موبائل نکالا اور رمان کے نمبر پر بیل دی۔

''ابھی نہیں جانا، کھانا کھا کر جانا.....'' مدیحہ نے اس کا ارادہ بھانپ کر کہا۔

''نہیں پھر سہی، بڑی خالہ انتظار کر رہی ہوں گی اور رمان کو بھی جلدی ہے۔''

''کیا، کیا رمان؟.....'' مدیحہ نے آنکھ دبائی تو وہ شرما گئی۔

''جی رمان۔''

''اوکے، اوکے.....'' مدیحہ نے کہا۔

رمان نے موٹر سائیکل کا ہارن دیا تو وہ فوراً اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی..... اس کے اصرار پر مدیحہ دروازے تک چھوڑنے آئی..... جونہی وہ چلی گئی تو آپا کی آواز آئی، وہ برآمدے میں کھڑی تھیں، وہ خوش ہوگئی کہ آپا اپنے خاموشی کے خول سے باہر نکل آئیں۔

''اس لڑکی میں کیا خوبی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میری فرینڈ ہے آپا۔''

''راجا گھرانے کی فرینڈ، بہت مہنگی پڑتی ہے..... بچو اس سے.....'' وہ کافی گھور کر بولیں اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''اماں، یہ آپا کیا بول گئیں؟'' وہ حیرت زدہ سی ہانڈی پکاتی اماں سے بولی۔

''بس بہتر یہی ہے کہ نیناں سے ملنا ترک کر دو، آپا کی یادداشت اچھی ہے۔'' اکبری بیگم نے بھی نند کی بات کی گہرائی جانچ لی تھی..... مدیحہ کچھ سمجھا اور کچھ نا سمجھی کے درمیان چکر کھانے لگی۔

☆☆☆

بھرپور دن گزار کے وہ سیدھی گھر پہنچیں۔ گپ شپ میں، رمان اور نیناں کی نوک جھوک میں بہت اچھا وقت گزرا، رابعہ قہقہے لگاتی رہیں..... شام ہو رہی تھی جب وہ گھر پہنچیں۔

فیضو رات کے کھانے کی تیاری سے پہلے بوا سے مشورہ لیتا تھا..... بوا اس کے ساتھ مصروف تھیں، تبھی چوکیدار نے انٹر کام پر ذوالفقار کے آنے کی اطلاع دی تو انہیں یاد آیا کہ گولیاں لینی تھیں، یقیناً وہ انتظار کر کے دیئے آیا ہے۔

''اندر بھیج دو.....'' انہوں نے کہا اور خود جلدی سے باہر نکلیں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور لائٹس آن کیں۔ ملازم اسے ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچا گیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہوں......" اس نے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے گلا صاف کیا۔

"آئیں۔" انہوں نے اخلاقاً کہا۔

"یہ آپ کے لیے۔" اس نے خوب صورت پھولوں کا گلدستہ ان کی طرف بڑھایا۔

"شکریہ مگر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" انہوں نے گلدستہ لے کر سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"دوستوں میں اور تکلف، بات کچھ جچی نہیں......" وہ خاصی بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اوہ، ہاں، وہ۔" وہ جھلائیں اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"آپ نے تو خود آنا تھا۔"

"ہاں......لیکن میں بھول گئی۔"

"آپ بھولی نہیں بلکہ آپ کو ان گولیوں کی ضرورت نہیں رہی۔"

"شاید، میں نے بہت اچھا دن گزارہ ہے۔" وہ روانی میں بول گئیں۔

"گڈ! اسی لیے میں گولیوں کی جگہ پھول لایا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"بہت شکریہ، آپ کیا لیں گے چائے، ٹھنڈا۔" وہ سادگی سے بولیں۔

"کچھ نہیں، یہ ادھار پھر کسی وقت اتار دیں گے، باہر کہیں۔" وہ بڑی بے باکی سے کہہ گیا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"اجازت۔" وہ بھی اٹھ گئیں۔

"یہ پھول آج سرہانے رکھیے گا، نیند ایسی آئے گی کہ آپ فریش ہو جائیں گی۔" وہ ہلکا سا جھک کر وثوق سے بولا اور باہر نکل گیا۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہیں پھر پھول اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئیں...

دادی کا حال احوال فون پر پوچھا...... ریحان اختر آ گئے اپنا بریف کیس رکھتے ہوئے پہلی نظر تازہ پھولوں پر پڑی تو ضبط نہ کر سکے، ایک آنکھ کی ابرو چڑھا کر بولے۔

"خوشگوار تبدیلی لانے والے کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نہیں، صرف یہ پوچھیں کہ کھانا تیار ہے، چائے مل سکتی ہے۔" انہوں نے نرمی سے جواب دے کر نظریں چھت پر مرکوز کر لیں۔

"یہ میرا گھر ہے، ہوٹل نہیں۔"

"گھروں میں بیویوں سے یہی سوال کیے جاتے ہیں۔"

"رابعہ! میں نے صرف پھول لانے والے کا نام پوچھا ہے۔"

"لیکن کیوں......؟"

"تاکہ میری بدگمانی دور ہو جائے۔"

"معاف کرنا ریحان! آپ کے اور میرے درمیان اب یہ حق باقی نہیں رہا۔"

"تو میں سمجھ لوں کہ تم اب کسی اور پر حق استعمال کر رہی ہو۔" وہ بازوؤں کو تکیہ بنا کر آڑے ترچھے بیڈ پر دراز ہو گئے۔



"فی الحال تو نہیں۔"

"چلو اپنی اصلیت دکھاؤ۔"

"اصلیت دیکھنے دکھانے کی اب کوئی خواہش نہیں رہی، یہ تو محبت کے اختیارات تھے اور وہ آپ نے مجھ سے کی نہیں......" وہ مسکرا کر انتہائی نرمی سے بولیں۔

"تو اس کا مطلب ہے اب تم محبت کرنے والا یہاں بلاتی ہو۔"

"بات کو طول مت دیں۔" وہ یہ کہہ کر کروٹ لے کر سوتی بن گئی۔

وہ اندر ہی اندر سلگتے رہے اور پھر ہاتھ بڑھا کر پھولوں کو اٹھا کر ڈسٹ بن کی طرف پھینکا، نشانہ خطا ہو گیا گلدستہ ڈسٹ بن سے ٹکرا کر باہر ہی بکھر گیا......تب ان کے دل کو تسکین ملی...... جانے کیوں وہ بھول گئے کہ یہ رستہ ان کا اپنا دکھایا ہوا ہے......وہ یہ سچ بول چکے ہیں کہ انہوں نے رابعہ سے کبھی محبت نہیں کی، اپنی بیٹی کی ماں سمجھ کر مقام دیا......بس یہ سچ ہی کافی تھا رابعہ کی زندگی کو بدلنے کے لیے۔

☆☆☆

تین روز سے اس کی کمپنی کے آڈٹ کی شدید مصروفیت تھی، وہ چونکہ ریجنل منیجر تھا، برانچ آفس کی ساری ذمے داری اس پر تھی...... آڈیٹر اپنے کام میں محو تھے مگر اس کی موجودگی آفس میں ضروری تھی...... نہ کھانے کی فرصت تھی نہ گھر جانے کی...... عارفہ فون کرتی رہتیں مگر وہ معذرت کر لیتا...... عارفہ کو ماں ہونے کے ناتے بہت فکر تھی، خاص کر کھانے کے حوالے سے کہ باہر کا کھانا کھانے سے وہ بیمار ہو جاتا ہے، اس لیے کھانا ٹفن میں بند کر کے اسے منگوانے کے لیے فون پر کہا تو وہ برس پڑا۔

"امی! سمجھا کریں، میں مصروف ہوں، فرصت ملے گی تو کھا لوں گا۔"

"کیا کھا لو گے؟ بازار کا گند بلا......" انہیں بھی غصہ آ گیا۔

"جو سب عملہ کھائے گا وہی میں بھی کھا لوں گا، یہاں کوئی فارغ نہیں فی الحال۔" اس نے دوسرا فون بجنے پر موبائل آن کر دیا۔

"ہیلو......"

"جی......جی۔" وہ کچھ شناخت نہ کر سکا۔

"زمان! ریحان اختر بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ! سوری پہچان نہیں پایا......" وہ شرمندہ ہو گیا۔

"کوئی بات نہیں، پہچان کے لیے ہی رابطہ کیا ہے......" وہ بولے۔

"جی، خیریت تو ہے نا......؟"

"ہاں! ہاں! رابعہ نے میرا پیغام تو نہیں دیا ہو گا۔"

"نہیں، میں دراصل آڈٹ ٹیم کے ساتھ مصروف ہوں۔"

"اوکے! چلو جب فارغ ہو تو میرے آفس آؤ۔"

"خیریت......؟"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خیریت کے بغیر ہی ملنا چاہیے؟"

"میرا مطلب ہے کوئی ضروری کام....."

"بیٹھیں گے، بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"او کے اللہ حافظ....." انہوں نے کہہ کر فون بند کردیا تو وہ پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے سوچ بچار میں پڑ گیا، دل وسوسوں کا شکار سا ہوگیا..... ریحان اختر کے حسن سلوک کے مناظر دیکھنے کے باعث رابی خالہ کا ہی خیال آیا..... حد درجہ مصروفیت کے باوجود اس نے ان کا فون نمبر ملایا کافی دیر کے بعد فون اٹینڈ ہوا۔

"ہاں! جان....." رابعہ نے مخاطب کیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں....."

"ہاں! لیکن ریحان کو آپ سے کیا کام ہے؟"

"ملوں گا تو بتادیں گے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"دراصل! ریحان کی شاطرانہ سوچ ہے، نیناں کو آفس بلوایا تھا، میں نے منع کردیا۔"

"آفس لیکن..... کیوں.....؟"

"طلال نے نہیں بتایا۔"

"چلیں کوئی وجہ ہوگی، آپ فکرمند نہ ہوں....." اس نے تسلی دی۔

"کب ملنے جاؤ گے.....؟"

"فی الحال تو بہت مصروف ہوں دیکھیں کب فرصت ملے گی۔"

"او کے!" رابعہ نے یہ کہہ کر فون بند کردیا مگر سوچ کا ایک نیا زاویہ سامنے آگیا کہ ریحان نے آخر رمان کو آفس کیوں بلوایا ہے؟ کیا بات کرنی ہے؟ ریحان سے تو کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔

"خیر..... کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا۔" انہوں نے کندھے جھٹک کر خود سے کہا اور وارڈ روب سے لباس کا انتخاب کرنے لگیں..... آرٹس کونسل میں پینٹنگ کی نمائش تھی انہوں نے اخبار میں پڑھ کر پروگرام بنالیا۔ نیناں سے چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کردیا۔ لہٰذا کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے تنہا ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ موبائل فون کی گھنٹی بجی تو الماری کھلی چھوڑ کر فون ریسیو کیا۔

"کیسی ہیں آپ.....؟" رس ٹپکاتی آواز ذوالفقار کی تھی۔

"آپ! آپ کو میرا موبائل نمبر کہاں سے ملا.....؟" رابعہ نے تعجب کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کا نمبر ملنا مشکل کام ہے کیا.....؟" شگفتگی سے پوچھا گیا۔

"نہیں، دراصل میں نے خود آپ کو دیا نہیں....." انہوں نے یاد دلایا۔

"آپ کے ہزبینڈ سے لیا ہے۔" بڑی سادگی سے کہا گیا۔

"وہاٹ! آپ نے ریحان سے نمبر لیا۔" اسے ذہنی کوفت ہوئی تو تقریباً چلا اٹھی۔

"ہاں! کیوں کوئی غلط بات ہوگئی؟"



"چھوڑیں، کیسے زحمت کی.....؟" وہ ٹال گئیں۔

"بس دل چاہا آپ کی خیریت معلوم کروں۔"

"شکریہ! میں نے تو خیریت سے رہنا سیکھ لیا ہے۔"

"یوں کہیے کہ آپ کو زندہ رہنا آگیا ہے۔"

"شاید۔"

"آپ مصروف تو نہیں تھیں؟"

"مصروف ہونے جارہی ہوں، مطلب مجھے باہر جانا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کہاں؟" بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

"بس آرٹس کونسل تک۔" نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں کہنا پڑا۔

"اچھا! کاش میں بھی آپ کے ساتھ چلتا۔"

"آپ وہاں خود بھی جاسکتے ہیں۔"

"ہاں! لیکن....." وہ رک گیا۔

"کچھ مسئلہ ہے کیا.....؟"

"چھوڑیں، آپ تیار ہوں اور جائیں۔"

"او کے! تھینکس فار کالنگ....." انہوں نے اخلاقاً کہا اور فون بند کردیا مگر فون کو دیکھتے ہوئے ریحان کے نمبر بتانے کی وجہ سے خاصی الجھن سی ہوئی حیرت کی بات تھی کہ ریحان نے اسے موبائل نمبر دے دیا۔

"کیوں؟" اس سوچ میں کافی وقت گزر گیا، پھر ذہن سے نکال کر جلدی سے تیار ہونے لگیں۔

☆☆☆

تیکھے نقوش والی دیہاتی لڑکی کنویں کی گہرائی میں جھانک کر جانے کیا اندازہ لگا رہی تھی، لمبی سی چٹیا بل کھا کر سامنے جھول رہی تھی، ڈوبتے سورج کی شنگرفی کرنوں کے عکس سے نازک جسم پر پڑے کُرتے کی باریک چھن چھن کر اس کے گندمی رنگ کو ظاہر کررہی تھی..... پس منظر میں سرسبز کھیت اور دور گھنے درخت تھے..... مجموعی طور پر تصویر نے انہیں کچھ دیر رکنے اور دیکھنے پر مجبور کردیا۔

"بیوٹی فل!" انہوں نے اپنے آپ سے بات کی..... مگر جواب پشت سے آیا۔

"کون تم یا تصویر.....؟" وہ چونک کر پلٹیں..... تو متحیر رہ گئیں۔

"سبحان تم!" ان کے لہجے میں آج حیرت بھری خوشی شامل تھی..... یہ چیز سبحان کے لیے تعجب انگیز تھی۔

"کسی اور کا انتظار تھا؟" سبحان نے شوخی سے پوچھا۔

"نہیں تو لیکن تم کو دیکھ کر اچھا لگا۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ سے ذرا دور نسبتاً کم بھیڑ والی جگہ پر آگئے۔

"شکریہ! بور ہورہا تھا سو آگیا، تمہیں پتا ہے کہ مجھے مصوری سے دلچسپی ہے۔"

"اچھا کیا....."



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لیکن تمہیں یہاں دیکھنا اور بھی اچھا لگا۔'' انہوں نے سرتا پا ان کا جائزہ لیا، وہ آج کافی حد تک پرانی والی رابعہ لگ رہی تھیں..... کپڑوں کے ہم رنگ جوتے اور پرس کے ساتھ، خوب صورت میک اپ میں بالکل وہی رابعہ جو یونیورسٹی میں ہر دل کی دھڑکن تھی لڑکیاں جس کے کپڑوں کی تراش خراش اور جدت کی نقالی کرتی تھیں، لڑکے اس کے ویل ڈریس ہونے پر فدا رہتے تھے..... خود سبحان کو عادت تھی کہ اس کے لباس اور میچنگ کی جی بھر کے تعریف کرتے تھے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو.....؟''

''رابعہ کی واپسی دیکھ رہا ہوں۔''

''ہوں! ٹھیک کہا تم نے میں نے سراب سے باہر نکل کر جینا ہے۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔

''باہر چلیں، چائے پیتے ہیں؟'' سبحان نے لوگوں کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''پہلے تصویریں تو دیکھ لو۔''

''تصویریں ہی تو دیکھ رہا ہوں.....'' سبحان بہت مدھم مگر شوخ لہجے میں بولے تو وہ ہنس دیں..... زندگی سے بھرپور ہنسی..... اور باہر کے لیے ساتھ چل دیں..... چند قدم کے فاصلے پر کینٹین تھی..... سبحان نے دو کپ چائے کا آرڈر کیا اور کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے..... رابعہ نے ایک طویل پُرسکون سانس بھری۔

''سبحان! تم سچ کہتے تھے، ریحان کو مجھ سے محبت نہیں تھی.....'' وہ ایک دم بولیں۔

''کیا.....؟ کیا کہا.....؟''

''ریحان نے صرف تم سے دور رکھنے کے لیے جھوٹ بولا یا کچھ اور تھا، بس محبت نہیں تھی۔'' یکلخت احساسِ توہین سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''وہاٹ، جھوٹ کیسا جھوٹ اور تم نے تو اس سے محبت کی۔'' برقی رو مسلسل سبحان کے اندر سے گزر رہی تھی۔

''ہاں، میں نے کی تھی، اسی لیے تو اس حال کو پہنچ گئی تھی، اب سکون ہے، شانتی ہے، ریحان نے اعتراف کرلیا ہے کہ میں ان کی محبت کبھی نہیں تھی.....'' چند بوندیں نمکین ان کی آنکھوں کے کونے بھگو گئیں۔

کینٹین والے لڑکے نے چائے کے کپ میز پر رکھے تو وہ ذرا دیر کو کپوں سے اٹھتی بھاپ دیکھنے لگیں۔

''تو پھر.....؟''

''تو سارا جھگڑا ہی اس کم بخت محبت کا تھا۔ اب جس گلی جانا نہیں اس کے راستے کی فکر کیا کرنی.....؟ ریحان غیر اہم ہوگئے ہیں، میں نے وہ صدمہ، افسوس سب اپنی ذات سے الگ کردیے ہیں۔'' وہ بولتی گئیں۔

''مطلب ریحان کسی اور سے.....؟''

''جہنم میں جائے وہ اور..... مائی فٹ اب مجھے کوئی غم ہی نہیں رہا.....'' وہ خاصی مضبوط آواز میں کہہ کر چائے پینے لگیں۔

''محبت میں مقام بدل گئے، یہ کیا بات ہوئی.....؟''

''بس کچھ بھی سمجھ لو، میں صرف نیتاں کی ماں اور ریحان کی بیوی ہوں۔''

''یہ چھوٹی بات تو نہیں رابعہ.....''



''ہوں مگر کیا کریں وہ کہہ چکا ہے کہ میں اس کی محبت نہیں، اب اور محبت کریں گے۔'' وہ مسکرا کر استہزائیہ انداز میں بولیں۔

سبحان چپ چاپ انہیں دیکھتے رہے..... کچھ دیر بعد ان کا موبائل فون بجا..... نمبر دیکھ کر پہلے انہوں نے کچھ سوچا اور پھر فون سائلنٹ کردیا۔

''کس کا فون تھا.....؟''

''شاید ایک دوست کا۔''

''شاید ایک دوست.....'' وہ بڑبڑائے۔

''فی الحال.....'' ذومعنی جواب دیا گیا۔

''او کے! چلیں دیر ہو رہی ہے۔'' سبحان نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

''ہاں! چلو۔''

''امید رکھوں کہ میری دوست مجھے وقت دیتی رہے گی۔'' سبحان نے جھک کر پوچھا۔

''ہوں، ہاں۔'' رابعہ نے اثبات میں جواب دیا چلتے ہوئے سبحان کے دل میں ایک جذبے نے سر اٹھایا۔

''اگر پھر سے محبت کرنی پڑے تو.....؟''

''تو تم پھر بھی اچھے دوست ہی رہو گے.....'' اس نے ادھورا جملہ اچک کر مکمل سا جواب دیا، سبحان بجھ سے گئے..... مگر پھر فوراً ہی نارمل ہوگئے..... یہ حقیقت تو پہلے ہی تسلیم کرلی تھی۔

''جوان بیٹی کی ماں محبت کرے گی کیا.....؟''

''محبت ہوتے دیر نہیں لگتی جناب.....'' اس کے مذاق پر انہوں نے وثوق کی مہر ثبت کی۔

☆☆☆

کئی روز سے جو موضوع زیرِ بحث تھا اس پر آج مدیحہ نے اس وقت واویلا کیا جب رشتے کرانے والی کو اکبری بیگم رخصت کرکے اندر آئیں۔

''یہ ڈراما اماں اب بند کردیں، میں نے کہہ دیا ہے کہ آگے پڑھنا ہے۔''

''تو باوا سے کوئی جاگیر نام لکھوالیتیں.....'' اکبری بیگم بھڑک اٹھیں۔

''مجھے کچھ نہیں سننا، یہ شادی وادی کا پروگرام نہیں ہے میرا.....'' وہ ہاتھ نچا کر بولی تو آپا کو مداخلت کرنی پڑی۔

''مدیحہ! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

''آپا! میں نے یونیورسٹی جانا ہے، یہ شادی کریں بھائی کی۔''

''لڑکی اور غریب لڑکی، جانتی ہو کوئی بات کرکے خوش نہیں ہوتا وہ تو پھر معقول رشتہ ہے۔''

''ہونہہ! معقول رشتہ.....'' اس نے طنزیہ کہا۔

''اکبری! پڑھ لینے دو اسے، شادی کی عمر کون سی نکلی جارہی ہے۔'' آپا کا دل اس کے لیے پھڑ پھڑایا۔

''آپا! اتنا خرچہ کہاں سے آئے گا؟ ایک کمانے والا ہے، سنا تمہیں ظہورہ کیا کہہ رہی تھی حمیدہ کو کہ انہیں کہو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس محلے سے باہر نکلیں۔'' اکبری نے رشتہ کرانے والی حمیدہ اور اس کی ساتھی ظہورہ کا تذکرہ کیا۔

''کہتی تو وہ ٹھیک ہے، یہاں کون آئے گا؟'' آپا نے تائید کی۔

''پھر خود سوچو، گھر بدلیں، یونیورسٹی پڑھوائیں کیا کریں، زلفی کی شادی کردوں تو سکھ ملے۔'' اکبری بیگم کے اندر سے الجھنوں نے سر اٹھایا۔

''زلفی کے لیے کوئی رشتہ بتایا انہوں نے؟''

''ہاں! کہہ رہی تھی اچھی لڑکی ہے اگر بات بن جائے مگر اس محلے اور گھر میں نہیں۔''

''چلو، گھر بیچ کر باہر لے لیتے ہیں لیکن مدیحہ کو ابھی پڑھنے دو، میرے پاس سونے کے کڑے ہیں، وہ اس کی تعلیم پر خرچ کردیتے ہیں۔''

''نہیں آپا! وہ آپ کی شادی کے ہیں۔'' مدیحہ تڑپ اٹھی۔

''جب شادی نہیں رہی تو کڑوں کا کیا کرنا۔''

''پھر بھی آپا، وہ آپ کے ہیں۔'' اکبری بیگم نے نند کا ہاتھ محبت سے دباتے ہوئے کہا۔

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں، میں پرائیوٹ پڑھ لوں گی.....'' مدیحہ نے فیصلہ بدل لیا۔

''نہیں، تم وہی کروگی جو میں نے کہا ہے، زلفی سے کہو کہ فارم وغیرہ لائے۔'' آپا نے اس کا فیصلہ مسترد کردیا۔

''اگر قسمت نے اچھا فیصلہ کردیا تو.....'' اکبری بیگم نے کہا۔

''قسمت اچھی ہوتی تو ایسا ہوتا ہی کیوں.....؟'' آپا نے تاسف بھری سانس بھری۔

''آپا! میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا خون پی جاؤں.....'' مدیحہ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''گندے خون کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔'' آپا نے کہا اور کمرے میں چلی گئیں۔

''آپا سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔'' اکبری بیگم نے کہا اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

''اماں! زلفی بھائی کی شادی کردیں، بہت مزہ آئے گا.....'' وہ پیچھے چلی آئی۔

''وہ بھی جانے کن ہواؤں میں ہے، پورے پانچ سو روپے دیے ہیں حمیدہ کو مگر اس نے میری بات سن کر ہوا میں اڑا دی.....'' اماں نے چولھا جلاتے ہوئے کہا۔

''بہرحال بھائی کو تو راضی کرلیں سچ بہت مزہ آئے گا۔'' مدیحہ کی آنکھوں میں سوچ کر ہی قندیلیں روشن ہوگئیں۔

''اور پیسہ درختوں سے توڑیں گے۔''

''بھائی ہیں نا.....''

''وہ اکیلا کیا کیا کرے گا، گھر بیچ کر نئے گھر میں جانا کوئی آسان کام نہیں.....''

اکبری بیگم سلور کی دیگچی میں گھی اور سفید زیرہ ڈالتے ہوئے بولیں..... مدیحہ کی طرف انہوں نے چھری اور آلو بڑھائے تاکہ وہ چھیل لے..... مدیحہ تو آگے پڑھنے کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی انہوں نے کندھا ہلایا تو وہ چونکی۔

☆☆☆

فائلوں سے سر اٹھایا ہی تھا۔ چپراسی افضل نے اندر آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی..... بے دھیانی میں انہوں نے اثبات میں گردن ہلادی..... افضل باہر گیا تو انہوں نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگالیا..... مگر ایک



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دم ہی ان کی پیشانی پر ہزار ہا سلوٹیں ابھر آئیں۔
''یہاں آنے کی جرأت بھی کیسے کی تم نے.....؟'' وہ چلا اٹھے۔
''آہستہ بولیں سرکار! باہر آپ کا عملہ کیا سوچے گا.....؟'' آنے والے نے خاصے تحمل سے اپنے پیلے زرد دانتوں کی نمائش کی۔
''تمہیں دیکھ کر بھی وہ بہت کچھ سوچ رہے ہوں گے۔'' انہوں نے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کیا تو وہ اور بھی ڈھٹائی سے مسکرایا۔
''سرکار! ہم تو ایسے ہی تھے اور ایسے ہی رہیں گے۔''
''یہاں اور گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے.....'' انہوں نے چیک بک سے ایک چیک پھاڑ کر بھرا اور اس کی طرف پھینکا۔
''خدا کی قسم پہلی بار یہاں آیا ہوں مگر اچھا لگا کافی بڑا کاروبار ہے۔'' وہ چیک جھاڑ کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔
''اب جاؤ یہاں سے، آئندہ گھر بھی نہیں آنا۔''
''ٹھیک ہے پھر خود ہی زحمت کر لیا کریں۔''
''جاؤ یہاں سے۔''
''عجیب بڑے لوگ ہوتے ہیں کوئی چائے پانی نہیں.....''
''جاؤ، غیرت کا گھونٹ پیو.....'' وہ خاصی نفرت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔
''ٹھیک ہے سرکار.....'' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا..... تب انہوں نے غصے سے افضل کو ڈانٹا اور تاکید کی کہ آئندہ اسے دفتر میں گھسنے نہیں دینا، افضل گیا تو طلال آ گیا..... اس نے شاید اسے دیکھ لیا تھا۔
''یہ کون ہے.....؟''
''کون.....؟''
''دلشاد.....'' طلال نے کہا تو انہیں زوردار جھٹکا لگا۔
''آپ کیسے جانتے ہو.....؟''
''یہ اس دن گھر بھی آیا تھا، تب اپنا نام بتایا تھا۔''
''اور کچھ پوچھا تو نہیں تھا.....''
''نہیں، میں جلدی میں تھا مگر یہ کون ہے.....؟''
''بس ضرورت مند ہے.....'' وہ یکسر ٹال گئے۔
''اچھا! اب انھیں کافی دیر ہو گئی ہے۔'' طلال نے کہا۔
''آپ جاؤ، مجھے یہ سب فائلیں دیکھنی ہیں۔''
''نیناں کا آفس سیٹ کرا دیا ہے۔''
''اوہ! مگر وہ تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن چاہتی ہے۔'' انہوں نے سرسری سے لہجے میں کہا تو طلال کو اچھا نہیں لگا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور آپ اس کی یہ فرمائش پوری کریں گے۔''

''یہ فرمائش سے مطلب، نیناں کی تو میں نے کوئی بات کبھی نہیں ٹالی.....'' انہوں نے بالکل واضح جواب دے کر طلال کو خاصا مایوس کیا..... وہ تو رات دن اس کے خواب دیکھ رہا تھا، اسے حاصل کرنے کی تمنا ماہی بے آب کے مانند تڑپا رہی تھی۔ اس کی محبت تو طلال کی زندگی کا ارمان تھی۔

''ماموں! نیناں کی اب شادی کریں اور بس.....'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تو ریحان اختر نے یکبارگی اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔

''اس موضوع پر نیناں سے بات ابھی کی نہیں.....''

''نیناں سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے.....؟''

''اس کی ہر ضرورت میری اور میری ہر ضرورت نیناں کی ہی ہے، اب جاؤ۔'' وہ قدرے روکھے سے لہجے میں بولے..... طلال خجل سا ہو کر چل دیا لیکن ریحان اختر کے ذہن میں ایک نیا باب کھل گیا..... نیناں کی شادی..... وہ خاصے ڈسٹرب ہو کر اس نئے موضوع میں الجھ گئے۔

''نیناں کی شادی، میری نیناں کی شادی.....'' بے اختیار ہی اُن کے لبوں سے نکلا۔

☆☆☆

سر میں شدید درد ہو رہا تھا..... بوا اپنے کمرے میں تھیں، بہت عرصے سے وہ کچھ تھکی تھکی اور نڈھال سی رہنے لگی تھیں..... نیناں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا پھر خود ہی کچن میں آ کر اپنے لیے ایک کپ چائے کا بنایا..... کمرے میں آ کر خیال آیا کہ سر درد کی گولی کھا لینی چاہیے، دراز میں ہاتھ ڈال کر گولی کی تلاش مقصود تھی مگر ہاتھ میں رمان کی تصویر آ گئی نیوی بلو ہائی نیک میں مسکراتی آنکھوں اور پُرتبسم لبوں کے ساتھ وہ قابلِ دید لگ رہا تھا، گولی بھول کر وہ ایک ٹک تصویر دیکھتی رہی، دل میں جانے کیا ہونے لگا تھا، نظریں جم سی گئی تھیں، پہلی بار اس انداز میں دیکھتے ہوئے اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی..... جانے کیوں لبوں پر شرارت کھیل گئی، تصویر کی پشت پر لکھا جملہ پڑھ کر تو آج خود بخود ہنسی آ گئی..... طبیعت مچلنے لگی کہ فون کر کے آج یہ اعتراف کر ہی لے کر تصویر کیسی ہے؟ بے اختیار ہی بھولا بسرا نغمہ لبوں پر مچل گیا۔

''جو بات تجھ میں ہے
تیری تصویر میں نہیں
تصویر میں نہیں''

چائے کا کپ اس کی عدم توجہی کی نذر ہو گیا..... دھڑکتے دل کے ساتھ فون نمبر ملایا..... دوسری طرف کئی روز کی شدید مصروفیت اور تھکن کے باعث وہ بے سدھ سویا ہوا تھا..... فون کی مسلسل آنے والی آواز پر عارفہ نے دعا کو فون سننے کا اشارہ کر دیا..... وہ موبائل لے کر ڈریسنگ روم میں آ گئی۔

''ہیلو.....'' نیناں نے کہا۔

''ہیلو.....'' دعا اس کی آواز پر بولی۔

''کون.....؟ میرا مطلب ہے رمان سے بات کرا دیں.....'' نیناں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دعا ہی ہو سکتی ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# دیوانگی کے صحرا میں

عروہ وحید

موبائل کی رنگ ٹون جارہی تھی۔ دوسری بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

''ہیلو! آپ رضیہ بتول بات کر رہی ہیں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''ہاں، بول تو رہی ہوں۔'' نہایت کرخت اور کان پھاڑنے والی آواز میں بتایا گیا۔

''جی، میں آپ کی بیٹی شکیلہ کے اسکول سے بول رہی ہوں۔ اسے کھیلتے ہوئے سر پر چوٹ لگی

''آپ کون.....؟'' دعا نے دانستہ پوچھا۔

''میں نیناں بول رہی ہوں.....'' اس نے سادگی سے تعارف کرایا۔

''اوہ! رمان تو گھر پر نہیں ہیں.....'' اس نے جھوٹ بولا۔

''لیکن فون.....'' نیناں کو خاصی مایوسی ہوئی..... فون اس کا دعا کے پاس یہ سوال ذہن میں جاگا۔

''وہ فون میرے پاس رہ گیا، میرا مطلب ہے وہ گھر ہی بھول گیا ہے۔'' دعا کو مزید جھوٹ بولنا پڑا..... نیناں نے افسردہ ہو کر فون بند کر دیا، یہی دعا کا مقصد تھا مگر رمان نے کسمسا کر کروٹ لیتے ہوئے اس کا سا ڈریسنگ روم میں دیکھ لیا تو پوری کی پوری آنکھیں کھول لیں..... وہ باہر نکلی تو اس کو جاگتا دیکھ کر گھبرا گئی۔

''اگر بھول کر اس نے فون کر ہی لیا تھا تو تم نے رقیب کا اچھا خاصا کردار نبھایا۔'' رمان نے کہا تو وہ فوراً اس کے بیڈ پر اچھال کر بولی۔

''تمہیں نیناں کے خواب آتے ہیں۔''

''خواب مجھے آتے ہیں اور دیکھتی تم ہو۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''کتنی بدتہذیبی کی بات ہے کہ تم نے جھوٹ بولا ہوگا۔''

''ہاں بولا ہے۔''

''تو میں تمہیں جھوٹی کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں؟'' وہ فون کی ریسیولسٹ دیکھنے لگا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم سونے کی ایکٹنگ کر رہے ہو۔''

''نہیں، میرے دل نے دھڑک کر مجھے بتا دیا تھا کہ تمہاری جانِ بہار کا فون ہے..... اب مجھے ملنے جا پڑے گا۔'' وہ شوخی سے کہتا ہوا اٹھ کر تیار ہونے چل دیا۔ دعا کی آنکھیں بھر آئیں..... تو وہ واش روم کے دروازے سے پلٹ کر بولا۔

''ارے لمبی لڑکی، وہ دیکھو کتنا بڑا جالا چھت پر لگا ہے وہ ہی اتار دو۔'' اتنا غیر متوقع مذاق وہ بھی اس وقت..... وہ تلملا کر مارنے کو بھاگی تو اس نے واش روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا..... وہ دروازے پر گھونسے مکے برساتی رہی..... اور چلاتی رہی۔

''بلاؤ اپنی نیناں کو..... یہ لمبی لڑکی تمہاری نوکر نہیں ہے۔''

''ارے وہ تو محبوبہ ہے، جان ہے، پیار سے دیکھنے کے لیے ہے..... کام تو تمہیں کرنے ہیں۔'' اندر سے بھی چڑانے سے وہ باز نہیں آیا تو وہ بل کھاتے ہوئے باقاعدہ رونے لگی جبکہ وہ گنگنانے لگا۔

''جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا
رو کے زمانہ چاہے رو کے خدائی، تم کو آنا پڑے گا
ہم کو آنا پڑے گا رو کے چاہے دعا فاطمہ ہم کو آنا پڑے گا''

وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر گانے لگا تھا..... وہ جل کر انگارہ بن گئی..... مگر وہ اسے ستا کر مزہ لیتا رہا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ بہت زیادہ خون بہہ گیا ہے اور اسے بالکل بھی ہوش نہیں آرہا ہے۔ ڈاکٹر آیا تھا، اس نے بھی جواب دے دیا ہے۔ سمجھیں، آپ کی بیٹی اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ جلدی سے آجائیں..... خدا حافظ۔'' تیزی سے یہ اطلاع دے کر فون بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

''میرا نام تو نہیں آئے گا نہ.....'' صاعقہ پریشان تھی۔

''ارے، تمہارا نام تو بالکل بھی نہیں آئے گا اس معاملے میں..... کسی کو ہم پر شک بھی نہیں ہوگا۔'' ایمن نے اسے تسلی دی۔ تو صاعقہ پھر بھی پریشان رہی۔

''ٹھیک ہے جلدی چلو۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ ہم نے یہ فون کیا ہے۔''

☆☆☆

''ارے کیا کر دیا تم خبیث لوگوں نے..... میری پھول سی بچی کو..... او کم بختو.....! ابھی صبح تو اچھی بھلی اسکول آئی تھی۔ کیسے مجھ سے کہہ رہی تھی..... اماں، مجھے بالکل ویسا ہی سوٹ بنا کر دو جیسا ہماری حساب کی استانی..... وہ انیلا نے مینا بازار پر پہنا تھا۔ کیسے بے چاری معصومیت سے کہہ رہی تھی میری بچی..... اماں وہ پیلا سوٹ اس کالی سیاہ رنگت والی پر بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا بلکہ ہیضہ پھیلانے والی مکھی لگ رہی تھی..... میری گوری رنگت پر بڑا جچے گا۔ ارے ابھی صبح ہی تو کہا تھا۔ چنگی بھلی تھی میری گڑیا..... پتا نہیں کیا کر دیا ان جلادوں نے۔'' رضیہ بتول بین کر رہی تھیں۔

آفس کا دروازہ گیٹ سے قریب ہی تھا۔ مس انیلا جو آفس میں کسی کام سے آئی تھیں باہر ہونے والی اپنی تعریف سن کر، غصے میں تلملاتے ہوئے باہر آگئیں۔ وہاں تقریباً آدھا اسکول جمع ہو چکا تھا۔ مس انیلا پہلے ہی سانولے بلکہ گہرے سانولے رنگ کی تھیں۔ اپنے بارے میں ریمارکس سن کر رنگ نیلا ہو گیا۔ وہ غصے میں دہاڑیں۔

''یہ کون بے وقوف، جاہل عورت ہے جو یوں آکر پاگلوں کی طرح بکواس کیے جا رہی ہے؟''

''ارے کون ہو تم؟'' رضیہ بتول نے اپنا رونا بھول کر کسی ولن کی طرح مس انیلا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''ماچس کی تیلی نہ ہو تو..... بتاؤ، میری معصوم بچی کو کیا کیا۔'' وہ مگرمچھ کی طرح منہ پھاڑ کے بولیں۔

اور وہ معصوم اور پھول جیسی بچی کو تو کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ اس کی ماں، اس کے لیے باہر استانیاں قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ معصوم اور پھول سی بچی اسٹاف روم میں ٹیچروں کے ٹیڑھے میڑھے بچوں کے لاڈ اٹھانے میں مصروف تھی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ چمچہ گیری کر رہی تھی تاکہ ٹیچرز اپنے ساتھ لائے ہوئے کھانوں میں سے کچھ اسے بھی دے دیں۔ اس سب سے انجان کہ باہر کیا ہو رہا ہے وہ معصوم اور پھول سی بچی شکیلہ بتول ٹیچرز کے بچوں کے اللے تللوں میں مگن تھی۔

''آئے ہائے بے غیرتو کہاں چھپایا ہے میری گلاب سی بچی کو.....'' عام حالات یعنی گھر میں رضیہ بتول اپنی شکیلہ کو ڈائن، چڑیل کلموہی..... پھٹکار پڑے منہ والی..... کیڑے پڑیں تجھے..... ہمارے گھر کا رزق چاٹ گئی۔ منحوس جس دن تیرا کالا سایہ اس گھر سے اترے گا، اس دن اس گھر میں سکون ہوگا جیسے القابات سے نوازی جاتی تھی یہ شکیلہ بتول اور یہاں اس کی ماں اسے اس بھول سے ملا رہی تھی جس کی وہ شکل سے تو دور کی



بات، نام سے بھی واقف نہیں تھی۔

''اب بتا بھی نہیں رہے ناس پیٹے۔ ارے بے دردوں مجھے اس کا آخری دیدار تو کرا دو۔'' رضیہ بتول نے باقاعدہ اپنا سینہ زور سے پیٹتے ہوئے کہا۔ وہ شاید سچ مچ تسلیم کر چکی تھیں کہ ان کی گل وگلزار، چمن کی بہار، اس دنیا سے کوچ کر گئی ہے۔ ''ان ناگنوں نے میری ہیرے جیسی دھی کو جانے کہاں چھپایا ہوا ہے۔'' وہ بین کر رہی تھیں۔

''ارے یہ کون پاگل عجوبہ ہے؟'' کھی کھی کرتی تماشائی لڑکیوں کے درمیان یہی سوال گونج رہا تھا۔

''ارے، یہ تو شکیلہ بتول عرف شکیلہ فضول کی اماں ہے۔'' ان میں سے ایک لڑکی نے بتایا۔

''یہ کس کے بارے میں کہہ رہی ہے کہ مار دیا ظالمو..... جلادو نے میری بچی کو..... اور ساتھ میں پھول جیسی بھی کہہ رہی ہے۔''

''شکیلہ کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں کہہ رہی ہوگی..... کیونکہ وہ تو پھول جیسی نہیں بلکہ پورے گھنے جنگل جیسی ہے۔ ویسی ہی خوفناک اور میلوں تک پھیلی ہوئی۔''

''یہ شکیلہ کے بارے ہی میں کہہ رہی ہے۔ سنا نہیں کہہ رہی ہے کہ میری دھی شکیلہ کو مار دیا ان قسائیوں نے۔''

''لیکن شکیلہ تو اسٹاف روم میں ٹیچروں کے کھائے ہوئے کھانوں والی پلیٹیں چاٹ چاٹ کر صاف کر رہی ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اس کی اماں پاگل ہو گئی ہے۔ اسی لیے ایسی بونگیاں مار رہی ہے۔''

''ایک بات اچھی کہی ہے اس کی اماں نے..... مس انیلا کے بارے میں..... قد لمبا ہونے سے کوئی کترینہ کیف نہیں بن جاتا..... اور یہ مس اپنے گہرے سانولے رنگ پر نیلا پیلا میک اپ کر کے خود کو ہیروئن سمجھتی ہیں۔'' تماشائی لڑکیوں کے دلوں میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ وہ مسلسل ریمارکس دیے جا رہی تھیں۔

''اب دیکھنا، اس ندیدی، دوسروں کے کھانوں پر نظر رکھنے والی شکیلہ کو یہ مس انیلا کیسا سبق سکھاتی ہیں۔''

لڑکیاں پھر سے کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔ رضیہ بتول نے اتنا واویلا مچایا کہ اب تو پورا اسکول ہی اسے دیکھنے کے لیے آگیا تھا۔ کسی لڑکی نے جا کر شکیلہ کو بتایا۔ جو واقعتاً ٹیچرز کی پلیٹوں میں بچا ہوا کھانا اندھا دھند کھا رہی تھی۔ کسی ٹیچر کا بچہ اس کے ساتھ بیٹھا گلا پھاڑ کر رو رہا تھا مگر شکیلہ کو فرصت کہاں تھی۔ اسے نہ تو کوئی بچہ نظر آرہا تھا اور نہ لڑکی دکھائی دی تھی۔ نگاہ میں تھا تو صرف بچا ہوا کھانا۔

''ارے شکیلہ، وہ باہر تمہاری اماں آگئی ہیں۔ انہوں نے بہت ہی اچھی فلم چلا رکھی ہے۔ اس فلم کا نام ہے استانیوں کی کم بختی!'' ڈھیٹ لڑکی نے اسے متوجہ کر کے کہہ ہی دیا اور مذاق اڑانے والے انداز میں کہہ کر چلی گئی۔

پہلے تو شکیلہ کو یقین نہیں آیا..... مگر جب تین چار لڑکیوں نے آکر اسے بتایا تو وہ جنگلی سانڈ کی طرح بھاگتے ہوئے باہر آگئی۔ سامنے والا منظر اسکول گرلز کے لیے تو تفریح کا باعث تھا لیکن شکیلہ کے لیے نہایت شرمندگی والا تھا۔ سامنے اس کی اماں آفس کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے۔ لیٹنے والے انداز میں بیٹھی بین کر رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنی اماں کے پاس گئی اور اماں کو پکارا مگر وہ اپنی آنکھیں بند کیے یہی گردان کیے جا رہی تھی۔

''میری دھی کا سر پھاڑ دیا..... میری بیٹی کو کھا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے یہ..... میری پھول سی بچی کو مار دیا انہوں نے..... میری شکیلہ مرگئی۔"

"اماں آنکھیں کھولو..... میں شکیلہ ہوں۔" رضیہ بتول نے یک دم آنکھیں کھول دیں۔ "دیکھو اماں..... میں ٹھیک ہوں..... تمہاری بیٹی شکیلہ۔"

"تم میری شکیلہ نہیں ہوسکتیں۔" اماں نے فوراً فیصلہ دے دیا۔ "تم کوئی اور ہو شکیلہ جیسی دکھنے والی۔"

"ارے اماں، میں ہی ہوں۔" اس نے پھر سے رقت آمیز انداز میں یقین دہانی کروائی۔

"تم شکیلہ نہیں ہوسکتیں۔ تم تو کہیں سے بھی مری ہوئی نہیں لگ رہی ہو۔" اماں کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ اصلی شکیلہ کو بھی پہچان نہیں رہی تھی۔

"اماں۔" شکیلہ چیخی مگر وہ اپنی ہی دُھن میں بین کیے جارہی تھی۔

"اماں!" ایک دم شکیلہ اپنے آپ میں نہ رہی اور اماں کو کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے جھنجوڑنے لگی اور زور سے چیخی۔ "کیا ہوگیا ہے آپ کو..... کس نے کہہ دیا ہے کہ میں مرگئی ہوں۔ دیکھیں میں زندہ ہوں..... ہوش میں آئیں آپ۔" اس کے لہجے میں شرمندگی کے ساتھ بدتمیزی گھلی ملی ہوئی تھی۔

"ہائیں..... تم زندہ ہو؟" اب اماں کو سکتہ ہو گیا۔

"خالہ! آپ کو شکیلہ کے بارے میں یہ غلط خبر دی کس نے تھی؟" کسی نے پوچھا۔

"یہیں اسکول ہی سے مجھے فون آیا تھا کہ شکیلہ کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے اور وہ اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ بس یہی سن کر میں پریشان ہوگئی اور بھاگ آئی یہاں پر ورنہ مجھے کون سے پاگل کتے نے کاٹا تھا یا مجھے کوئی شوق ہے یہاں تماشا لگانے کا۔" اماں نے کہا۔

"ویسے ایسی حرکت کی کس نے ہوگی؟" اس چھکے دار لڑکی نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

"ہاں بیٹی، میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" رضیہ بتول بولی۔

"آپ کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں ہے؟" وہ چھکے باز لڑکی خرانٹ اور عمر رسیدہ رپورٹر کی طرح انٹرویو کرنے لگی تھی۔

"دشمنی!" رضیہ بتول سوچنے والے انداز میں بولی۔ "ہاں دشمنی ہماری..... ایسا کوئی نہیں ہے جس سے نہ ہو..... کیونکہ میں ایک بہت ہی سادہ مزاج، نیک سیرت اور حد سے زیادہ صاف گو خاتون ہوں۔ اسی باعث سبھی مجھ سے جلتے ہیں اور میرے دشمن بن جاتے ہیں۔" وہ اسٹیج پرسن کے سامنے مہمان بنی سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

"ویسے اتنی بہادری..... بلکہ زیدہ دلیری سے کون حرکت کرسکتا ہے؟" چھکے باز لڑکی نے مزید تفتیش کی۔ ویسے چھکے بازوں کا بھی کوئی حال نہیں ہوتا۔ ان کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگتے ہیں اور باچھوں سے جھاگ بہنے لگتا ہے جب تک انہیں کوئی کرارا سا چھکا نہ مل جائے۔

"یہ کیا تماشا ہورہا ہے؟" اچانک مردانہ آواز سنائی دی۔ یہ آواز تو مردانہ تھی۔ لیکن کسی مرد کی نہیں بلکہ اسکول پرنسپل میڈم بلقیس حیات کی تھی۔ وہ گرج دار آواز میں بولیں۔ ان کی آواز سن کر تمام لڑکیاں مکھیوں کے مانند اِدھر اُدھر اڑ گئیں۔

"ارے کوئی مجھے بھی بتائے گا کہ یہاں کیا ہورہا ہے اور کون ہے یہ عورت.....؟" میڈم بلقیس نے گرج دار آواز میں جھنجلاتے ہوئے پوچھا۔ تمام



لڑکیاں اِدھر اُدھر رفو چکر ہوگئی تھیں۔ وہاں تھیں تو رضیہ بتول، شکیلہ اور عجیب سی صورتوں والی دو تین استانیاں۔ رضیہ بتول نے اپنے مخصوص انداز میں الف سے لے کر یے تک سارا واقعہ جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا میڈم کے گوش گزار کردیا۔ یہ سب سن کر میڈم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان کا رنگ فق ہوگیا۔ آنکھوں سے شعلے برسنے شروع ہوگئے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ رضیہ بتول کے خوب لتے لیتیں۔ مگر اس وقت وہاں آفیسر کھڑے تھے۔ وہ میٹنگ ہی اس سلسلے میں کرنے آئے تھے کہ ان کے اسکول میں ڈسپلن نام کی کوئی شے نہیں ہے اور میڈم نے نہ جانے کون کون سے دلائل دے کر ان کو سمجھایا تھا کہ ان کے اسکول کا ڈسپلن علاقے کے کسی اسکول میں بھی نظر نہیں آئے گا۔

"یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟" ان میں سے ایک افسر نے پوچھا۔ "آپ کے اسکول کا ڈسپلن کہاں گیا؟" وہ دنیا جہاں کا قہر اپنے لہجے میں سموئے میڈم بلقیس حیات سے پوچھ رہا تھا۔ "یہ کوئی بات ہوئی بھلا۔ کسی نے آپ ہی کے آفس سے، آپ ہی کی اسٹوڈنٹ کے گھر فون کیا کہ آپ کی بچی مرگئی ہے اور یہاں آکر پتا چلا کہ کچھ ہوا نہیں کمال ہے..... یہ ہوتا ہے اسکول کا ڈسپلن؟"

"دیکھیں سر! اس عورت کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" میڈم بلقیس کے منہ میں آخری لفظ تھے کہ رضیہ بتول تنک کر بولیں۔

"ایویں، مجھے کیوں غلط فہمی ہونے لگی۔ وہ تمہارے ہی اسکول کا نمبر تھا۔ اسی وجہ سے میں یہاں آئی..... ورنہ مجھے دورہ پڑا ہے کہ محلے کا میلا دھوڑ کر یہاں آتی۔"

"دیکھیں سر! یہ عورت فضول بول رہی ہے۔ ہمارے اسکول کا ڈسپلن بہت ہی سخت ہے۔ یہاں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔" میڈم منمنائی۔

"آپ ڈسپلن جیسے لفظ کو اپنے اسکول کے نام پر استعمال کر کے کیوں بے چارے لفظ کی توہین کر رہی ہیں۔"

"دیکھیں سر! آپ میری بات تو سنیں۔" میڈم منت کرنے والے انداز میں بولیں۔

"ہمیں نہ کچھ سننا ہے اور نہ ہی کچھ دیکھنا ہے..... اب آپ کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا۔"

"سر پلیز..... آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" میڈم رو دینے کو تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" پہلے دو افسران میں سے ایک بولا۔ وہ تھوڑا رحم دل افسر لگ رہا تھا۔ "میں اس معاملے میں آپ کو بچا سکتا ہوں..... مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیا؟" میڈم جھٹ سے بولیں۔

"آپ کو پتا ہے کہ میٹرک کے امتحان ہونے والے ہیں۔ میری اور ان کی بیٹی کا سینٹر آپ ہی کا اسکول بنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بیٹیوں کا امتحان کے دنوں میں خاص خیال رکھا جائے۔ ان دونوں کے سو میں سے ننانوے فیصد نمبر آنے چاہئیں۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ..... ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں میں سمجھ گئی ہوں۔" میڈم اس وقت کچھ بھی کرنے کو تیار تھیں۔ سو اُن کی بات فوراً مان لی۔

وہ افسر خوشی خوشی وہاں سے چلے گئے۔ مفت میں ان کی نالائق بیٹیاں ننانوے فیصد نمبر حاصل کر لیں گی۔ حالانکہ انہوں نے سارا سال اسکول میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آوارہ گردی کی تھی اور فیشن ہی کو اہمیت دی تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد میڈم کا رخ رضیہ بتول کی طرف تھا۔

''ارے او مائی، کوئی خدا کا خوف ہی کرلیا ہوتا تم نے..... تمہاری وجہ سے آج میری نوکری چلی جاتی تھی اور اگر تمہارے گھر میں فون چلا بھی گیا تھا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ویسے بھی تم نے ایسی بچی کو رکھ کر کرنا کیا ہے؟ سارا دن اِدھر سے اُدھر..... اُدھر سے اِدھر کبھی کسی استانی کے پیچھے، کبھی کسی استانی کے پیچھے مکھی بنی بھنبھنا رہی ہوتی ہے۔ پڑھائی کرتی نہیں۔ دسمبر ٹیسٹ کے چار پرچوں میں فیل ہے یہ نالائق لڑکی۔''

''کیا بی'' اچانک رضیہ بتول کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ رضیہ نے شکیلہ کو بالوں سے پکڑا اور دو تین تھپڑ رسید کردیے۔

''فی منٹوس، میں تجھے یہاں پڑھنے مرنے کے لیے بھیجتی ہوں اور تو یہاں چاکریاں کرنے پر تلی ہوئی ہے..... میرا نام خوب بدنام کیا ہے تم نے'' رضیہ کا رنگ خطرناک حد تک سرخ ہوگیا تھا۔

''اچھا، اب تم جاؤ اپنے گھر۔'' میڈم نے رضیہ بتول سے کہا پھر رخ پھیر کر بولیں۔ ''اور تم! جا کر پڑھائی پر توجہ دو..... جتنی چاپلوسی تم استانیوں کی کرتی ہو..... اتنی پڑھائی کی بھی چاپلوسی کرلیتیں تو کبھی فیل نہ ہوتیں۔''

میڈم بلقیس نے رضیہ بتول اور شکیلہ بتول کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر بھیج دیا اور سوچنے لگیں کہ آخر ایسی گھٹیا حرکت کس نے کی؟ میڈم نے تمام ملازم اور ملازماؤں کو آفس میں بلایا اور کسی کرخت اور ظالم تھانے دار کی طرح ان بے چاروں سے تفتیش کرنے لگیں۔

''بتاؤ کام چورو، میرے آفس میں کون آیا تھا۔ بتاؤ، ورنہ تم سب کو اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔''

''جی میڈم صاحبہ.....'' ایک ملازم نے کہا تو اس کی آواز ڈر کے مارے بیمار بکری جیسی نکل رہی تھی۔ ''ہم نے کسی کو بھی یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

ڈر کے مارے تمام ملازمین کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اوپر سے میڈم نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''اگر یہاں کسی کو بھی آتے نہیں دیکھا تو پھر فون کوئی جن کر گیا..... اور فون کر کے غائب ہوگیا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا.....''

''جی میڈم.....'' ایک ملازمہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پھر حوصلہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ میں نے آفس میں کچھ ٹیچرز کو جاتے دیکھا تھا۔ شاید انہوں نے فون کیا ہو۔''

''ماشاء اللہ! صدقے جاؤں تمہاری عقل پر، تمہیں کیا لگتا ہے کہ ٹیچرز کے دماغ ان کے سروں سے نکل چکے ہیں جو وہ ایسی بے وقوفوں والی حرکت کریں گی۔'' میڈم کو مزید غصہ آگیا۔ ان کا غصہ جائز تھا کیونکہ آج تو ان کی اپنی نوکری پر بن آئی تھی۔ سب خاموش رہے کہ میڈم نے ان سب کو چلے جانے کا کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر سوچنے لگیں۔ تبھی ان کی نگاہ اپنے ٹیبل کے کونے پر پڑے رجسٹر پر پڑی۔

''ارے، اس کو تو اٹھا..... یہ کیا گند یہاں پھیلا رکھا ہے..... میرے ٹیبل کو تم لوگوں نے کوڑے کا ڈھیر سمجھا ہوا ہے۔ اٹھاؤ اسے.....'' میڈم نے خالہ سے کہا۔ وہ رجسٹر اٹھانے لگی تو میڈم کی نگاہ رجسٹر پر درج نام پر پڑی۔ اس کے اوپر جس ہستی کا نام لکھا



ہوا تھا وہ کوئی اور نہیں تھی، وہ میڈم بلقیس حیات کی اپنی اکلوتی لاڈلی اور مستقبل میں ہونے والی بہو، ان کی بھانجی ایمن احمد کا تھا۔

''ارے، یہ ایمن کا رجسٹر یہاں.....'' یہ کہتے کہتے وہ چونک گئیں۔ میڈم نے خالہ سے پوچھا۔ ''میرے آفس میں ٹیچرز کے علاوہ کوئی لڑکی بھی آئی تھی؟''

''جی میڈم، ایک نہیں دو لڑکیاں آئی تھیں۔ ایک تو آپ کی بھانجی ایمن تھی اور اس کے ساتھ، اس کی سہیلی تھی بس اور تو کوئی نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ایمن اور اس کی سہیلی کو میرے آفس میں بھیجو، جلدی کرو۔'' میڈم نے کہا اور بڑے گہرے انداز میں سوچنے لگیں۔

☆☆☆

''کہیں میڈم کو پتا تو نہیں چل گیا کہ وہ سارا تماشا ہماری وجہ سے ہوا؟'' سدا کی ڈرپوک صاعقہ کا دم نکلا جا رہا تھا۔ دل تھا کہ زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں الگ کانپ رہی تھیں۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' ایمن نے اسے تسلی دی۔

''اگر انہیں پتا چل گیا تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گی کیونکہ تم ان کی بھانجی ہو اور میں..... میں تو ان کی کچھ نہیں لگتی۔'' صاعقہ ڈرے چلی جا رہی تھی۔

''میں نے تم سے کہا نا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس تم اپنی شکل کے زاویے ٹھیک کرلو..... ایسا لگ رہا ہے جیسے مجبوراً تم سے ڈاکا ڈلوایا جا رہا ہے..... اور تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ آنٹی بلقیس مجھے کچھ نہیں کہیں گی۔ میرے ساتھ تو ان کی ویسے ہی نہیں بنتی۔ ہر وقت اپنے پرنسپل ہونے کا رعب میرے امی ابو پر ڈالتی رہتی ہیں۔ وہ مردانہ وار سی عورت صرف نام



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی کی خالہ ہیں..... سچ پوچھو تو میں ترس ہی گئی ہوں ان کے منہ سے اپنے لیے کوئی اچھی بات سننے کے لیے۔"

وہ دونوں آفس میں تھیں۔ میڈم خطرناک حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہی تھیں۔

"آپ نے بلایا ہمیں میڈم؟" ایمن بولی۔

"جی ہاں، میں نے ہی آپ کو بلوایا ہے۔" میڈم بلقیس طنزیہ بولیں۔ صاعقہ کی حالت تو مرنے والی ہو گئی تھی۔ ایمن نے اسے گھورا کہ خود پر قابو پائے۔

"یہ رجسٹر تمہارا ہے؟" ایمن سے سوال کیا گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو ایمن کی حالت بھی غیر ہو گئی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو کر کے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"جی میرا ہے۔" اس نے اپنا تمام ڈر چھپاتے ہوئے اعتماد سے جواب دیا۔

"تو یہاں کیا انڈے دے رہا ہے؟" میڈم ایک دم سے دہاڑیں اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ زور سے رجسٹر پر دے مارا۔ صاعقہ کا تو ڈر کے مارے برا حال تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"وہ میڈم جی! ہم مس نازیہ کے ایک کام سے آفس میں آئے تھے۔ جلدی میں رجسٹر یہیں بھول گئے۔ اگر آپ ہمیں نہ بلواتیں تو پیریڈ ختم ہونے کے بعد ہم خود اسے لینے آنے والے تھے۔"

"بکواس بند کرو۔" میڈم کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ "مس نازی صبح نو بجے چھٹی لے کر یہاں سے چلی گئی اور تم دونوں تقریباً گیارہ بجے آفس میں آئی تھیں۔ مجھے پتا چل چکا ہے کہ تم نے ہی فون کر کے شکیلہ کی ماں کو یہاں بلایا تھا۔"

"میڈم جی آپ ہم پر الزام لگا رہی ہیں اور ہمیں کیا ضرورت ہے، شکیلہ کے گھر فون کرنے کی۔" ایمن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارے واہ..... ایک تو چوری، اوپر سے سینہ زوری..... اے لڑکی، تم بتاؤ۔" اب میڈم کا بھاری میک اپ والا چہرہ صاعقہ کی طرف تھا جو ویسے ہی وفات پانے والی تھی۔

"بتاؤ، تم لوگوں نے ہی فون کیا تھا نا..... بتاؤ! ورنہ ایسی سزا دوں گی کہ تمہاری آنے والی سات پشتیں کانپ اٹھیں گی اور تمہیں پانچ سال تک کسی اور اسکول میں داخلہ بھی نہیں ملے گا..... سوچ لو۔ اگر تم نے مجھے سچ بتا دیا تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔" میڈم نے سچ جاننے کے لیے آفر رکھ دی۔ وہ تو پہلے ہی سزائیں سن سن کر بے ہوش ہونے والی تھی۔ آفر کی امید پاتے ہی مری ہوئی آواز میں بولی۔

"میڈم جی! میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے ایمن یہاں ورغلا کے لائی تھی۔ میں نے تو اسے بڑا روکا تھا لیکن....."

"بس۔" میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "جاؤ صاعقہ تم اپنی کلاس میں جاؤ اور پڑھائی کرو اور اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ چلو جاؤ شاباش۔" میڈم میں کوئی اور اچھائی ہو نہ ہو، یہ اچھائی ضرور تھی کہ وہ وعدہ خلاف ہرگز نہیں تھی۔ صاعقہ نے ایمن کی جانب شرمندہ ہو کر دیکھا مگر ایمن سپاٹ چہرہ لیے ایک دم ساکت کھڑی تھی۔ صاعقہ کلاس میں چلی گئی تو ایمن نے سوچا۔

"لعنت ہو اس چھپکلی پر۔ بچپن کی دوستی توڑ دی اپنی جان بچانے کے لیے۔ بیڑہ غرق ہو اس کا۔"

"میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ اب جو بھی کہے گی تمہاری ماں ہی تم سے کہے گی۔" میڈم یہ



کہتے ہوئے اٹھیں، اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر آفس سے باہر آ گئیں۔

☆☆☆

"ارے، آج خالہ بھانجی اکٹھے کیسے آ رہی ہیں اور وہ بھی چھٹی سے پہلے..... خیریت تو ہے نا؟" ان دونوں کو دیکھ کر ایمن کی امی انیس حیات نے قدرے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"یہ لو اپنی بیٹی۔" بلقیس حیات نے ایمن کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تنفس سے کہا۔ "تمہاری بیٹی بہت ہی اچھی ہے اور حد سے زیادہ سمجھ دار..... ہم برے لوگ ہیں اور بے وقوف بھی..... ہم تمہاری بیٹی کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں معاف کر دینا۔ ہم اسے اپنی بہو نہیں بنا سکیں گے..... اور سنو..... کل سے تم اسے اسکول بھی مت بھیجنا۔ اس کی رول نمبر سلپ میں اِدھر گھر ہی بھیج دوں گی۔ یہ اپنے میٹرک کے امتحان کے لیے گھر میں بیٹھ کر تیاری کرے ٹھیک ہے..... میں چلتی ہوں۔"

"باجی۔" انیس حیات نے جاتی ہوئی بلقیس حیات کو انتہائی حیرت سے آواز دی۔ "آپ بتائیں تو سہی، آخر ہوا کیا ہے جو ایمن کا بچپن کا طے رشتہ ایک جھٹکے میں توڑ رہی ہیں؟"

"اپنی بیٹی ہی سے پوچھو۔" بلقیس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا جبکہ ایمن بالکل ساکت کھڑی تھی۔

"خدا کے لیے باجی، آپ ہی کچھ بتا دیں۔" وہ رونے لگیں۔ کیونکہ وہ محسوس کر چکی تھیں کہ بات معمولی نہیں ہو گی ورنہ باجی یوں رشتہ ختم نہ کرتیں۔ تب بلقیس نے اپنی بہن انیس کو روتے دیکھ کر ساری بات بتا دی۔ بات سنتے ہی انیس غصے میں سرخ ہو گئیں۔ انہوں نے زناٹے دار تھپڑ ایمن کے گال پر

### صدمہ

جن کے ملنے کی نہیں دور تک کچھ امید
ان کے کھو جانے کا خدشہ بھی بہت ہوتا ہے
جن پہ ہوتا ہے مان بہت گہرا تبھی
وہ بدل جائیں تو صدمہ بھی بہت ہوتا ہے

مرسلہ: صبا نور، لیہ

رسید کیا اور بلقیس سے کہنے لگیں۔

"باجی! میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ پلیز اسے معاف کر دیں۔" وہ روتے ہوئے منت کرنے والے انداز میں بولیں۔

"دیکھو انیس! اگر یہ اس کی پہلی غلطی ہوتی نا تو میں اسے معاف کر دیتی۔ اس نے پہلے بھی ایسی بہت سی غلطیاں کی ہیں جس کا تمہیں علم ہی نہیں تھا۔ میں نے بھی اتنی توجہ نہیں دی جو میری غلطی تھی۔ اسے دوسروں کا مذاق اڑا کر سکون ملتا ہے۔ یہ صرف اپنی تسکین کے بارے میں سوچتی ہے۔ دوسروں کا اسے احساس نہیں کہ ان کے دل پر کیا گزرتی ہے اور کیا تم اس کی فطرت سے واقف نہیں ہو؟"

"دیکھیں باجی! یہ آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دیں آپ۔" انیس نے التجا کی۔

"میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی، معاف کرنے والا تو خدا ہے، تم اپنی بیٹی کے لیے اسی سے ہدایت مانگو کیونکہ اس کے علاوہ اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔" بلقیس بیگم نے کہا اور اسی لمحے مڑ کر دروازے سے باہر چلی گئیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناولٹ

# قربتوں کی دوری

بنوات پرنس

## آخری حصہ

اینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک لمحے کو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ مولوی فضل کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالا شاپر تھا جسے وہ بہت احتیاط اور مکمل توجہ کے ساتھ بس سے نیچے اتارنے میں مصروف تھا۔ اس کی نظر ابھی اینہ پر نہیں پڑی تھی۔ اینہ کے ذہن نے اس وقت بہت برق رفتاری سے ساتھ کام کیا۔ وہ بے حد تیزی کے ساتھ مڑی اور چند قدم پر بیٹھی ہوئی کچھ دیہاتی خواتین کے ساتھ







Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمین پر بیٹھ گئی۔ چہرہ تو اس کا چادر میں چھپا ہی ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ بس کی جانب پشت کر کے سر جھکا کر ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کی آڑ میں ہوگئی۔ اس عورت نے سندھی میں اس سے کچھ پوچھا تو وہ آہستہ آہستہ ٹوٹی پھوٹی سندھی میں اس سے باتیں کرنے لگی تاکہ دیکھنے والوں پر یہ ظاہر ہو کہ وہ بھی ان عورتوں کے ساتھ ہی ہے اور بس کے آنے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ مولوی فضل اپنی ہی دُھن میں مگن اپنا بڑا سا تھیلا سنبھالے ان لوگوں کے نزدیک سے گزر گیا لیکن امینہ دھڑ دھڑاتے ہوئے دل کے ساتھ انہی عورتوں کے درمیان بیٹھی رہی مبادا وہ کسی وجہ سے دوبارہ نہ پلٹ آئے۔ تبھی ایک اور بس دوسری سمت سے آتی ہوئی نظر آئی تو وہ عورتیں اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کھڑی ہوگئیں امینہ بھی جلدی سے انہی کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سامنے سے آنے والی بس کہاں جارہی ہے۔ وہ تو جلد از جلد اس علاقے سے بہت دور نکل جانا چاہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ مولوی فضل کو گھر پہنچ کر اس کے فرار کے بارے میں پتا چلتا وہ تو اس وقت یہ بھی بھولنا چاہ رہی تھی کہ وہ ابھی بھی مولوی فضل کی منکوحہ ہے اور اس کا امینہ پر پورا حق ہے۔ امینہ نے یہ اتنا بڑا اقدام محض عندلیب کے بھروسے پر اٹھایا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے پورا یقین تھا کہ عندلیب اسے مولوی فضل سے نجات دلانے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ وہ ان عورتوں کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بس میں سوار ہوگئی۔ اور جب تک بس نہیں چل پڑی امینہ کی جان جیسے سولی پر لٹکی رہی۔ بار بار وہ خوفزدہ نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ہر آدمی پر اسے جیسے مولوی فضل کا گمان ہونے لگتا۔ لبوں پر ڈھیر ساری دعائیں لیے وہ بس کے چلنے کی منتظر تھی۔

آس پاس کے مسافروں سے اسے اتنا تو پتا چل ہی گیا تھا کہ بس کراچی نہیں بلکہ میر پور خاص جارہی ہے۔ امینہ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میر پور خاص کا ٹکٹ کٹوا لیا تھا اور اب سر جھکائے بس کے چلنے کی منتظر تھی جو کسی طرح چل کر نہیں دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے بھیا...... بس کیوں نہیں چل رہی؟'' اس نے پریشان ہو کر آگے سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک دیہاتی سے پوچھا۔

''ڈرائیور اور کنڈیکٹر چائے پینے سامنے والے ہوٹل میں گئے ہیں جب وہ آئیں گے تب ہی تو بس چلے گی۔'' دیہاتی نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا تو وہ مزید ہراساں ہوگئی۔

''بھیا انہیں جلدی بلوا دو، میری ماں بیمار ہے مجھے جلدی پہنچنا ہے۔'' اس نے بہت ملتجی لہجے میں اس آدمی سے درخواست کی تو اس نے استہزائیہ انداز میں امینہ کو دیکھا۔

''ارے بہن، میرے کہنے سے گاڑی اگر چلتی تو میں ہمیشہ اتنی دیر دیر تک بس میں بیٹھا خوار نہ ہوا کرتا۔ وہ لوگ اپنے وقت سے آئیں گے تم بھی صبر سے بیٹھ کر اپنی ماں کے لیے دعا کرتی رہو۔'' امینہ نے بہت مایوس ہو کر اس کا جواب سنا اور اپنے گرد چادر کو مزید تنگ کرتے ہوئے بے صبری سے ڈرائیور کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ایک ایک پل جیسے اسے ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ پورا جسم پسینے سے شرابور ہونے لگا۔

''میرے مالک مجھے خیریت سے میری منزل تک پہنچا دے۔ مجھے میرے ایک غلط فیصلے کی اتنی بڑی سزا نہ دے۔'' اس نے دل کی گہرائیوں سے اپنے اللہ کو پکارا اور پھر جیسے اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا کیونکہ بس ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوگئی



تھی۔ پتا نہیں کب ڈرائیور آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا، اپنی پریشانی اور خوف میں اسے پتا ہی نہیں چلا۔ بس کے چلتے ہی اس نے سکون کی ایک گہری سانس لے کر بس کی کھڑکی پر اپنا سر ٹیک دیا۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے اس کے چہرے کو ایک عجیب سی فرحت کا احساس بخش رہے تھے۔ جوں جوں بس کی رفتار تیز ہو رہی تھی اس کی روح میں ایک گہرا اطمینان اترتا جا رہا تھا۔ میر پور خاص پہنچ کر اسے وہاں سے کراچی کے لیے بس پکڑنی تھی اور پھر وہاں سے اسے سیدھے مسز رازی کے گھر جانا تھا اور ان سے اور عندلیب سے پاؤں پڑ کر معافی مانگنی تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ لوگ اسے معاف کر دیں گے کیونکہ مسز رازی کا امینہ کے بغیر گزارہ بھی تو نہیں تھا۔ دل ہی دل میں پلاننگ کرتے ہوئے نہ جانے کب وہ نیند کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

میر پور خاص کے بس اسٹاپ سے تھوڑی ہی دیر بعد اسے کراچی کے لیے بس مل گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ایک اذیت ناک زندگی اور ایک ظالم و جابر جنونی شخص کی قید سے آزاد ہو چکی ہے گو کہ فی الحال یہ رہائی وقتی تھی لیکن وہ پُریقین تھی کہ اب اس وحشی انسان اور ان اندوہ ناک لمحات سے پھر کبھی اس کا سامنا نہیں ہوگا۔ رحیم نے اسے کچھ خوشیوں کا لالچ دے کر اس سے اس کی زندگی کا... بے حد خوفناک امتحان لے لیا تھا۔ ایسا امتحان جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''اگر عندلیب بی بی نے مجھے اس شخص سے نجات دلوا دی تو میں ان سے سچے دل سے وعدہ کراؤں گی کہ آئندہ رحیم کا سایہ بھی میری زندگی میں نہیں آئے گا۔'' اس نے تصور میں عندلیب بی بی کا پیر پکڑ کر اپنے آپ کو گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تو خود بخود مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ اب وہ بہت اطمینان سے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھی جب اچانک ہی تیز رفتاری سے چلتی ہوئی بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔

''کیا ہوا بھائی، ارے یہ بس کیوں رک گئی؟''

بہت سی ملی جلی آوازیں بس میں گونجنے لگیں تب ہی تین چار ڈاکو منہ پر کالا ڈھاٹا باندھے ہوئے تیزی سے بس کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں وزنی بندوقیں تھیں۔ ایک ڈاکو جو شاید پہلے سے ہی بس میں سوار تھا وہ ڈرائیور کی کنپٹی پر بندوق رکھے ہوئے کھڑا تھا۔ اونگھتے ہوئے اور اپنے آپ میں مگن مسافروں نے نوٹ ہی نہیں کیا تھا کہ کب یہ شخص اٹھ کر ڈرائیور کے پاس چلا گیا تھا۔ مسافروں میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا...... کچھ عورتیں بے اختیار چیخنے لگیں۔

''خبردار! اگر کسی کے منہ سے ایک آواز بھی نکلی تو...... اسے ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولیوں سے بھون دیں گے۔'' ایک ڈاکو نے غراتی ہوئی آواز میں زور سے کہا تو جیسے پوری بس میں موت جیسا سناٹا چھا گیا لیکن پتا نہیں کیوں امینہ کو کسی ڈر اور خوف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا جو یہ ڈاکو لوٹ لیتے۔ کچھ پیسے تھے جن سے اسے کراچی تک پہنچنا تھا اور وہ اس نے اپنی بڑی سی چادر کے ایک کونے میں باندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنے غم، اتنے دکھ اور اتنے ستم اور پریشانیاں دیکھی تھیں کہ ڈاکوؤں کا خوف ان سب چیزوں کے سامنے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔ ویسے بھی کراچی میں کام سے اپنے گھر واپس جاتے ہوئے بس میں اسے ایک ایسی ہی سچویشن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس وقت رحیم سے اس کی طلاق نہیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھی اور رحیم نے اس کی تنخواہ چھن جانے پر اس کی کافی پٹائی بھی کی تھی۔ اس وقت وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ڈاکوؤں کو لوٹ مار کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی تبھی ایک ڈاکو اس کے نزدیک آگیا۔

''نکالو مائی..... جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے۔''

''میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، مجھے میرے شوہر نے نکال دیا ہے، میں بے سروسامانی کے عالم میں اپنی ماں کے پاس جارہی ہوں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا لیکن اس جھوٹ میں بہت ساری سچائیاں بھی جھانک رہی تھیں۔

''بکواس مت کرو، شرافت سے اپنے زیور اور پیسے میرے حوالے کردو ورنہ جان سے جاؤ گی۔'' ڈاکو کے لہجے کی کرختگی اسے سہما گئی۔

''ڈاکو بھائی، خدا کے لیے مجھے جان سے مار دو۔ میں تو خود زندہ نہیں رہنا چاہتی۔'' وہ بے اختیار رودی۔ اتنے دنوں کی گھٹن جیسے آنسوؤں کے ذریعے باہر آنے لگی۔

''ارے ہمارے پاس ان ڈراموں کے لیے وقت نہیں، آگے چل۔'' دوسرے ڈاکو نے پہلے کو ٹوکا۔

''نہیں، اس کا مطلب ہے کہ اس نے کافی زیورات پہنے ہوئے ہیں تبھی یہ ڈراما کررہی ہے۔'' اس نے زور سے امینہ کی چادر کھینچی۔

''اوئے، میں نے تمہیں عورتوں کی بے عزتی کرنے سے منع کیا تھا نا؟'' تیسرا ڈاکو جو پچھلی سائڈ پر کھڑا تھا برق رفتاری سے ان دونوں کے نزدیک آگیا۔ امینہ زاروقطار رونے لگی۔ ڈاکو اس کے ننگے کان اور سونے ہاتھ دیکھ کر آگے بڑھ گیا تھا جبکہ تیسرا ڈاکو اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''تو رحیم کی بیوی ہے نا..... ؟'' اس نے بہت سرگوشی میں پوچھا تو امینہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی جس نے اپنا چہرہ کالے نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔

☆☆☆

عفان شدید شاکڈ کے عالم میں بس اسے دیکھتا رہ گیا جو ایمان کو اگنور کرتے ہوئے بہت بے قراری کے عالم میں اس کی جانب بڑھی تھی۔

''عفان بتائیں نا آپ کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟'' اس نے جیسے دیوانگی کے عالم میں اس کے سر پر بندھی پٹی پر اپنا ہاتھ پھیرا جسے عفان نے بے حد الجھ کر ہٹادیا۔

''رومی، میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ خدارا مجھے بخش دو، میری خطا معاف کردو ورنہ اگر میں پہلے نہیں مرا تو اب ضرور مرجاؤں گا۔'' عفان ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا تو اس کی پٹی پر ہلکا سا خون کا دھبا آگیا۔ رومی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایمان نے عفان کو اتنے غصے اور جنون میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس وقت اس کا اتنا زیادہ جذباتی ہونا اس کی حالت کو مزید بگاڑ سکتا تھا، یہ بھی وہ اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی لیکن پھر بھی بس وہ یک ٹک ان دونوں کو دیکھے گئی۔

اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ رومی یوں اچانک وہاں آجائے گی۔ دل میں امڈتے عفان کے لیے نرم جذبات ایک بار پھر نفرت کے غبار میں چھپنے لگے۔

رومی نے وہیں زمین پر بیٹھ کر گھٹنوں کے گرد اپنے بازو حائل کر کے ان میں اپنا منہ چھپالیا۔ دراز گیسو اس کے چاروں طرف بکھر گئے۔ اس نے ایک نظر بھی ایمان کے اوپر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

''رومی پلیز، تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' عفان کا



لہجہ مزید سخت ہوگیا۔

''میرے خیال میں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے تاکہ آپ لوگ اطمینان سے اپنے اپنے دل کا حال کہہ سکیں۔'' ایمان کو پتا نہیں کیوں یہ سب ایک ڈراما محسوس ہورہا تھا اور یہ سین تو جیسے اس کی برداشت سے بالکل ہی باہر تھا۔ وہ نہایت غصے کے عالم میں اٹھ کر باہر جانے لگی۔

''ایمان تمہیں میری جان کی قسم ہے جو تم مجھے چھوڑ کر گئیں۔'' عفان نے بے تابانہ اسے پکار کر روکنا چاہا۔

''آپ کی جان تو آپ کے پاس آگئی ہے۔ قسمیں وعدے سب اسی کے ساتھ کیجیے۔'' وہ بے رحمی سے کہتے ہوئے آگے بڑھی تو عفان ایک جھٹکے سے ڈرپ کلائی سے نکالتا ہوا تیزی سے بیڈ سے نیچے اتر آیا۔

''ایمان میری بات تو سنو۔'' شدید نقاہت اس کی آواز میں امڈ آئی، دوسرے ہی لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے گرد گہرا اندھیرا چھارہا ہے۔ رومی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی غیر ہوتی ہوئی حالت کو محسوس کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دینا چاہا تو اس نے نفرت سے اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔

''ایمان اگر آج تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے دور چلا جاؤں گا۔'' عفان نے زور سے اپنے سر پر بندھی پٹی نوچی۔

''عفان، یہ آپ کیا کررہے ہیں۔'' رومی نے چیخ کر اسے روکنا چاہا تو دروازے سے نکلتی ایمان نے بے اختیار مڑ کر پیچھے دیکھا جہاں عفان جنونی انداز میں اپنی پٹی کو نوچنے کی کوشش کررہا تھا، رومی اسے سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی لیکن ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے زمین پر گر جائے گا۔ ایمان کا دل ڈوبنے لگا اسے لگا جیسے واقعی عفان اسے چھوڑ کر بہت دور جارہا ہے۔

''عفان.....'' اس نے عفان کو زبان سے نہیں جیسے دل کی گہرائیوں سے پکارا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے عفان کے پاس آگئی اور رومی کو دھکیلتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں تھام کر بیڈ پر لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک نرس بھی کمرے میں داخل ہوئی اور اندر کی سچویشن دیکھتے ہوئے لپک کر ان لوگوں کے نزدیک آگئی۔

''ارے، انہوں نے یہ ڈرپ کیوں نکال دی اور یہ بلیڈنگ کیسے شروع ہوگئی ہے؟'' وہ بے حد پریشان لہجے میں کہتے ہوئے ڈرپ دوبارہ لگانے لگی۔ عفان نے ایمان کا ہاتھ بہت مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

''تھینک یو ایمان ... آئی لو یو۔'' وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔

ایمان نے ایک سرد سی نگاہ رومی پر ڈالی جو بیڈ کی پٹی تھامے جل تھل آنکھوں کے ساتھ عفان کو دیکھ رہی تھی۔

''رومی میرے خیال میں اب تمہیں واپس گھر چلے جانا چاہیے، میرے شوہر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے زیادہ لوگوں کو آنے سے منع کیا ہے۔'' اس کے بے حد تلخ لہجے میں کہے گئے جملے نے جیسے رومی کو شاکڈ کردیا۔ اس نے ناقابل یقین نگاہوں سے ایمان کی جانب دیکھا جس کا نازک ہاتھ عفان کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور جس کی نگاہوں میں عفان کے لیے فکرمندی کے ساتھ ساتھ پیار بھی چھلک رہا تھا اور اب وہ بہت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشانی کے عالم میں نرس سے کسی ڈاکٹر کو بلانے کی بات کررہی تھی۔

''عفان، میں آپ کے پاس ہوں، آپ پریشان مت ہوں۔'' عفان کے پکارنے پر ایمان نے بہت پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''بس تم میرے پاس سے ہٹنا نہیں ایمان.....'' وہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر بولا۔ رومی کو اپنا آپ ان دونوں کے درمیان بہت اگوررڈ سا محسوس ہونے لگا اتنی دیر میں نرس ایک ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''پلیز آپ لوگ کچھ دیر کے لیے باہر چلی جائیں۔ ہمیں پیشنٹ کو ٹریٹمنٹ دینی ہے۔'' ڈاکٹر جو عفان کی اس کیفیت پر کچھ ناخوش سی نظر آرہی تھی اس نے کچھ خشک سے انداز میں ان دونوں سے ریکویسٹ کی تو ایمان بہ مشکل تمام عفان کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر کی جانب چل دی۔ رومی بھی تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے تھی۔

''ایمان کو واپس بلالیں ڈاکٹر صاحب۔'' عفان کی آواز نے رومی کے دل میں جیسے برچھی سی گھونپ دی۔ اس نے پلٹ کر عفان کی جانب دیکھا لیکن وہ آنکھیں موندے زیرلب ایمان کو پکارے جارہا تھا۔

ایمان کمرے سے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ رومی نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھایا پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ ایمان کے نزدیک آگئی ایمان نے کچھ ناگواری سے اس کی جانب دیکھا۔

''پلیز رومی، میں اب تمہاری موجودگی ایک منٹ بھی نہیں برداشت کرسکتی۔'' اس نے صاف گوئی کی گویا حد ہی ختم کردی تھی لیکن رومی نے جیسے سنی ان سنی کردی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے خفا ہو ایمان لیکن میں اتنی بری نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔''

''نہیں، میں جتنا برا تم کو سمجھ رہی ہوں تم اس سے کہیں زیادہ بری بلکہ گری ہوئی ہو۔'' ایمان نے اسے بہت نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ رومی کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہوگیا۔ کمرے میں جس طرح عفان نے اس کی محبت کو دوکوڑی کا بنا کر اسے ذلیل کیا تھا اس وقت ایمان اس سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آرہی تھی۔

''اوہو گری ہوئی میں نہیں، تمہارا یہ شوہر ہے جو تمہارے سامنے مجنوں بننے کی بھرپور ایکٹنگ کررہا ہے، اپنے اس ایکٹر شوہر کو سنبھال کر رکھو جس نے اپنی محبت کے جال میں مجھے پھنسا کر سب کی نظروں میں گرادیا اور اب خود اپنے آپ کو بہت نیک اور شریف ظاہر کرکے تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔'' وہ جو عفان کی بے رخی، اس کی نفرت اور بے گانگی کو نہیں سہہ پارہی تھی۔ اس نے اپنے اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آگ سے ایمان کے دل میں اٹھتے ہوئے حسین جذبات کو جیسے بھسم کرڈالا۔

''رومی میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ عفان ٹھیک ہوجائیں تو بے شک تم اپنی محبت دوبارہ واپس لے لینا لیکن فی الحال میرے خاندان والوں کے سامنے مجھے اپنا بھرم قائم رکھنے دو۔ مجھے عفان سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ ایک بار پھر عفان سے خفا ہوگئی تھی۔ بدگمانی کا زہر ویسے بھی پوری طرح سے ختم ہی کب ہوا تھا کہ رومی کی باتوں نے ایمان کو ایک بار پھر پوری شدت سے عفان سے متنفر کردیا۔

''نہیں ایمان، میں اس دو غلے شخص کی محبت پر لعنت بھیجتی ہوں جو مجھ سے اکیلے میں ملنے کی بھیک



مانگا کرتا تھا۔ میں اسے حاصل نہیں ہوئی تو اب مجھ سے بے رخی کے ڈرامے کررہا ہے تاکہ وہ تمہاری قربت حاصل کرسکے۔ ہونہہ، یہ ہوس کا پجاری تمہیں ہی مبارک ہو۔ اگلے ہفتے میری منگنی ہے۔ پلیز اپنے شوہر کے ساتھ میری خوشی میں شریک ہونے کی ہرگز کوشش نہیں کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ عفان کا سایہ بھی میرے زندگی کے ساتھی پر پڑے جو روح سے نہیں صرف جسم سے محبت کرنا جانتا ہو ایسا ساتھی بس تمہیں ہی مبارک ہو۔'' رومی کے جملے پتھر بن کر جیسے ایمان کی روح کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ رومی اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر جیسے اندر سے کھلکھلا اٹھی۔ اس نے عفان سے اس کی بے رخی اور اپنی توہین کا بدلہ لے لیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ایمان کی آنکھوں میں چمکتے محبت کے ستاروں کو بہت ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ عفان کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ایمان کے نازک گلابی ہاتھوں کو اس نے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ عفان کی دیوانگی جو اس کے ایک ایک جملے سے ایمان کے لیے ظاہر ہورہی تھی وہ درد بھرا احساس ابھی بھی اس کی روح کو کچوکے دے رہا تھا اور اس وقت انہی بے رحم باتوں سے اس نے عفان کو ایک بار پھر ایمان سے بہت دور کرکے کم از کم یہ اطمینان تو حاصل کرہی لیا تھا کہ ابھی جو محبت بھرے مناظر اس کی آنکھوں نے دیکھے، وہ اب دوبارہ ان دونوں کی زندگی میں نہیں آئیں گے۔ عفان اس کا نہیں بن پایا تھا تو بھلا ایمان کا کیسے بن سکتا تھا۔ تبھی ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل آئی نرس بھی ساتھ ہی تھی۔

''آپ میں ایمان کون ہیں؟ عفان صاحب انہیں بلا رہے ہیں۔'' ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ایمان نے اپنی جلتی آنکھوں سے رومی کی جانب دیکھا۔

''رومی تم نے جو کچھ کہا وہ میں نے بہت صبر کے ساتھ سنا حالانکہ میں تمہاری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ براہِ کرم آج کے بعد مجھ سے کبھی دوبارہ ملنے کی کوشش مت کرنا۔ میں گھر واپس جارہی ہوں، تم اندر جاکر اپنے دو غلے محبوب کو تسلی دے دو کہ اب اسے مزید ایکٹنگ کی ضرورت نہیں۔ میں آج ہی طلاق کے لیے درخواست دے دوں گی تاکہ تم دونوں آرام سے ایک دوسرے کو حاصل کرسکو اور تمہیں منگنی کا ڈراما نہیں کرنا پڑے۔'' غصے کی شدت سے الفاظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہورہے تھے۔ ''اور تم بالکل سچ کہہ رہی ہو یہ شخص روح سے نہیں صرف جسم سے محبت کرنا جانتا ہے اور اس کا ثبوت یہ مجھے دے چکا ہے۔'' وہ استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھ کر ایک دم پلٹی اور تیز تیز قدموں سے اسپتال سے باہر کی جانب چل گئی۔ رومی اس کے جملے پر غور کرتے ہوئے ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

''تم رحیم کو کیسے جانتے ہو؟'' وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا لیکن وہ بدستور کھڑی رہی۔

''کیا مسئلہ ہے بھئی اس عورت کے ساتھ؟'' دوسرا ڈاکو تیزی سے ان دونوں کے نزدیک آگیا۔ اتنے میں زور سے بندوق چلنے کی آواز نے بس میں ہلچل مچادی۔ ایک آدمی نے شاید حجت کی تھی تبھی وہ گولی کا نشانہ بن گیا۔ عورتوں نے خوف سے رونا اور چیخنا شروع کردیا۔ ڈاکوؤں کا کام ویسے بھی پورا ہوگیا تھا۔ وہ لوگ تیزی سے اترنے لگے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تمہارے بچوں کے بارے میں جانتا ہوں۔" وہی ڈاکو تیزی سے کہتا ہوا نیچے اتر گیا۔ امینہ دیوانہ وار ان کے پیچھے دوڑی۔ بس کے نزدیک ہی ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی... وہ سب جلدی جلدی اس میں بیٹھنے لگے۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، مجھے میرے بچوں سے ملوادو۔" وہ چلتی ہوئی جیپ سے لٹک گئی جبکہ بس کے اندر سے عورتوں اور مردوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں پھر ڈرائیور نے اچانک ہی بس اسٹارٹ کی اور زناٹے سے بس آگے نکل گئی۔

"یہ کیا جنجال اپنے پیچھے لگا لیا ہے تو نے؟" ایک ڈاکو غصے سے چلا کر بولا۔

"سنو مائی تمہارے بچے اب تم کو کبھی نہیں مل سکتے۔ انہیں بھول جاؤ۔" وہی ڈاکو بندوق اس کے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔ جیپ کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ امینہ جیپ کے ساتھ کچھ دیر تو بری طرح گھسیٹتی رہی پھر کسی نے زور سے اس کے ہاتھ پر مکا مارا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سڑک پر گری ہوئی تھی اور جیپ بہت دور جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ امینہ کے ہاتھوں اور پیروں سے خون رس رہا تھا۔ سڑک پر گرنے سے چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ بیچ سڑک پر اس کا وجود زخموں سے چور پڑا تھا۔ اس ہائی وے پر ٹریفک کافی تیز گزرتی تھی لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت سڑک پر سے کوئی گاڑی نہیں گزر رہی تھی تبھی دور سے ایک تیز رفتار کار آتی ہوئی نظر آئی۔ سامنے سڑک پر اوندھے منہ پڑی ایک عورت کو دیکھ کر کار میں موجود افراد کچھ خوف زدہ سے ہوگئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے بے اختیار کار آہستہ کردی۔

"نہیں، نہیں ارسلان... کار کو روکنا نہیں، پتا نہیں یہ کون عورت ہے کہیں ہمیں روکنے کے لیے کوئی ڈراما کر رہی ہو۔" ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے گھبرا کر اسے روکا جسے اس نے سنی ان سنی کردی۔ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے امینہ کے نزدیک آیا اس کی کلائی تھام کر اس کی نبض دیکھنے میں وہ مصروف تھا کہ ایک شخص اسے دور سے اس طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔

"کیا یہ عورت مر گئی ہے؟" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ارسلان سے پوچھا۔

"نہیں، یہ زندہ ہے شاید خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی ہے ہمیں اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔" ارسلان فکرمندی سے بولا۔

"چلیں، میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔ اس وقت آپ ہی اسے اسپتال لے جاسکتے ہیں۔" اس اثنا میں ایک آدھ گاڑی اور بس وہاں سے گزری تھی لیکن کسی نے بھی رکنے کی زحمت نہیں کی تھی شاید آج کل کے حالات نے لوگوں کے دلوں سے ہمدردی کا احساس ختم کر کے وہاں صرف خوف اور دہشت کے احساسات بھر دیے ہیں پھر ان دونوں نے مل کر نیم بے ہوش سی امینہ کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

"ارسلان تم اپنے آپ کو کس مشکل میں ڈالنے جارہے ہو۔ پتا نہیں تمہیں کب عقل آئے گی۔" فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت نے بہت جھنجلا کر ان لوگوں کو دیکھا جو امینہ کو تھوڑا سا ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"امی آپ عبادت پر زیادہ زور دیتی ہیں اور میں انسانیت کو اپنی عبادت مانتا ہوں، میں اور بے حس لوگوں کی طرح اسے یہاں سسک سسک کر مرتے ہوئے نہیں چھوڑ سکتا تھا اگر یہ عورت یہاں



بے کسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر مر جاتی تو کیا اللہ آپ کو یا مجھے معاف کرتا؟" ارسلان نے کچھ خفا ہو کر انہیں دیکھا پھر اس آدمی سے مخاطب ہوا۔

"بھائی صاحب اگر آپ فرشتہ بن کر آ ہی گئے ہیں تو پلیز ہمارے ساتھ کار میں بیٹھ جائیں مجھے بالکل نہیں اندازہ کہ یہاں سے اسپتال کتنی دور ہے اور کہاں ہے۔" ارسلان نے بہت مہذب انداز میں اس شخص سے ریکویسٹ کی۔

"آپ فکر نہ کریں، میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں، ہمیں فوراً اسپتال چلنا چاہیے۔" وہ شخص گھوم کر کار کی دوسری سائڈ پر آیا اور دروازہ کھول کر بالکل کنارے پر لگ کر بیٹھ گیا... کیونکہ تقریباً آدھی سے زیادہ سیٹ امینہ نے ہی گھیری ہوئی تھی۔ کار تیز رفتاری سے چل پڑی تھی۔ ارسلان اپنی ماں کے ساتھ میر پور خاص اپنے آم کے باغ کے کچھ مسائل حل کرنے جارہا تھا کہ راستے میں اسے اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ وہ شخص جو امینہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا وہ وقفے وقفے سے امینہ کا کاندھا ہلا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے میں مصروف تھا۔

"سنو، تمہیں اپنے حمید اور رشید کے بارے میں معلومات چاہئیں ہے؟" اس بار وہ اس کے کان کے نزدیک کچھ زور سے بولا تو نیم بے ہوش سی امینہ نے بے اختیار آنکھیں کھول کر بہت بے چینی سے اس شخص کی جانب دیکھا۔ منہ سے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نکل ہی نہیں سکے۔ اس نے سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن شدید نقاہت کی وجہ سے وہ بس نڈھال سی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہ گئی۔

"یہ حمید اور رشید کون ہیں؟" ارسلان نے ذرا سی گردن موڑ کر اس اجنبی کو دیکھا جبکہ اس بار امینہ نے تڑپ کر اس شخص کی آستین پکڑ لی۔

"تم وہی ہو نا جو ابھی بس پر مجھے میرے بچوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔" اس شخص نے گھبرا کر چور نظروں سے آگے بیٹھے ہوئے دونوں ماں بیٹوں کو دیکھا اور انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہا۔ امینہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کسی صورت بھی نہیں چاہ رہی تھی کہ یہ شخص اس کی ذرا سی بے وقوفی سے ایک بار پھر اس کی دسترس سے دور چلا جائے۔ وہی تو اسے اس کے بچوں کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

"حمید اور رشید میرے بچے ہیں جی جو کہیں کھو گئے تھے شاید اللہ نے یہ فرشتہ میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔" اس بار اس نے ارسلان کے سوال کا کمزور آواز میں جواب دیتے ہوئے اس شخص کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"دیکھو مائی، ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے پہلے اسپتال چل کر اپنی مرہم پٹی کروالو پھر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" اس شخص کی اس بات پر جیسے امینہ پر غنودگی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

"کیا میرے بچے بہت برے حالوں میں ہیں، وہ زندہ بھی ہیں یا میری چندا کی طرح مر گئے؟" اس کے زخموں سے چور وجود میں پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اس نے چلاتے ہوئے اس شخص کا گریبان تھام لیا۔ اس آدمی کے ساتھ ساتھ ارسلان اور مسز ہمدانی بھی گھبرا گئیں کہ امینہ روتے ہوئے دیوانوں کی طرح بس یہی دو سوالات کرتی چلی جارہی تھی۔

"آپ کو اس وقت ان سے ان کے بچوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی اور آپ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ انہیں جانتے ہیں۔'' مسز ہمدانی نے کچھ خفگی سے اس شخص کو دیکھا تو امینہ نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس آدمی کو دیکھا جو کچھ برہم نظر آرہا تھا۔ امینہ سہم سی گئی اگر یہ شخص اس وقت الجھ کر یہاں کہیں اتر گیا تب وہ کیا کرے گی۔ اپنے جذبات میں آکر وہ اپنے بچوں کو پانے کا ایک بہت بڑا موقع گنوانے جارہی تھی۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو صلواتیں سناتے ہوئے وہ بہت لجاجت سے بیگم ہمدانی سے بولی۔

''نہیں، نہیں بیگم صاحب..... یہ صاحب تو میری زندگی میں ایک نیکی کا فرشتہ بن کر آئے ہیں، خدا انہیں اس کا اجر دے گا۔'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں اس شخص کی جانب دیکھا۔

''مائی اگر تم اصرار کررہی ہو تو میں تمہیں تمہارے حمید اور رشید کے بارے میں بتا دیتا ہوں، میں اپنے ساتھیوں سے ویسے بھی تھوڑا سا وقت لے کر آیا تھا۔ ابھی میرے موبائل پر میسج آیا ہے، مجھے پانچ دس کلومیٹر کے بعد ایک دوسری کار میں بیٹھ جانا ہے جو میرا انتظار کررہی ہے۔'' اس بار وہ آدمی کچھ نرم لہجے پن سے بولا۔ اس کے لہجے میں چھپی عجیب سی کرختگی نے ارسلان اور مسز ہمدانی کو بھی چپ رہنے پر مجبور کردیا۔

''ہاں، ہاں بھائی صاحب مجھے میرے بچوں کے بارے میں بتائیں کہاں ہیں وہ؟'' امینہ نے بہت بے تابی سے پوچھا۔

''تمہارے آدمی نے انہیں جن لوگوں کو بیچا تھا وہ مذہبی شدت پسند لوگ تھے۔ میں رحیم کو اچھی طرح سے جانتا ہوں کبھی وہ میرے دوستوں میں تھا۔ اکثر میں نے تم کو اس کے ساتھ دیکھا تھا اسی لیے میں تمہیں پہچان گیا۔ مائی میں بھی دو سال سے جس پیشے سے وابستہ ہوں وہ تو تم جان ہی گئی ہو، تمہاری حالت دیکھ کر میرا دل پگھل گیا ورنہ ہم ڈاکو بہت سخت جان اور سخت دل ہوتے ہیں۔'' اس شخص کے آخری جملے نے مسز ہمدانی اور ارسلان کے چہرے پر ہوائیاں اڑا دیں۔ ارسلان نے بے اختیار کار کی رفتار آہستہ کردی۔

''صاحب کار کی رفتار کم مت کرو۔ میرے ساتھی آگے میرا انتظار کررہے ہیں، فکر نہیں کرو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' اس شخص نے ارسلان کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے اسے تسلی دی تو ارسلان نے کچھ گھبرا کر رفتار دوبارہ تیز کردی۔

''بھائی خدا کے لیے بتادو، میں اپنے بچوں کو کیسے ان لوگوں سے چھڑا سکتی ہوں۔'' امینہ جو اس آدمی کے اس تکلیف دہ انکشاف پر جیسے ایک لمحے کو سکتے میں آگئی تھی اس نے بہت بے قراری سے روتے ہوئے اس آدمی کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

''اب تم اپنے بچوں کو بھول جاؤ، بس یہ ہی بتانے کے لیے میں واپس تمہارے پاس آیا تھا۔ مجھے یہ بے رحم حقیقت تمہیں نہیں بتانی چاہیے تھی لیکن اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم ان کا فاتحہ درود کرا کے شاید اپنے دل کو کچھ سکون پہنچا سکو۔ وہ دونوں خودکش حملوں میں کام آچکے ہیں۔'' اس شخص نے رحم بھری نگاہوں سے امینہ کو دیکھتے ہوئے جیسے ایک وزنی بم اس کے سر پر دے مارا۔ امینہ کے منہ سے دل دوز چیخوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔

''صاحب کار روک دو، مجھے یہیں اترنا ہے۔'' اس آدمی نے سائڈ پر کھڑی ایک گاڑی کو دیکھتے ہوئے ارسلان سے کہا تو اس نے فوراً ہی بریک لگا دیے۔ امینہ بے ہوش سو کر سیٹ پر گری ہوئی تھی۔



وہ شخص تیزی سے نیچے اترا۔ ارسلان اور مسز ہمدانی کے خوفزدہ چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ نرمی سے بولا۔

''آپ لوگ بہت اچھے انسان ہیں۔ اس مظلوم عورت کو ضرور کسی اسپتال میں دکھلا دیجیے گا، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔'' پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا دوسری کار میں سوار ہوگیا جبکہ مسز ہمدانی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

کہہ رہے ہیں یہ بدلتے ہوئے منظر محسن
وقت جو بیت گیا ہے اسے آنا ہوگا

''علینہ کہاں ہو بیٹا کب سے تمہارے نوڈلز میز پر رکھے بالکل ٹھنڈے ہوگئے ہیں۔'' اپنی ماں کی آواز پر پانچ سالہ علینہ بادل ناخواستہ ٹی وی کے سامنے سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلی آئی جہاں ایمان اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ علینہ منہ بنا کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی معصوم سی صورت پر بکھری خفگی کو ایمان نے بہت پیار سے دیکھا۔

''ارے، ہماری گڑیا تو بہت ناراض لگ رہی ہے۔ بھئی تمہاری مما کو اکیلے کھانا اچھا نہیں لگتا نا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے نوڈلز کی پلیٹ اس کے سامنے سرکائی۔

''لیکن مما میرا فیورٹ کارٹون پروگرام آرہا تھا۔'' اس نے روٹھی ہوئی نظروں سے ایمان کو دیکھا۔

''اچھا چلو، ہم دونوں اپنی اپنی پلیٹیں لے کر وہیں چلتے ہیں، میں بھی تمہارے ساتھ کارٹون دیکھوں گی۔'' ایمان اپنی پلیٹ کے ساتھ ساتھ علینہ کی بھی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ علینہ کے چہرے پر بے شمار خوشی کے رنگ بکھر گئے۔

''مما آئی لو یو۔'' وہ دمکتی آنکھوں کے ساتھ تقریباً دوڑتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئی۔ ایمان بھی مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ اپنی لاڈلی بچی کے چہرے پر خوشی کی چمک دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کے دل میں ایک عجیب سا سکون اتر آیا تھا۔

زندگی کے اس طویل تکلیف دہ سفر میں علینہ کا وجود اس کے لیے کتنی بڑی نعمت تھا، یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ اس کی تنہائیاں علینہ کے دم سے ہی تو روشن تھیں ورنہ وہ تو گھٹ کر مر ہی جاتی۔

''مما یہ نوڈلز بہت مزے کے بنے ہیں۔ کیا بوا ماسی نے بنائے ہیں۔'' علینہ نے نوڈلز کا بھرا ہوا چمچہ منہ میں رکھتے ہوئے اپنی پسند کا اظہار کیا تو ایمان ہنس دی۔

''واہ بیٹا، محنت ہم نے کی اور کریڈٹ بوا ماسی لے گئیں۔'' تبھی بوا ماسی جوس کا گلاس لیے اندر داخل ہوئیں۔

''ارے، آپ دونوں یہاں بیٹھے ہیں، میں جوس لے کر ڈائننگ روم میں کب سے آپ لوگوں کا انتظار کررہی تھی۔'' وہ جوس علینہ کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

''کیا کروں بوا، یہ آپ کی لاڈلی کی ضدیں بس ایسے ہی ہوتی ہیں۔'' ایمان نے پیار سے علینہ کی جانب دیکھا جو بڑی محویت سے مسکراتے ہوئے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔

''یہ تو اس گھر کی رونق ہے ایمان بی بی، اللہ اس کی لاکھوں برس کی عمر کرے۔'' بوا ماسی نے بہت محبت سے جوس کا گلاس علینہ کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بوا ماسی اگر یہ نہ ہوتی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو میری زندگی میں صرف اندھیرا ہی ہوتا۔'' ایمان کی آنکھوں میں اداسی امڈ آئی۔

''ایمان بی بی، میں جب بھی ہمت ہارنے لگتی ہوں زندگی سے دل اوبنے لگتا ہے تو آپ دونوں جیسے ایک روشنی بن کر میری روح کے اندھیروں کو مٹا دیتے ہیں۔ آپ میری زندگی کو دیکھیں ایمان بی بی..... جس میں سوائے دکھوں، تکلیفوں اور آنسوؤں کے کچھ بھی نہیں۔ آپ کے پاس تو علینہ ہے، مجھ سے تو میرے بچے بھی قدرت نے واپس لے لیے..... میں تو اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ آپ کے پاس تو اور بھی بہت سی نعمتیں ہیں اور پھر آپ اتنی ہمت اور بہادری سے امید کا جو سرا تھامے ہوئے ہیں، اللہ ضرور اس کا صلہ آپ کو دے گا۔ آپ کو آپ کا سہاگ ضرور واپس ملے گا ایمان بی بی۔'' ہمیشہ کی طرح آج بھی بوا ماسی نے بہت پیار اور شفقت سے اس کے بجھے ہوئے دل میں امید اور حوصلے کے دیے روشن کرنے کی کوشش کی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بوا ماسی..... لیکن کیا کروں تقریباً چھ سال ہو رہے ہیں مجھے اس دکھ..... اس کرب کو سہتے ہوئے، میں اندر سے بالکل ٹوٹتی جا رہی ہوں۔ غمیر کی کسک بھی مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ.....'' جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ جلدی سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھنے لگی کیونکہ علینہ کچھ پریشان سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ایمان بی بی لائیں آج میں خوب سارا تیل ڈال کر آپ کے سر کا مساج کردوں، دیکھیے تو سہی کتنے روکھے ہو رہے ہیں آپ کے بال۔'' بوا ماسی نے بھی جلدی سے ٹاپک بدلتے ہوئے ایمان کی توجہ دوسری جانب مبذول کروائی۔

''ویسے بوا ماسی آپ کی عمر اتنی زیادہ تو نہیں لگتی لیکن آپ کے سر کے تمام بال بالکل سفید ہیں۔ سچ اگر آپ اپنے بال ڈائی کرلیں نا تو دس پندرہ سال ینگ لگنے لگیں۔'' علینہ اب دوبارہ مطمئن ہو کر ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو گئی تھی۔

''ایمان بی بی آپ یقین کریں گی کہ میرے یہ بال صرف ایک دن کے اندر اندر سفید ہو گئے تھے۔''

''ارے نہیں.....!'' ایمان نے بہت بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں ایمان بی بی جس دن مجھے اپنے حمید اور رشید کی موت کی اطلاع ملی تھی بس اسی دن ایک دم میرے سر کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ سب ہی یہ دیکھ کر بہت حیران ہو گئے تھے۔ یہ تین مہینے بعد جب میں علاج کے بعد اسپتال سے باہر آئی تھی تب مجھے لوگوں نے بتایا تھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''آپ پر جو جو ستم ٹوٹے ہیں ان کے سامنے مجھے اپنے دکھ بہت چھوٹے لگنے لگتے ہیں بوا ماسی۔'' ایمان جو کئی بار اُن سے ان کی کہانی سن چکی تھی ایک بار پھر اُن کے بیٹوں کا ذکر سن کر رنجیدہ ہو گئی۔ ''لیکن یہ سفید بالوں والی حیرت انگیز بات آپ نے آج پہلی دفعہ بتائی ہے۔'' وہ سچ مچ کافی حیران ہو رہی تھی۔

''آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا پھر میں کیا بتاتی..... بس آج اتفاقاً ہی منہ سے نکل گیا۔''

''بوا ماسی اگر آپ کو کبھی زندگی میں مولوی فضل دوبارہ ٹکرا گیا تو پھر آپ کیا کریں گی۔'' دفعتاً ایمان نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اب میں پہلے والی امینہ نہیں رہی جی..... کسی مائی کے لعل میں ہمت ہے کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا



کر بھی دیکھے۔ مجھے ویسے بھی زندگی سے بالکل محبت نہیں ہے..... پہلے اسے جان سے ماروں گی پھر آرام سے پھانسی چڑھ جاؤں گی۔'' وہ جلالی لہجے میں بولیں تو ایمان انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ زندگی نے کتنے صبر آزما امتحان لیے تھے اس مظلوم عورت سے۔ خوشیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ان کی زندگی کی شام ہو چلی تھی..... پاؤں شل ہو چکے تھے لیکن خوشیاں حاصل کرنا تو دور کی بات وہ تو ان کی جھلک بھی نہ پا سکی تھیں۔ جس دن اس ڈاکو نے ان کی امیدوں کی مالا کو ایک جھٹکے سے توڑا تھا اسی دن سے بس وہ صرف نام کو زندہ تھیں۔ اپنے بیٹوں سے ملنے کی تڑپ نے انہیں کیا کچھ نہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رحیم کے وعدوں اس کی باتوں پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی رہیں صرف اس آس پر کہ ان کے جگر کے ٹکڑے کبھی نہ کبھی ان کو واپس مل جائیں گے۔ وہ ان کو سینے سے لگا کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کرلیں گی۔ پتا نہیں اتنے دن ان کے معصوم بچوں نے ٹھیک سے کچھ کھایا پیا بھی یا نہیں۔ وہ انہیں ان کی پسند کے کھانے بنا کر دیں گی، ان کے جی بھر کر ناز نخرے اٹھائیں گی لیکن پھر ایک ہی پل میں ان کے سارے سپنے چکنا چور ہو گئے۔ وہ تہی دامن رہ گئیں۔ ان کے دل و دماغ نے اس دلدوز خبر اس بھیانک حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ارسلان اور مسز ہمدانی فوراً ہی اسپتال لے کر گئے لیکن جسمانی تکلیفوں سے زیادہ ڈاکٹرز اس کی ذہنی حالت پر پریشان تھے۔ کبھی کسی ڈاکٹر کو حمید کہہ کر چیخنا شروع کر دیتی کبھی کسی کو رشید سمجھ کر اپنی طرف کھینچتی۔ مسز ہمدانی نے لاکھ چاہا کہ ارسلان امینہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے نکل جائے لیکن ارسلان کا حساس دل اس بے کس عورت کو یوں اس حال میں بے سہارا چھوڑ کر جانے پر قطعی آمادہ نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ امینہ کے پاس سے کوئی ایسی چیز بھی نہیں برآمد ہوئی تھی جس سے اس کے بارے میں یا اس کے کسی عزیز کے بارے میں کچھ پتا چلتا۔ مسز ہمدانی کی اپنی طبیعت بگڑنے لگی تب ارسلان کو مجبوراً ڈاکٹرز کو اپنا موبائل نمبر دے کر واپس لوٹ جانا پڑا لیکن جانے سے پہلے اس نے اپنے ایک دوست کو جو میر پور خاص میں ہی رہتا تھا۔ ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے اسے اس مظلوم عورت کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔ کراچی آ کر بھی وہ لگاتار فون کے ذریعے اسپتال سے کانٹیکٹ میں رہا۔ دوست بھی اسے امینہ کی بگڑتی کیفیت کے بارے میں مسلسل آگاہ کرتا رہا۔ پھر ڈاکٹر کے کہنے پر امینہ کو اس نے کراچی میں ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل کروا دیا۔ ٹھیک ٹھاک خرچہ ہو رہا تھا اس کا لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی۔ البتہ مسز ہمدانی کو اس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں ایک غریب عورت پر اتنے زیادہ پیسے خرچ کرنے پر ضرور واویلا مچائے گی جبکہ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ اللہ نے اسے اس عورت کی مدد کے لیے وسیلہ بنایا ہے تبھی تو اس نے اچانک ہی... میر پور خاص جانے کا پروگرام بنایا جہاں اتفاقیہ یہ عورت اتنی ناگفتہ حالت میں اسے ملی۔ وہ تین مہینے تک خاموشی سے اس کا علاج کرواتا رہا اور جب اس کی ذہنی حالت کچھ بہتر ہوئی تو وہ اسے لے کر گھر آ گیا۔ مسز ہمدانی اسے دیکھ کر شاکڈ رہ گئیں۔

''امی یہ وہی عورت ہے جو ہمیں اس دن زخمی حالت میں ملی تھی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہ بے چاری ایک دن یہاں رہ لے۔'' ارسلان کے بتانے پر انہوں نے ناقابلِ یقین نظروں سے اس کا جائزہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا جب انہوں نے امینہ کو زخمی حالت میں دیکھا تھا تو اس وقت اس کے بال سیاہ تھے لیکن اس وقت درمیانی عمر کی وہ عورت بالکل سفید بالوں کے ساتھ انہیں بہت ضعیف، کمزوری لگ رہی تھی۔ ارسلان نے تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہوئے انہیں صرف یہ بتایا کہ یہ اپنے جاننے والوں کو ڈھونڈنا چاہ رہی ہے لیکن فی الحال اس کے پاس رہنے کو کوئی ٹھکانا نہیں۔ مسز ہمدانی نے پُرتجسس نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم ان تین چار مہینوں میں بالکل بدل گئی ہو۔ اپنی عمر سے بیس سال بڑی لگنے لگی ہو۔ کہاں تھیں تم اتنے دنوں۔ ویسے تمہارے بچوں کا سن کر اس وقت تو میں بھی اندر سے ہل گئی تھی۔'' مسز ہمدانی نے ان چند جملوں میں اپنی ہمدردی اپنی حیرانی، پریشانی اور تجسس سب کچھ سمو دیا۔ ارسلان نے ماں کو آنکھ کے اشارے سے مزید سوالات کرنے سے روک دیا۔ وہ ایک ہی دن ان لوگوں کے گھر پر رکی۔ دوسری صبح وہ ارسلان کے ساتھ مسز رازی کے گھر گئی لیکن گھر لاک تھا، گیٹ پر کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔ وہ بہت مایوس ہوگئی۔ دل انجانے خوف سے لبریز ہوگیا کہ کہیں مسز رازی کو کچھ ہو تو نہیں گیا پھر وہ لوگ عندلیب کے گھر پر پہنچے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کھلا تو نوکر کے پیچھے ہی اسے عندلیب کھڑی نظر آئی تب اس کے صبر کا...... پیمانہ لبریز ہوگیا وہ ایک دم بھاگتے ہوئے اس کے نزدیک آگئی۔

''عندلیب بی بی میں برباد ہوگئی، میں جیتے جی مرگئی، میرے حمید اور رشید بھی مرگئے عندلیب بی بی۔ رحیم نے ہم سب کو برباد کردیا، مار ڈالا۔'' وہ بین کرتے ہوئے عندلیب کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

عندلیب جو پہلی نظر میں اسے پہچان ہی نہیں سکی تھی ششدر سی کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔ تب ارسلان آگے بڑھا۔

''محترمہ یہ عورت شاید آپ کے گھر کام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ بہت ٹریجڈی ہوئی ہے، یہ خود ہی آپ کو بتادے گی، میرا فرض پورا ہوگیا اب میں چلتا ہوں۔'' ارسلان نے بڑی شائستگی سے اجازت چاہی۔

''ٹھہریں مسٹر، یہ عورت میرے گھر نہیں، میری مدر کے گھر کام کرتی تھی اور ان کے لاکھ روکنے کے باوجود یہ ان کی نوکری چھوڑ کر چلی گئی تھی اب میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں، براہِ کرم اسے آپ واپس لے جائیں۔'' عندلیب کے بے حد سرد لہجے کی ٹھنڈک امینہ نے اپنے رگ و پے میں اترتی محسوس کی جبکہ ارسلان بھی ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''کیا ہوا بیگم صاحبہ کو..... خدا کے لیے مجھے ان کے پاس لے چلیں میں ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔ عندلیب بی بی اب میرے پاس سوائے میری بیگم صاحبہ کے اور کچھ بھی نہیں۔'' امینہ نے بے اختیار عندلیب کے پاؤں پکڑ لیے۔

''چھوڑو میرے پاؤں امینہ اور مجھے اپنی اموشنل باتوں سے متاثر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں امی کو شاہد بھائی سنگاپور لے گئے ہیں اب میں تمہیں وہاں بھیجنے سے تو رہی۔'' عندلیب ہنوز اس سے سخت بدگمان نظر آرہی تھی۔

''عندلیب بی بی آپ مجھے ان کا فون نمبر دے دیں۔ میں ان سے بات کروں گی وہ وہاں بہت گھبرا رہی ہوں گی۔ وہ میرا سن کر واپس آجائیں گی عندلیب بی بی۔ ان کا اس عمر میں پرائے ملک میں رہنا ٹھیک نہیں ہے اس نے بہت لجاجت سے



عندلیب کی خوشامد کی تو وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

''ویری فنی...... یعنی تم ہم لوگوں کو سمجھاؤ گی کہ ہمیں اپنی ماں کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ جب اپنی غرض تھی تو میری ماں کے آنسوؤں کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہوا اب لٹ لٹا کر آئی ہو تو پھر ان کی یاد آگئی۔ میں تمہیں اب ایک منٹ بھی برداشت نہیں کرسکتی میری امی کتنی ڈپریسڈ.... اور بیمار ہوگئی تھیں تمہارے جانے کے بعد تم کو کیا پتا...... بس موت کے منہ میں جا کر واپس آئی ہیں صرف تمہاری وجہ سے پلیز ناؤ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔'' وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور تیز تیز قدموں سے گھر کے اندر چلی گئی۔ امینہ آنسوؤں سے تر چہرہ لیے اس کے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھتی رہ گئی۔

''امینہ میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہیے، ویسے تم بتا رہی تھیں کہ تمہارا کوئی ذاتی مکان بھی ہے اگر تم وہاں جانا چاہو تو......'' ارسلان نے ترس آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے جملے کو دانستہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں صاحب، میں فی الحال اس گھر میں نہیں جانا چاہتی، وہاں پر رحیم یا مولوی فضل میں سے کوئی نہ کوئی مجھے ضرور ٹکرا جائے گا۔ میں ابھی ان لوگوں سے اپنا حساب لوں گی۔'' امینہ کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ ''صاحب میں بغیر کسی تنخواہ کے آپ کے گھر کا سارا کام کردیا کروں گا بس مجھے سر چھپانے کا آسرا چاہیے۔ میں آپ کی امی کا بھی بہت خیال کروں گی صاحب...... میں بالکل بے سہارا ہوں۔'' وہ ارسلان کے ساتھ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی بہت خوشامدانہ انداز میں اس سے التجا کرنے لگی۔ اس نے مختصراً ارسلان کو اپنی کہانی سنادی تھی تبھی تو اسے امینہ سے مزید ہمدردی ہوگئی تھی۔

''امینہ جب تم نے اسپتال میں مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا تھا اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ تمہیں میں اپنے گھر میں بطور ملازمہ رکھ کر تمہاری پریشانیوں کو کچھ کم کرنے کی کوشش کروں لیکن ہمارے گھر آل ریڈی میرے ڈیڈی کے زمانے کے پرانے نوکر ہیں اور میں امی کی نیچر کو اچھی طرح سے جانتا ہوں وہ ہرگز بھی اس بات کو نہیں مانیں گی اور اگر میں نے زبردستی تمہیں رکھ بھی لیا تو شاید امی کے رویے کی وجہ سے تم بھی یہاں خوش نہیں رہ پاؤ گی اور امی کا بلڈ پریشر بھی ہمیشہ ہائی رہے گا۔'' آخری جملہ اس نے کچھ مزاح کے رنگ میں کہا لیکن امینہ کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ اداسی در آئی..... ارسلان نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے ستے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''امینہ میرا دوست جو میرپور خاص میں اسپتال تمہاری عیادت کے لیے آیا کرتا تھا اس نے فون کر کے تمہارے بالوں کے بارے میں شدید حیرت کا اظہار کیا تھا جو ایک ہی دن میں بالکل سفید ہوگئے تھے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کاش تمہیں اللہ اچانک کوئی ایسی خوشی دے دے کہ تمہارے بال پھر ایک دم سے سیاہ ہو جائیں۔'' وہ اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''صاحب بال صدمے سے سفید ضرور ہو جاتے ہیں لیکن خوشی سے ایک دم کالے بھی نہیں ہوتے شاید خوشیوں سے زیادہ دکھوں میں طاقت ہوتی ہے اور اب تو میری زندگی میں کبھی کسی خوشی کا گزر ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بہت رنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔

''نہیں امینہ، اللہ کی ذات سے کبھی مایوس نہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو۔ جیسے کہ اس وقت اچانک ہی میرے ذہن میں اپنے ایک دوست کا خیال آیا ہے جن کی مسز ابھی حال ہی میں اپنے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئی ہیں اور انہیں ایک قابلِ اعتماد عورت کی ضرورت ہے جو دن رات ان کے ساتھ رہ سکے اور میرے خیال میں شاید اللہ نے ان کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے تمہیں ہم لوگوں سے ملوایا ہے۔ قدرت کے کھیل بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ وہ کب، کیسے اور کہاں کس کو کس سے ملوا دے یہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔" ارسلان کی بات پر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ دل سے جیسے غم اور خوشی کا احساس ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر اس وقت ارسلان اسے کسی سڑک پر اتار کر چلا جاتا تو وہ وہیں تپتی سڑک پر بیٹھ کر اپنی زندگی کی بچی کھچی سانسیں پوری کر لیتی۔ اپنے بیٹوں کے شدید غم کے بعد مسز رازی کا بھی اس سے بچھڑ جانا اسے بے موت مار گیا تھا۔ اس بوڑھی عورت کی التجائیں بار بار اس کے کان میں گونج رہی تھیں۔ کتنی بے بسی سے روک رہی تھیں وہ اسے۔ لیکن وہ اپنے بچوں کو پانے کی دھن میں ان کی تنہائی ان کے آنسوؤں کی پریشانی سب کو جیسے اپنے قدموں تلے روند کر رحیم کے ساتھ چلی گئی تھی۔ کاش اس نے ان کی بات مان لی ہوتی۔

"امینہ میں تمہیں جن خاتون کے پاس لے کر جا رہا ہوں وہ میرے بہت عزیز دوست کی بیوی ہیں اور جس دکھ اور ذہنی اذیت سے وہ گزر رہی ہیں میرے خیال میں تم جیسی دکھی عورت ہی اُن کے غم کو سمجھ کر اُن کے ساتھ رہ سکتی ہے۔" ارسلان کے ملول لہجے پر امینہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا لیکن ارسلان نے اس ٹاپک پر پھر کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اب تین سال گزر جانے کے بعد امینہ جیسے ایمان کے دل میں اتر کر اس کا ہر دکھ جان چکی تھی اس کے ذہنی کرب کی اذیت اچھی طرح سے محسوس کرتی تھی وہ۔ سچ کہا تھا ارسلان نے ان دونوں کو رونے کے لیے ایک دوسرے کے کاندھے مل گئے تھے۔

ایمان اس بات کے لیے ارسلان کی بے حد شکر گزار تھی جس نے اس کی تنہائی اس کا دکھ درد بانٹنے کے لیے امینہ کے روپ میں اسے ایک ایسا غم گسار دے دیا تھا جس کے بغیر اب وہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب امینہ اس گھر میں آئی تھی تو علینہ محض دو سال کی تھی سوگوار سے حسن والی ایمان کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی امینہ سمجھ گئی تھی کہ یہ پیاری سی لڑکی کوئی بہت بڑا غم اپنے اندر چھپا کر جی رہی ہے۔ اس کے ریزہ ریزہ وجود کو امینہ نے اتنے سالوں میں بڑی مشکل سے اور بہت آہستہ آہستہ سمیٹا تھا۔ علینہ کو ایسے اپنے کلیجے میں سمیٹ لیا تھا کہ ایمان کو جیسے اس کی ہر ذمے داری سے مبرا کر دیا تھا۔ اپنے تینوں بچوں کی تشنہ محبتیں اس نے علینہ میں انڈیل کر اسے اپنی زندگی کا محور ہی بنا لیا تھا۔ اس کی ذرا سی بیماری کو وہ اپنی جان پر بنا لیتی' اس کی ہر ضد کو پوری کرنا اس کا ایمان تھا۔ اس کا ہنسنا، رونا، کھیلنا، کودنا، کھانا پینا امینہ کی زندگی کے ہر پل پر ایک خوشی بن کر چھا گیا تھا۔ ایمان کے علاوہ اس کے گھر آنے جانے والے لوگ بھی اس کی اس حد تک نثار ہو جانے والی محبت پر حیران ہو جاتے۔ شازی تو بہت رشک سے ایمان کو دیکھتی۔

"اللہ ایمان، میرے عاطف کے لیے بھی کوئی ایسی ہی امینہ ڈھونڈ دو پلیز...... اتنا تو شاید تم بھی علینہ کے لیے پریشان نہیں ہوتی ہو جتنی فکر مند امینہ اس کی ہر بات کے لیے ہوتی ہے۔" اس دن امینہ جب علینہ کو بہت جتن کر کر کے کھانا کھلا رہی تھی تو شازی



رشک آمیز حسرت سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے ایمان سے بولی۔

"شازی شکر کرو تمہارے پاس کوئی امینہ نہیں بلکہ عاطف کے لیے اس کا باپ موجود ہے، تمہیں چاہنے والا تمہارا شوہر تمہارے پاس ہے۔ مجھے تو اگر بوا ماسی نہ ملتی تو شاید اب تک میں گھٹ گھٹ کر مر ہی جاتی۔" ایمان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو پل بھر کے لیے شازی چپ سی ہو گئی۔ اپنی چہیتی بہن کی اجڑی ہوئی یہ زندگی اسے بھی بھلا کب چین لینے دیتی تھی۔ ایمان کی زندگی پر چھائی خزاں نے اسے اپنی دنیا میں آئی ہوئی بہار کو بھی ٹھیک سے انجوائے نہیں کرنے دیا تھا۔ ارباز نے اس کی زندگی میں آ کر جیسے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ اتنا چاہنے والا جیون ساتھی پا کر جہاں وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی وہاں ایمان کے دکھ کی چبھن بھی ہمیشہ اسے بے چین رکھتی تھی۔

☆☆☆

رومی کا اس دن اسپتال آنا ایک قیامت بن کر ایمان کی زندگی کو جیسے تہس نہس کر گیا تھا۔ اس کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ کیا کوئی دوست ایسی بھی ہو سکتی ہے جو دوستی کے پردے میں دشمنی کی انتہا کر دے۔ وہ جو عفان کی باتوں کی سچائی کی خوشبو اپنے دل پر محسوس کرنے لگی تھی...... جس کی روٹھی ہوئی محبت ایک بار پھر ایمان کی روح میں سمانے لگی تھی۔ خوب صورت جذبات و احساسات سے دل ایک نئی کیفیت سے دوچار ہونے لگا تھا کہ رومی کے سفاک جملوں نے ایک ہی لمحے میں اسے پھر سے بے موت مار دیا۔ اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

"میں بھلا کیسے اس شخص کی پُرفریب محبت کے دام میں دوبارہ پھنسنے جا رہی تھی جو کسی طور اعتبار کے قابل نہیں تھا۔ جس نے پہلے بھی مجھے دھوکا دیا اور اب پھر مجھے حاصل کرنے کے لیے ڈرامے کر رہا تھا۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ کبھی رومی سے تنہائی میں نہیں ملا لیکن اس نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ رومی پر کیسے کیسے جال نہ پھینکے ہوں گے اس نے کہ کسی طرح وہ تنہائی میں اسے حاصل ہو جائے اور رومی کے انکار پر بالآخر اس نے شادی کی رات مجھے جبراً حاصل کر ہی لیا۔ ٹھیک کہتی ہے رومی اس شخص کا کوئی کریکٹر نہیں یہ صرف ہوس کا پجاری ہے اور ابھی بھی یہ ساری ایکٹنگ اس لیے کر رہا ہے کیونکہ وہ ابو کا مقروض ہے۔ اسے مجھ سے بنا کر رکھنے میں فائدہ ہے۔" زہر آلود خیالات اسے عفان سے متنفر کرتے چلے جا رہے تھے۔ رومی کی باتیں سیاہ اندھیرے کی طرح اس کے ذہن پر کچھ ایسے چھا گئی تھیں کہ اس میں عفان کی محبت کی سچائی بالکل ہی گم ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیسے وہ گھر پہنچی۔ زرد ہوتی ہوئی رنگت، آنسوؤں سے تر چہرے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے جب وہ اندر داخل ہوئی تو لاؤنج میں چائے پیتے ہوئے گھر کے افراد اسے اس حال میں آتا دیکھ کر گھبرا کر کھڑے ہو گئے ابھی دو گھنٹے قبل ہی تو وہ لوگ اسے اسپتال چھوڑ کر واپس آئے تھے۔

عفان کے چہرے پر چھلکتی خوشی نے سب ہی کو بہت مطمئن کر دیا تھا۔ تبھی تو وہ سب لوگ اس نئے نویلے جوڑے کو تنہائی کا موقع دینے کی غرض سے وہاں سے چلے آئے تھے تاکہ ایمان اپنے دولھا کی تیمارداری خوب دلجمعی سے کر سکے لیکن اس وقت وہ اسے یوں نڈھال اور شدید ڈپریسڈ حالت میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ سب کے دل انجانے وسوسوں سے لرز اٹھے۔

"کیا ہوا ایمان...... سب خیریت تو ہے نا؟ عفان کیسا ہے؟" راحت بیگم نے بہت سراسیمگی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا جبکہ باقی سب لوگ بھی اس کے گرد پریشانی کے عالم میں جمع ہو گئے تھے۔

"مت نام لیں اس خود غرض فریبی انسان کا۔ مجھے اس دھوکے باز شخص سے نفرت ہے۔ بے حد شدید نفرت...... مجھے اس سے خلع چاہیے میں کسی قیمت پر اس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے بولی تو جیسے وہاں پر موجود لوگوں پر ایک سکتہ ساطاری ہو گیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم؟" راحت بیگم نے تقریباً اسے جھنجوڑ ڈالا جبکہ شہر یار بھی بہت گھبرا کر اس کے نزدیک آ گئے۔

"ابو میں عفان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے مجبور مت کیجیے گا۔" وہ شہر یار کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"مجھے پہلے وجہ بتاؤ۔" شہر یار نے بہت تحمل سے پوچھا جبکہ راحت بیگم کا دماغ بالکل ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"ابو میں کچھ نہیں بتا سکتی بس مجھے اتنا پتا ہے کہ عفان کسی اور کو پسند کرتے ہیں ہم دونوں بھی ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔" کمرے میں موجود سب ہی لوگ اس کے اس انکشاف پر دم بخود رہ گئے جبکہ راحت بیگم اس کا بازو گھسیٹتے ہوئے اسے کمرے میں لے آئیں۔

"کچھ تو ہماری عزت کا خیال کرو ایمان۔ تمہارے ابو ہارٹ پیشنٹ ہیں تمہیں اپنے غصے میں ان کی بھی پروا نہیں رہی۔ تمہارے جیسی تنگی بیویاں ہی اپنے گھروں کو برباد کر لیتی ہیں، وہ دانت پیس کر اس پر برس پڑیں۔

"ایمان ٹھیک کہہ رہی ہے امی۔" تبھی شازی کی آواز پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ زخموں سے چور اس وقت اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ تم لوگوں کو یہی وقت ملا تھا اس کی کردار کشی کرنے کا۔" راحت بیگم نے قہر آلود نظروں سے شازی کو گھورا۔

"ہمیں تو شادی سے ایک دن پہلے ہی سب کچھ پتا چل گیا تھا لیکن امی بس آپ کی اور ابو کی عزت کی خاطر ہی تو یہ زہر پیا ہے میں نے۔" ایمان کا ٹمپر پھر لوز ہونے لگا۔ تبھی شہر یار اندر کمرے میں داخل ہوئے۔

"ایمان میں تم سے اس وقت زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ تم انتہائی عاقبت نااندیش لڑکی ثابت ہوئی ہو۔ تم نے عفان کو سزا دینے کے لیے جو وقت چنا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا دل نہیں بلکہ پتھر ہے۔ تم نے ہم سب کو جیتے جی مار دیا ایمان۔" وہ زرد چہرے کے ساتھ سر پکڑ کر بیڈ پر گرتے والے انداز میں بیٹھ گئے۔

"ابو میں برداشت کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ آپ نہیں جانتے شادی کے روز سے اب تک میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔" وہ روتے ہوئے گھٹنوں کے بل ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"ایسا کیا گناہ کر دیا تھا اس نے ایمان کہ اس کی سزا تم نے اسے اتنی کڑی دی۔ سارے اسپتال کو پتا ہے کہ وہ بے ہوشی میں صرف تمہیں پکارتا رہا ہے اگر وہ تم سے اتنی سچی اور شدید محبت نہ کرتا ہوتا تو تمہیں اس طرح پکارتا ہوا کومے میں نہ چلا جاتا۔" شہر یار کی آواز بھرا گئی جبکہ شہر یار کی اس اطلاع پر راحت بیگم نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا، ایمان نے بہت دہل کر شہر یار کی جانب دیکھا۔ شازی بھی شدید شاک کی کیفیت میں تھی۔



"ہاں ابھی اسپتال سے فون آیا ہے۔ احسان اپنے سب گھر والوں کے ساتھ وہاں پہنچ چکا ہے۔ بہت شدید غم و غصے میں ہیں وہ لوگ۔ ارے وہ ایمان کے بھروسے پر چھوڑ کر گئے تھے اپنے بیٹے کو۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے کوئی بہت گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ وہ بیڈ سے اتر کر ایمان کو پکارتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ نرس اس کی آواز سن کر تیزی سے اندر داخل ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے نزدیک پہنچتی وہ کھڑے قد سے زمین پر گر گیا۔ دماغ میں کوئی ایسی چوٹ آئی ہے کہ وہ کومے میں چلا گیا ہے۔" صدمے سے شہر یار ٹھیک سے بول بھی نہیں پا رہے تھے۔ ایمان کے دل میں موت جیسا سناٹا چھا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ان کو دیکھتی رہ گئی۔ ان کا ایک ایک لفظ جیسے پتھر بن کر اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔

"نہیں...... نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس نے بہت ہذیانی کیفیت میں اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

"یقین آ گیا تمہیں۔ مل گیا سکون ارے پتا نہیں کس کی باتوں میں آ کر تم اپنے شوہر کی جان کے درپے ہو گئیں ایمان۔ کتنا خوش ہوا تھا وہ تمہیں دیکھ کر۔ ظالم لڑکی ذرا بھی رحم نہ آیا تمہیں۔" راحت بیگم جیسے اپنے آپ میں نہیں رہی تھیں لیکن ایمان کو تو کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ شازی اس کی غیر ہوتی ہوئی حالت دیکھ کر چیخ کر اس کی طرف بڑھی اور جلدی سے اسے بیڈ پر لٹانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو شازی اور اس کی پھپھو اس کے نزدیک بیٹھی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

"شازی مجھے کوئی بری خبر مت سنانا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے شازی کے ستے ہوئے چہرے کو بہت سہم کر دیکھا۔

"وہ ماٹر وایمان، وہ ابھی تک کومے میں ہیں۔ سب لوگ اسپتال میں ہیں۔ امی، ابو بھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر انکل کے تمہارے بارے میں اطمینان دلانے کے بعد اسپتال چلے گئے ہیں۔ سب لوگ بے حد پریشان ہیں۔ میں ڈاکٹر انکل کو بلا کر لاتی ہوں وہ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ہیں۔" شازی بجھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ فائزہ بیگم جو اس کی پھپھو تھیں اندر داخل ہو گئیں۔

"ایمان یہ سب کیا ہو گیا..... تم کیوں روبی کی باتوں میں آ گئیں بیٹا۔ وہ نہ جانے کب میری نظر بچا کر اسپتال نکل گئی۔ کاش میں اسے روک سکتی۔" وہ سخت پریشان لگ رہی تھیں جبکہ پشیمانی بھی ان سے چھپی نہیں رہ پا رہی تھی۔

"خدانخواستہ اگر عفان کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ سب میری وجہ سے ہوا ہے لیکن آنٹی میں تو اسی لیے وہاں سے آ گئی تھی تا کہ وہ روبی سے مل کر اپنی خوشیوں کی پلاننگ کر سکے۔" وہ روتے ہوئے بولی تو فائزہ بیگم بھڑک اٹھیں۔

"ایمان میں نے پہلے بھی تم کو سمجھایا تھا کہ روبی سے اس نے محبت نہیں کی وہ محض Infatuation تھی۔ ارے میں نے اس کی آنکھوں میں تمہاری محبت کی سچائی کو بہت اچھی طرح سے محسوس کیا ہے۔ اپنی سالگرہ کا دن یاد کرو، اس دن بھی تمہیں دکھ پہنچانے پر وہ روبی کی طرف دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ ابھی جب روبی گھر واپس آئی تو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر چیخ چیخ کر رونے لگی کہ اس نے عفان کو مار ڈالا۔ میری تو جان



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی نکل گئی بہت پوچھنے پر اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس نے ایمان سے عفان کے کریکٹر کے بارے میں بہت غلط سلط باتیں کہی تھیں جس پر ایمان خفا ہو کر اسپتال سے چلی گئی۔ عفان کا توہین آمیز رویہ اور اس کا تمہارے لیے اتنا بے چین ہونا رومی سے برداشت نہیں ہوا۔ جب وہ کمرے میں آئی تو عفان نے پھر بے تاب ہو کر تمہارے بارے میں پوچھا۔ تب اس نے عفان کو بڑے سخت لہجے میں بتا دیا کہ ایمان تم سے شدید نفرت کرتی ہے اور وہ تم سے جلدی ہی خلع لینے والی ہے اور اسی لیے وہ گھر چلی گئی ہے تاکہ سب گھر والوں کو بھی بتا سکے۔ عفان یہ سن کر گھبرا کر بیڈ سے نیچے اتر آیا اور تمہیں پکارتے ہوئے آگے بڑھا ہی تھا کہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ رومی اپنے آپ کو اس کا قاتل کہہ رہی ہے ایمان۔ اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اتفاق سے ریاض نے بھی ہم لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پہلی دفعہ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے رومی پر اپنا ہاتھ اٹھایا لیکن ایمان جیسے رومی پر اس تھپڑ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، وہ کبھی ہنس رہی تھی کبھی موبائل اٹھا کر عفان سے باتیں کرنے لگتی..... معافیاں مانگنے لگتی۔ میں اسے ریاض کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں تاکہ تمہیں حقیقت بتا سکوں۔ جاؤ ایمان شاید تمہاری آواز سن کر عفان آنکھیں کھول دے۔'' فائزہ بیگم جلدی جلدی بہت بے ربط طریقے سے ایمان کو حقیقت سے آگاہ کر رہی تھیں کیونکہ ریاض صاحب کی دو تین کالز درمیان میں آ چکی تھیں کہ رومی کی ذہنی حالت مسلسل بگڑتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

کیسا طوفان تھا جو سب ہی کو اپنی زد میں لے کر تباہ و برباد کیے دے رہا تھا۔ ایک لڑکی کی خود غرض جنونی محبت نے کتنے ہی دلوں کو روند ڈالا تھا۔ یہاں تک کہ عفان کی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی۔ ایک معصوم لڑکی کے بسے ہوئے گھر کو آگ لگا کر رومی نے کچھ پایا تو خاک ہاں اب خود اپنی لگائی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو رہی تھی۔ فائزہ بیگم کے جانے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب اس کو اطمینان دلا کر چلے گئے تو وہ شازی کا ہاتھ تھام کر اسپتال جانے کے لیے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ راحت بیگم کی کال شازی کے موبائل پر آ گئی۔

''نہیں شازی، تم لوگ ہرگز بھی اسپتال نہیں آؤ۔ احسان اور راحیلہ بے حد جذباتی ہو رہے ہیں، وہ ایمان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے اور یہ سچ بھی ہے اس وقت عفان کی اس حالت کی ذمے دار وہی تو ہے۔ ڈیوٹی پر موجود ایک نرس نے رومی اور ایمان کے درمیان تلخ کلامی ہوتے ہوئے دیکھی تھی اسی نے سب کو بتایا ہے اور شازی جانتی ہو ڈاکٹر بھی ان دونوں لڑکیوں سے بہت اپ سیٹ ہے۔ براہِ کرم ایمان سے کہو کہ اگر اسے اپنی عزت عزیز ہے تو اسپتال بالکل نہ آئے۔ عفان کومے میں چلا گیا ہے شازی تم لوگ اپنے دل نرم کر کے اس کی زندگی کے لیے دعا کرو۔'' راحت بیگم ایک تسلسل سے بولتے ہوئے آخر میں رو پڑیں۔

''کیا کہہ رہی تھیں امی؟'' ایمان نے بے تابی سے پوچھا۔ تب شازی نے بہت شکستہ لہجے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ ایمان اپنا دل تھام کر رہ گئی۔

''شازی میرا دل پھٹ جائے گا۔ عفان نے کتنے درد سے مجھے پکارا تھا۔ ایک معصوم بچے کی طرح میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا وہ۔ میں نے یہ کیا کر دیا میرے اللہ۔ کاش میں رومی کی باتوں میں آ کر یوں غصے میں اندھی نہ ہوتی۔ شازی کاش میں اس کی غلطی



معاف کر کے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی۔ فائزہ آنٹی ٹھیک کہہ رہی تھیں، میں اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ ہی نہیں سکی۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔ اس کی پھپھو نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''بیٹا! اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں، بس تم دل سے اس کی زندگی کے لیے دعا کرو۔ کاش تم نے کچھ سمجھ داری سے کام لیا ہوتا تو یہ المناک حادثہ کبھی نہ ہوتا۔ اللہ غارت کرے اس منحوس لڑکی کو جس کی باتوں میں آ کر تم نے ایسا قدم اٹھایا۔ بیٹا ایک تو غصہ اور دوسرے کان کا کچا ہونا انسان کے لیے بڑا نقصان دہ ہوتا ہے۔'' وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔

شام ہو رہی تھی لیکن وہ بس ایک ہی جگہ بیٹھی ..... روئے جا رہی تھی۔ اس کا رواں رواں عفان کے لیے دعا کر رہا تھا۔ اسپتال سے پھر کوئی فون نہیں آیا تھا۔ شازی نے کتنی دفعہ ٹرائی کیا لیکن راحت بیگم کا موبائل آف جا رہا تھا۔ ایمان بار بار اسپتال جانے کے لیے تڑپ کر اٹھتی لیکن شازی اسے سختی سے روک دیتی۔ رات گئے شہریار اور راحت بیگم اسپتال سے واپس آئے تو شہریار ان لوگوں سے ملے بنا تیزی سے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ جو ان کی ناراضی کا واضح اظہار تھا۔ البتہ راحت بیگم تھکے تھکے قدموں سے ان لوگوں کے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں۔

''کیسے ہیں عفان، پلیز امی جلدی بتائیں؟'' ایمان نے بے قراری سے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ جسے انہوں نے نفرت سے جھٹک دیا۔

''ابھی تو تمہاری شادی کو صرف تین چار ہی دن ہوئے تھے ایمان تم ایسی دلہن ہو جس نے شادی والے گھر کو خود ہی ماتم کدے میں بدل دیا۔'' راحت بیگم کی بات پر اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

''اللہ نہ کرے امی، خدا کے لیے مجھے عفان کی خیریت بتائیں۔''

''کیا بتاؤں، وہ ابھی بھی کومے میں ہے۔ ڈاکٹر اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ کچھ اداسی سے الجھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

''ایمان بی بی یہ لیجیے آپ کے لیے گرما گرم چائے۔'' وقتاً امینہ کی آواز اسے ماضی سے حال میں لے آئی۔

''تھینک یو بوا ماسی اس وقت سچ مچ مجھے چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔'' اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کپ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آج آپ کچھ زیادہ ہی اداس نظر آ رہی ہیں ایمان بی بی!'' امینہ نے گہری گہری نظروں سے اس کے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''ہاں بوا ماسی آج اٹھارہ اگست ہے نا ہماری ویڈنگ اینی ورسری، سچ آج کے دن میرا دل چاہتا ہے کہ میں عفان کے پاس ڈھیر سارے گلاب کے پھولوں کے بوکے لے کر جاؤں، انہیں پیار سے پکاروں، وہ یقیناً آنکھیں کھول دیں گے۔'' امینہ کو اس معصوم سی لڑکی پر بے طرح ترس آنے لگا۔ تقریباً چھ سال ہونے والے تھے عفان کو کومے میں گئے ہوئے۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ ایک سال تو وہ اسپتال میں رہا پھر احسان صاحب نے اسے گھر پر شفٹ کروا دیا تھا جہاں اس کی بہت اچھی کیئر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ یہ کومے سے باہر آ بھی سکتا ہے اور شاید نہیں بھی۔ لیکن گھر والوں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اس طرح کے کچھ کیسز ان لوگوں نے سنے تھے کہ دس دس سال سے بھی زیادہ عرصے کوے میں رہنے کے بعد مریض آخر کار اچھا ہو کر نارمل زندگی میں لوٹ آیا سو انہیں بھی آس تھی کہ عفان ایک روز ضرور آنکھیں کھول دے گا۔ ان چھ سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ انیلا کی شادی بہت سادگی سے ہوگئی تھی۔ اس کی شادی کے روز جیسے گھر میں محرم کا سا سماں لگ رہا تھا۔ عفان ان کا جوان اکلوتا بیٹا اور بھائی گھر میں موجود تھا لیکن بہن کی شادی کی خوشیوں سے بالکل بے خبر۔ ادھر شازی بھی اپنے پیا سنگ رخصت ہوگئی تھی۔ ایمان کی لاکھ منت سماجت اور معافی مانگنے کے باوجود احسان صاحب اور راحیلہ نے اسے اپنے گھر آنے کی قطعی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ اسے اپنے بیٹے کی اس حالت کا ذمے دار گردانتے تھے۔ اس حادثے کے ایک ماہ بعد جب ایمان کو یہ پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ حیرت اور خوشی سے ساکت رہ گئی تھی۔ شاید یہ آنے والا ننھا مہمان ان سب کے لیے مبارک ثابت ہو اور عفان واپس سب کے پاس آجائے۔ اس خوش خبری کو راحت بیگم اور شہریار نے بہت بجھے دل کے ساتھ سنا تھا لیکن نہ جانے کیوں ایمان کے دل میں خوشیوں کے ننھے ننھے دیپ روشن ہونا شروع ہو گئے شاید اب اپنے بچے کی وجہ سے وہ عفان کو جا کر دیکھ سکے گی۔ احسان انکل اور راحیلہ آنٹی کا دل یقیناً موم ہو جائے گا آخر وہ ان کے عفان کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن اس کا دل ٹوٹ گیا جب احسان صاحب نے اس خبر کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔

''ہمارا جینا زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے، ہر صبح ہم دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کمرے میں جاتے ہیں کہ وہ ہمیں ملے گا بھی یا نہیں۔ ایسے میں ہمیں کسی بھی خوش خبری سے کوئی غرض نہیں۔ براہِ کرم ایمان سے کہہ دیں کہ اس کے بہانے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے راحت بیگم کو بہت روکھے انداز میں جواب دیا تھا۔

کتنے جانکسل لمحات سے گزر رہی تھی ایمان یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ اپنے محبوب اپنے شوہر کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستی وہ معصوم لڑکی بس تڑپ کر رہ گئی۔ زندگی اس کے لیے ایک ایسی جیل کے مانند ہوگئی تھی جس میں وہ جیسے عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہو۔ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی وہ سہاگن نہیں تھی۔ انہی حالات میں اس نے جب علینہ کو جنم دیا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی یہ بچی اس کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے آئی ہے۔ وہ اس کے عفان کی بچی تھی یہ احساس ایک طاقت بن کر اسے دوبارہ جینے کا طریقہ سکھا گیا۔ سسرال میں بھی علینہ کی پیدائش کی خبر دی گئی لیکن وہاں سے کوئی رسپانس نہیں آیا۔ اس دن ایمان ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔

''امی میری بچی کو اس کا باپ دکھا دیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کی موجودگی کو محسوس کر کے آنکھیں کھول دے کوے سے باہر نکل آئے۔'' اس نے اتنے درد سے راحت بیگم سے التجا کی کہ ان کا دل کٹ کر رہ گیا اور جب وہ بچی کو لے کر عفان کے گھر پہنچیں تو احسان صاحب اور راحیلہ بیگم کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ بچی کو پالنا کر وہ اس طرح بے اختیار ہو کر روئے تھے کہ راحت بیگم بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکیں۔ کتنی ہی دیر وہ لوگ علینہ کو لے کر عفان کے کمرے میں بیٹھے رہے لیکن وہ یونہی آنکھیں موندے دنیا سے بے خبر لیٹا ہوا تھا۔



راحت بیگم علینہ کو لے کر مایوس لوٹ آئیں لیکن ایمان کا یقین روز بروز قوی ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا عفان ایک بار پھر اس کی زندگی میں واپس لوٹ آئے گا۔ علینہ کی پیدائش پر فائزہ بیگم کا فون امریکا سے آیا تھا۔

''بہت مبارک ہو تمہیں ایمان، دیکھو اللہ نے تمہیں خوشیاں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے بس تم ہمت نہ ہارنا۔ انشاء اللہ یہ بچی اپنے ماں اور باپ دونوں کے سائے میں پلے بڑھے گی۔'' فائزہ بیگم کی باتوں نے جیسے ایمان کے اندر ایک نیا حوصلہ ایک نئی امنگ پیدا کر دی پھر وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولیں۔

''ایمان اپنی اس بچی کے صدقے میں تم رومی کو معاف کر دو۔ پرسوں اس کا نکاح ہے۔ ڈاکٹرز نے اس کی جلد از جلد شادی کے لیے کہا تھا۔ یہاں امریکا میں ہی ہمیں ایک رشتہ مل گیا ہے۔ آذر لڑکا عمر میں رومی سے بہت بڑا ہے لیکن بہت سیٹلڈ اور سمجھ دار انسان ہے وہ یقیناً رومی کو سمیٹ لے گا۔ رومی کی ذہنی حالت بہتر تو ہوئی ہے لیکن ابھی بھی وہ اس شاک سے پوری طرح باہر نہیں آئی ہے۔ ایمان میری بچی اس نے تمہیں جس طرح برباد کیا مجھے تم سے یہ کہنا تو نہیں چاہیے تھا لیکن کیا کروں ماں ہوں نا میں چاہتی کہ وہ تمہاری بددعائیں لے کر اپنی زندگی کا یہ نیا سفر شروع کرے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے واپس آنے کا بھی کہ نہیں۔'' وہ بے ساختہ رو دیں۔

''آنٹی ان بدترین دنوں میں آپ نے مجھے بہت سہارا دیا تھا آپ میری محسن ہیں۔ میں اپنی بچی کے صدقے میں اور آپ کی خاطر رومی کو معاف کرتی ہوں بس اتنا خیال رکھیے گا کہ وہ کبھی بھی مجھ سے کسی بھی طرح کا کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔'' ایمان فون رکھ کر کتنی ہی دیر بہت اپ سیٹ سی بیٹھی رہی۔

عفان کے کوے میں جانے کے بعد رومی کی ذہنی کیفیت بھی کافی بگڑ گئی تھی اس پر مستزاد فائزہ بیگم کی سب خاندان والوں کے سامنے شرمندگی نے انہیں جیسے سب ہی سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ ریاض صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ رومی کو علاج کے لیے امریکا لے گئے اور اب وہیں اس کی شادی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں رومی یہ شادی نبھا بھی پاتی یا نہیں لیکن بہرحال ریاض صاحب اور فائزہ بیگم اپنے حساب سے ایک کوشش کر رہے تھے۔

☆☆☆

علینہ ابھی دو سال کی تھی کہ شہریار صاحب کے اسلام آباد ٹرانسفر کے آرڈرز آگئے لیکن ایمان نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''نہیں ابو، میں یہیں کراچی میں رہوں گی کیا خبر کس دن عفان ہوش میں آجائیں پھر مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی اس گھر میں جانے سے۔'' اس نے اتنے حتمی انداز میں کہا کہ راحت بیگم اور شہریار کچھ بول نہ سکے۔ شازی بھی کراچی میں تھی جس کی وجہ سے انہیں کچھ تسلی تھی سو ابھی نئی بلڈنگ میں ایک اپارٹمنٹ ایمان کے لیے بھی لے لیا گیا اور پھر ہونے اتفاق ارسلان کے ذریعے امینہ بھی ایمان کو مل گئی اور یوں وہ لوگ مطمئن ہو کر اسلام آباد چلے گئے۔

علینہ ہر ہفتے باقاعدگی سے اپنے دادا دادی کے پاس جاتی تھی۔ عفان کے کمرے میں بھی اس کا ڈھیر سارا وقت گزرتا۔ جب وہ واپس آتی تو ایمان گریڈ گریڈ کر اس سے ہر بات پوچھا کرتی۔ اس دن ایمان اور علینہ ایک برتھ ڈے پارٹی میں جانے لگے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو امینہ نے نہ جانے کیا سوچ کر اس سے کچھ گھنٹوں کی چھٹی مانگ لی۔

"ٹھیک ہے لیکن جہاں جائیں ٹیکسی سے ہی جائیں۔" ایمان نے ہزار روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے تاکید کی تو امینہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

جب ٹیکسی اس کے چھوٹے سے گھر کے سامنے رکی تو محلے کے بچے حیرانی سے اسے دیکھنے لگے جو اپنے گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ چھوٹے سے صحن میں بچھی جھلنگا سی چارپائی پر رحیم کا مدقوق جسم جیسے ایک ڈھانچے کے مانند پڑا ہوا نظر آ رہا تھا اس وقت بھی شاید اسے کھانسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ امینہ نے جلدی سے پاس پڑے مٹکے سے پانی بھر کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ رحیم نے مندی مندی آنکھوں سے اسے پہچاننے کی کوشش کی اور پھر جیسے چیخ اٹھا۔

"امینہ یہ تو ہے ... ارے کہاں چلی گئی تھی مجھے چھوڑ کر۔" امینہ کی آنکھوں میں سرخی سی اتر آئی۔

"کاش میرے بس میں ہوتا تو تجھ جیسے نابکار شخص کو جان سے مار دیتی لیکن میں تیرے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگوں..... تجھے تو اللہ کی طرف سے خود ہی سزا مل رہی ہے۔" رحیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے امینہ، اب تو محلے والے بھی مجھے نہیں پوچھتے۔ سسک سسک کر کسی دن اکیلا ہی مر جاؤں گا۔ دو تین سال پہلے مولوی فضل اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ آیا تھا مجھے بہت ہی مارا پیٹا لیکن میں تیرے بارے میں کیا بتاتا، مجھے تو خود کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ تجھے اس سے ساری زندگی طلاق نہیں ملے گی۔" رحیم کی بات پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

"ہونہہ اب میرے لیے نہ کسی شادی کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی کسی طلاق کی ...... یہ سب چیزیں تو زندہ انسانوں کے لیے ہوتی ہیں اور میں تو کب کی مر چکی۔ رحیم تجھے پتا ہے کہ..." اس کی بات رحیم نے روتے ہوئے کاٹ دی۔

"ہاں، ہاں مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ امجد وہی ڈاکو جو تجھے بس میں ملا تھا میرے پاس بھی آیا تھا اس نے حمید اور رشید کے بارے میں جب سے بتایا ہے مجھ سے سانس بھی نہیں لی جا رہی، مجھے معاف کر دے امینہ۔" وہ زار و قطار رونے لگا لیکن امینہ کوئی جواب دیے بنا تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ رحیم چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہا تھا لیکن جیسے اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ رحیم کی آوازیں پیچھے رہ گئیں اور وہ چپ چاپ آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ کتنے ہی دن اس کے دل پر ایک سناٹا سا طاری رہا۔

☆☆☆

ایمان ان کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی کہ اس دن رحیم کے پاس سے واپس آ کر وہ ایمان کے گلے لگ کر بے تحاشا روئی تھیں۔ اس دن صبح ایمان نے اخبار پڑھتے ہوئے انہیں پکارا تو وہ کام چھوڑ کر جلدی سے اس کے پاس آ گئی۔

"بوا ماسی یہ آپ مسز رازی کا ذکر کرتی رہتی ہیں دیکھیں یہ کہیں وہی تو نہیں۔" ایمان نے اخبار ان کے سامنے کر دیا۔ ایک چھوٹے سے سیاہ حاشیے میں مسز رازی کی تصویر کے ساتھ ان کی تیسری برسی کی اطلاع ان کے بچوں کی طرف سے لگائی گئی تھی۔ امینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یقیناً آج سے تین برس قبل ان کا انتقال سنگاپور میں ہوا تھا۔

"جی ایمان بی بی یہ وہی ہیں۔ پتا نہیں اس عمر میں پرائے وطن میں کتنی تنہائی سہی ہو گی انہوں نے۔" ایک بار پھر پچھتاوے کے احساس نے امینہ کو بے کل کر دیا۔

"یہ پچھتاوے کی آگ اتنی اذیت ناک کیوں ہوتی ہے بوا ماسی؟" ایمان نے ان کے احساسات کو سمجھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھا کہ وہ خود بھی تو ہر لحہ اس آگ میں جھلستی رہتی تھیں۔

ایک دن فائزہ آنٹی اس کے پاس آئی تھیں وہ بتا رہی تھیں۔ "رومی کے یہاں امریکا میں بیٹا ہوا تھا لیکن کچھ گھنٹوں بعد ہی ختم ہو گیا۔ اس پر پھر دیوانگی کے دورے پڑنے شروع ہو گئے ہیں لیکن بہرحال شوہر اچھا ہے اور اس کا خیال کر رہا ہے لیکن رومی اب وہ رومی نہیں رہی ہے ایمان۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ایمان نے ایک خاموش نظر اس ٹوٹی ہوئی سی ماں پر ڈالی تھی۔

"آنٹی میں نے کبھی رومی کے لیے بددعا نہیں کی کیونکہ وہ آپ جیسی نیک ماں کی بیٹی ہے۔ آپ کو دکھی دیکھ کر میرا دل کٹتا ہے۔" ایمان کی بات پر فائزہ بیگم نے بے اختیار اسے گلے لگا کر بے شمار دعائیں دے ڈالی تھیں لیکن پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سب دعائیں عرش سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتی ہیں۔ آج اٹھارہ اگست تھی۔ بوا ماسی سے اپنے دل کی ڈھیر ساری باتیں کرنے کے باوجود جیسے اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔

وقت جو بیت گیا کاش پلٹ کر آئے
پھر تیری چھاؤں تیرا قرب میسر آئے

تبھی اچانک اس کے پاس رکھا ہوا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر انیلا کا نام آتے دیکھ کر جیسے اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے دل کی دھڑکنیں تھمنے لگیں۔ ان چھ سالوں میں پہلی دفعہ انیلا نے اسے فون کیا تھا۔ پتا نہیں کون سی خبر سنانے والی تھی وہ۔

"ہیلو۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایمان تمہیں پاپا نے فوراً گھر بلوایا ہے۔ آج بھائی نے پہلی مرتبہ ہاتھوں کو جنبش دی ہے۔ اُن کی آنکھوں کے پپوٹے بھی کچھ ہل رہے ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ ان کے ہوش میں آنے کے کچھ سائن ہیں۔ ایمان میرا بھائی شاید واپس لوٹ رہا ہے اور انشاء اللہ ایسا ضرور ہوگا۔ شاید تمہارے آ جانے سے یہ وقت اور جلدی آ جائے۔ ہمیں بھائی کو خوشی خوشی ویلکم کرنا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی کہا ہے کہ اگر یہ کومے سے باہر نکل آئے تو ان پر کوئی ذہنی دباؤ نہیں ہونا چاہیے۔ تم علینہ کو لے کر فوراً آ جاؤ ایمان۔" وہ بے حد ایکسائٹڈ ہو رہی تھی جبکہ ایمان ایک سکتے کے سے عالم میں کھڑی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ ناامیدی اور قنوطیت کے سیاہ بادلوں میں اللہ اچانک کیسے امید کی جگمگاتی کرن پیدا کرتا ہے۔ اس بات کا ادراک اسے اس وقت ہو رہا تھا۔ وہ تو اپنے اللہ کی مہربان پناہوں میں تھی پھر کیسے وہ اس سے ناامید ہو گئی تھی۔ اس کے چھ سالوں کے صبر کا صلہ اس کے توسط کی ذات سے اللہ کی طرف سے مل ہی گیا تھا۔ ایمان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا ایمان بی بی سب خیریت تو ہے نا؟" امینہ بہت گھبرا کر اس کے پاس آئی۔

"بوا ماسی اللہ نے میری خطا معاف کر دی ہے۔ اب احسان انکل اور راحیلہ آنٹی کو میں اپنی محبت اپنی خدمت سے منالوں گی۔ میرا افنان واپس آ رہا ہے بوا ماسی۔ میری علینہ کا باپ واپس آ رہا ہے۔ اللہ نے آخر اسے مجھے واپس لوٹا ہی دیا۔" وہ پاگلوں کی طرح انہیں گھماتے ہوئے کبھی ہنستے اور کبھی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ امینہ بھی خوشی سے رو پڑی۔ شازی یہ خبر سن کر دوڑی چلی آئی۔ راحت اور شہریار بھی اگلی فلائٹ سے پہنچ رہے تھے۔ ایک عید کا سا سماں تھا۔

"میں جا رہی ہوں بوا ماسی، آپ دعا کریں کہ میں جلدی آپ کو کوئی خوش خبری سناؤں۔" وہ خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ علینہ کا ہاتھ تھامے شازی کے ہمراہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"ایمان بی بی انشاء اللہ آپ کو آپ کی سب خوشیاں دوبارہ ملیں گی۔ آپ کا سہاگ اللہ آپ کے سر پہ ہمیشہ قائم رکھے۔" امینہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں اور پھر پھوٹ کر بولی۔

"ایمان بی بی! اب میں بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں، یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ سے ملنے آتی رہوں گی کہ علینہ میں میری جان ہے۔" ایمان نے اس کی بات پر کچھ جز بز ہو کر اسے دیکھا لیکن اس کے پاس بحث کرنے کا ٹائم نہیں تھا۔ ایک بہت بڑی خوشی نے جیسے اس کے حواس معطل کیے ہوئے تھے۔

ایمان کے جانے کے بعد وہ جب اپنا مختصر سا سامان لے کر سیڑھیاں اتر رہی تھی تو اس کی نظروں میں رحیم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ ایمان کا پیارا سے واپس ملنے والا تھا لیکن اس کا رحیم کل مر گیا تھا، یہ اطلاع اسے اس وقت ملی جب ایمان کی زندگی میں خوشیوں نے دستک دی تھی۔ وہ اسے اس وقت کچھ بھی نہ بتا سکی تھی۔ وہ ایک تہی دامن عورت تھی۔ رحیم آوارگی کی موت ضرور مرا تھا لیکن ابھی وہ اس کا سوئم، چالیسواں کروانے کو زندہ تھی کہ اس نے جو کچھ بھی کیا لیکن وہ اس کے بچوں کا باپ تو تھا۔



آج اس کی دلہن سی سجی تھی۔ حویلی کے شیشوں پر لال ہری روشنیوں کا عکس تحرک رہا تھا۔ سارا گھر رنگین روشنیوں سے منور تھا۔ علینہ نے سرخ جوڑا پہنا ہوا تھا اور سرخ کامدار دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ اپ سے حسین چہرہ کی اندرونی خوشی سے روشن ہو رہا تھا۔ وہ بھی بے ارادہ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ باہر ایک ہنگامہ سا بپا تھا۔ بچے چوبارے سے اس کا دل بھی انہی جلتی بجھتی روشنیوں کی

# روگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح جل بجھ رہا تھا۔ حالانکہ خاور صاحب نے اپنی پیاری بیٹی عندلیب کی شادی میں دھوم دھام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن پھر بھی وہ مضطرب تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں درد جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

مصنوعی آرائش کے باوجود اس کے چہرے پر وہ چمک مفقود تھی جو کہ عموماً دلہنوں پر "روپ" بن کر نظر آتی ہے۔ بجھی بجھی آنکھوں میں ٹمٹماتی سی امید کی لو تھرتھرا رہی تھی جیسے اپنی خوشیوں پر اسے یقین نہیں آرہا ہو۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی مگر خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔ اگرچہ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا مگر اندر کی کسک اسے تڑپا رہی تھی۔

آج سے تین سال پہلے جب اس کی منگنی ہوئی تھی تب وہ بڑی خوش تھی۔ دل کے بند دروازے پہلی بار کھلے تھے۔ جھلملاتا ہوا میرون کامدار دوپٹا اس کے بے ریا شفاف چہرے کو تابناک بنا رہا تھا۔ اس کے نوخیز جذبوں پر اس روز سے بابر کی اجارہ داری ہوگئی تھی۔ اس کی انگلی میں بابر کے نام کی جڑاؤ انگوٹھی بھی ہوئی تھی۔ یہ خوب صورت لمحہ اس کی زندگی میں اتنی خاموشی سے بے چاپ چلا آیا تھا اور ایک ہی پل میں بابر کو اس کے لیے اہم بنا گیا تھا۔ وہی بابر جسے اس سے پہلے کبھی اس نے خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

منگنی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی سب طرف سکوت پھیل گیا۔ سب مہمان چلے گئے تھے۔ مٹھائی، پھول اور دیگر لوازمات کمرے میں ایک طرف رکھے تھے۔ اسے یہ سب کچھ اچھا بھی لگ رہا تھا مگر کچھ الجھن بھی ہو رہی تھی کیونکہ اس سے قبل کبھی ایسی صورتِ حال کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ اچانک طے ہوگیا۔

بابر سے اس کی ایک دو بار ہی سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ عائشہ آپا کا دیور تھا اور عائشہ آپا اس کی امی فرح کی فرسٹ کزن تھیں۔ بابر کے لیے عندلیب کا انتخاب عائشہ آپا نے ہی کیا تھا اور ان کا انتخاب کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس کے چندا سے چہرے پر پھولوں کی نرمی برستی تھی اور جلترنگ سی ہنسی دل میں اتر جاتی تھی۔ بس اس کی یہی خوبیاں عائشہ آپا کو بھا گئیں۔ جب کبھی عائشہ آپا آتیں تو ساتھ میں بابر بھی چلا آتا۔ حالانکہ ان کے ہاں پردے کی پابندی نہیں تھی بس وہ یونہی خود ہی جھجک کر قصداً اس کے سامنے جانے سے گریز کرتی تھی لیکن اتنا کم ملنے میں بھی اس نے بابر کی شوخ آنکھوں میں دلچسپی بھانپ لی تھی اسی لیے وہ اس سے کترا کر نکل جاتی تھی۔ وہ لمبے قد اور چھریرے جسم کا خوب صورت لڑکا تھا۔ اس کا ناک نقشہ بھی قانونی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا مگر عندلیب ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے نسوانی وقار کو بلند رکھتی ہیں۔ اس کے مزاج اور شخصیت میں ایک ساحرانہ سی تمکنت تھی۔

اور اب وہ اسی کے نام سے منسوب کر دی گئی تھی۔ وہ ساری اجنبیت اور گریز لمحہ بھر میں ہی فاصلوں کو قریب کر گیا۔ وہی بابر اب اس کے لیے سب سے اہم اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ نئے نویلے احساسات کا خمار اس کے کورے جذبوں میں شامل ہو کر اس کے خیالات کو رنگین بنا رہا تھا۔ وہ بے ارادہ ہی صرف اور صرف بابر کو سوچے جا رہی تھی۔

امی اور اس کی بہن نایاب مہمانوں کے جانے کے بعد گھر سمیٹنے میں لگی تھیں اور ابھی تک مصروف تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بے قراری سے بجنے لگی تو اسے اپنے خیالات کو لپیٹ کر ایک طرف رکھنا پڑا کیونکہ اس وقت صرف ایک وہی بیکار بیٹھی ہوئی تھی۔



اس نے کچھ بددلی سے فون ریسیو کیا۔

"ہاں جی، تو کیا سوچا جا رہا ہے اس وقت؟..... یقیناً مجھے ہی؟" اس کے ہیلو کے جواب میں بابر کی آواز نے جیسے یک بیک اس کے سارے اوسان سلب کر دیے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ بابر براہِ راست اس سے فون پر بات کرے گا۔ اس کا گلا خشک ہو گیا اور ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی اتر آئی۔ وہ کچھ نہ بول پائی۔

"ہیلو..... ہیلو عندلیب!" بابر نے کئی بار اسے پکارا۔

"جی..... ہیلو" تب وہ مری ہوئی دبی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا بات ہے، کیا تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو؟" اس کے انداز میں تشویش در آئی۔

"جی وہ..... نہیں تو..... ہاں، نہیں..... وہ تو..... وہ کافی نروس ہو گئی۔ تب بابر کو خود ہی اس کے حال پر رحم آ گیا اور اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اس کے خاندان میں جتنی بھی شادیاں ہوئیں ان میں شادی سے پہلے آپس میں ملنے جلنے اور گھومنے پھرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس لیے اسے بھی بالکل امید نہیں تھی کہ بابر اس سے رابطہ کرے گا اسی لیے اس وقت وہ اتنی زیادہ گھبرا گئی تھی ورنہ وہ اتنی شرمیلی بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ رشتہ عین مناسب گھر والوں کی پسند سے طے ہوا تھا۔ اس میں محبت کا عمل دخل کہیں بھی نہیں تھا اور عندلیب جیسی لڑکی محبت جیسی حماقت کر بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کے گھریلو ماحول میں اس بات کی گنجائش نہیں نکلتی تھی مگر بابر نے یہ انکشاف کر کے اسے چونکا دیا تھا کہ یہ رشتہ سراسر اس کی پسند اور ایما پر ہوا ہے اور یہ سن کر عندلیب کو پہلی بار اپنی ذات کی وقعت و اہمیت پر ناز ہوا تھا۔

اس نے کبھی بھی اپنی زندگی سے متعلق لمبے لمبے منصوبے نہیں بنائے تھے اور نہ ہی کوئی خیالی پیکر تراش کر اسے آئیڈیل کا نام دیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انسان کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل کرنے کا مکمل اختیار رکھتا ہے لیکن بابر نے اس کی زندگی میں شامل ہو کر نہ صرف اسے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا بلکہ اس کے دل کے خالی تخت پر وہ بڑی شان سے آئیڈیل کا روپ دھار کر جلوہ گر ہو گیا اور اس کے سامنے مسکراتی ہوئی تقدیر کو لا کھڑا کیا۔

"سنو، کل چار بجے تک تیار رہنا۔ ہم شاپنگ کرنے جائیں گے۔" ایک روز عائشہ آپا کا فون چلا آیا۔ وہ ان کے آرڈر پر پریشان ہو گئی۔ عائشہ آپا کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اب تو ان سے سسرالی رشتہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اب وہاں جانا کہاں مناسب تھا۔ فرح کے ساتھ وہ بھی متردد ہوئی۔

"اب تو مناسب نہیں لگتا۔" انہیں بھی یہ بات پسند نہیں آئی۔ لیکن نایاب ان دونوں سے ذرا مختلف سوچ رکھتی تھی اور عندلیب کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار اور ہوشیار تھی۔ نئے دور کے تقاضوں کو وقت کے ساتھ ساتھ قبول کرتے ہوئے زندگی کی میٹر ھیوں کو بڑے ہموار طریقے سے طے کر رہی تھی۔

"مگر پیاری امی، ذرا مجھے کھل کر بتائیں کہ کیوں مناسب نہیں ہے؟" وہ درمیان میں کود پڑی۔

"بھئی اب وہ عندلیب کی سسرال ہے۔ پہلے کی بات اور تھی مگر اب اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے ہاں کب ایسا ہوتا ہے پھر باتیں بنانے والے سو باتیں بنا دیتے ہیں۔" فرح بیگم نے سوچا نایاب ابھی نادان ہے ان باریکیوں کو کیا جانتی ہوگی مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔ نایاب تو ان سے بھی زیادہ گہری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچ رکھی تھی۔

''امی، عائشہ آپا سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں اگر ہم نے ابھی سے انہیں عندلیب کی سسرال والی سمجھنا شروع کر دیا تو پھر بعد میں شکایت نہیں کیجیے گا۔'' اس نے نپے تلے انداز میں اپنی بات کہی۔

''کیسی شکایت؟'' فرح بیگم پھر بھی اس کی بات نہ سمجھیں۔

''عائشہ آپا اس بات کو بہت محسوس کریں گی۔ ہمیں چاہیے کہ جس طرح ہم پہلے اُن سے کھل مل کر ملتے تھے اسی طرح ان سے ملتے رہیں۔ اس طرح تو دوریاں پیدا ہوں گی اور آفٹر آل عندلیب کو اسی گھر میں جانا ہے۔ اچھا ہے عائشہ آپا کی صحبت میں وہ پہلے سے وہاں کے مطابق بن جائے گی اور سب سمجھ لے لی۔'' نایاب کی باتوں میں وزن تھا۔ فرح بیگم نے کھلے دل سے اس کی باتوں کو تسلیم کر لیا اور پھر کوئی اعتراض نہ کیا۔

☆☆☆

اگلے روز عائشہ آپا اسے لینے آ گئیں۔ دروازے سے باہر بابر کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا تو عندلیب اپنا دوپٹا درست کرتے ہوئے بے اختیار باہر نکلی۔ فرنٹ سیٹ پر بابر کو براجمان دیکھ کر اس کی دھڑکنیں منتشر ہو گئیں۔

''ارے بچی جلدی آؤ۔'' [illegible] ہی عائشہ آپا اس سے یوں مخاطب ہوئیں جیسے کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو۔

ادھر بابر کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ اور شوخی پکار پکار کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ اس کی زندگی میں انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ ایسا حسین انقلاب جس نے چند ہی روز میں اس کی ہستی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے اور دل کی دھڑکنوں میں زندگی سے معمور سرگوشیاں اسے گدگداتی رہتی ہیں۔

وہ اپنے احساسات کو سنبھال کر بالآخر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دل کو تسلی تھی کہ عائشہ آپا بھی ساتھ ہیں۔ رستہ جیسے تیسے کٹ ہی گیا مگر شاپنگ سینٹر پہنچ کر عائشہ آپا خود اتر کر چل دیں اور عندلیب کو بابر کے سنگ چھوڑ دیا۔ عندلیب کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ ایسی صورتِ حال کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا، وہ ایک سادہ سی گھریلو لڑکی تھی۔ ایسے کسی ایڈونچر کا نہ اسے کوئی شوق تھا اور نہ ہی دلچسپی۔

''ٹیک ایزی عندلیب... بھابی نے یہ سب میری خواہش پر کیا ہے۔'' اس کے مضطرب چہرے اور جھجکتی آنکھوں سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگا کر بابر نے اسے وضاحت دی۔

''ہماری انگیجمنٹ ہو چکی ہے عندلیب... اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس وقت تمہاری جو فیلنگز ہیں میں جانتا ہوں کہ وہ کچھ اچھی نہیں ہے۔ تمہاری بڑھتی [illegible] صورت پر صاف نظر آ رہی ہے مگر میں خود اپنی [illegible] سے [illegible] پریشان ہو کر یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے [illegible] ملتے رہیں۔'' وہ [illegible] بڑے رواں انداز میں سادہ سے لفظوں میں اس پر اپنے خیالات واضح [illegible]۔

اس کی [illegible] شاپنگ پلازہ والے روڈ پر رواں دواں تھی۔ زیست کا سفر ایک نئی سمت کو چل پڑا تھا اور وہ اپنے ہم سفر کا ساتھ دینے پر پورے دل سے آمادہ تھی لیکن اسے بہت سے وسوسے اور اندیشے بھی ڈرا رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا یا نہیں، وہ یہ بات طے نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس کی توقع سے ہٹ کر ہو رہا تھا۔ اس کی تصوراتی دنیا تو بہت محدود اور مختصر سی تھی لیکن حقیقی سفر میں وہ اس سے بھی آگے چل رہی تھی۔ وہ خواب نگر کی شہزادی سچ مچ کی دنیا میں آ گئی تھی۔

''ہمارے ہاں... میرا مطلب ہے، ہمارے معاشرے میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' بابر کی تمام باتوں کے جواب میں اس نے بس یہی کہا۔

''ارے گولی مارو ان باتوں کو... سب طرف دیکھنا چھوڑ دو۔ لوگوں کا کیا ہے، ان کو تو افسانہ بنانے کا موقع ملنا چاہیے بس... صرف اپنے دل کی سنو... دل کی مانو... کیونکہ ہماری عمر کا یہ موڑ ہمارے لیے اہمیت رکھتا ہے ان سب کے لیے نہیں... اسے یادگار بنانا اور خوشگوار بنانا ہمارا کام ہے۔'' وہ اس سے ایسے مخاطب تھا جیسے ان دونوں میں برسوں سے ناتا ہو۔

عندلیب کا دل ہر گزرتے پل کے ساتھ مزید تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے نیا تھا لیکن جو سرور اس میں تھا اس کا خمار پوری طرح اس کے وجود میں بھر گیا تھا۔

''دیکھو عندلیب، میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر بھی مجھے کسی گزرے وقت کا ملال یا پچھتاوا ہو... یا کوئی حسرت یا کسک دل میں رہ جائے۔ ہمیں اپنی خوشیوں کو خود ہی بڑھانا ہے۔ ہماری خوشیوں میں خوش ہونے والے کم اور جلنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔'' وہ اپنے دل کی باتیں اس کے ذہن میں منتقل کرتا گیا۔ وہ وقت تو جیسے [illegible] ہی گیا۔ کئی روز تک عندلیب خود کو اس ملاقات کے سحر سے نہیں نکال پائی۔ وہ بار بار اس سے بات کرنے اور ملنے کا خواہاں تھا۔ فرح بیگم نے دبے لفظوں میں اعتراض بھی کیا مگر عائشہ آپا نے اسے رد کر دیا۔

''ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے انجان نہیں ہیں، نہ ہی بابر ایسا ویسا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے درمیان وہی پہلے والی بے تکلفی اور ملنا جلنا قائم رہے۔'' عائشہ آپا نے فرح بیگم کی بات کو ٹال دیا۔

اور بابر نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔ اس نے اپنے من پسند رنگوں سے اپنے سپنوں میں رنگ بھر لیے۔ زندگی نے ایک بڑا خوب صورت سا موڑ لیا تھا۔ عندلیب کے لیے یہ سب بہت کیف آگیں تھا۔ اس کی زندگی کے شفاف آئینے میں بابر بہت نمایاں ہو کر ابھرا تھا۔ وہ بابر کی بنائی ہوئی اس دنیا میں کھو سی گئی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں ساجدہ پھپھو کویت سے آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں اُن کی آمد کی رونق [illegible] تھی۔ ان سے ملنے کے لیے روز ہی کوئی نہ کوئی رشتے دار آ رہا تھا۔ ایک روز عائشہ آپا بھی بابر کے ساتھ [illegible] ڈھیر سے مٹھائی کا بڑا سا ڈبا لیے چلی آئیں اور ساجدہ پھپھو سے خاص طور سے ملیں۔ اچھی خاصی [illegible] رونق بڑھ گئی۔ عندلیب کا چہرہ بابر کی آمد سے [illegible] گل رنگ ہو گیا۔ اس نے نایاب کے ساتھ مل کر کچن [illegible] بڑے اور رس ملائی بازار سے منگوائی گئی۔ [illegible] ٹیبل پر سجاتے ہوئے، آتے جاتے [illegible] اس کے معمولی سے بابر کی نظریں اٹھتی رہیں اور عندلیب خود میں سمٹی سمٹی رہی۔ ساجدہ پھپھو بھی مہمانوں میں گھل مل گئیں اور بابر سے مل کر تو بہت ہی خوش ہوئیں۔ بڑی دیر تک اسے پاس بٹھا کر اس سے باتیں کرتی رہیں۔ اس کی مصروفیات اور دلچسپیوں کو کریدتی رہیں مگر عائشہ آپا اور بابر کے جانے کے بعد فرح بیگم کو خوب باتیں سنائیں۔

''غضب خدا کا... یہ طور ہیں ہمارے





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھرانوں میں؟ اپنی مرضی کے رسم و رواج توڑ مروڑ کر جیسے جی چاہا بنا لیے۔ ابھی صرف منگنی ہوئی ہے اور لڑکا منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا پہلے۔'' ان کے لتے لینے پر فرح بیگم پریشان ہو گئیں اور عندلیب کا چہرہ بھی بجھ گیا۔ اسی دن سے اور اسی طعنے سے ڈرتی تھی وہ... مگر بابر پر اس کی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا وہ اس سے یہی کہتا تھا کہ لوگوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو صرف خود کو اور اپنی خوشیوں کو دیکھو۔

''یہ سب عائشہ آپا اور بابر کے کہنے پر ہو رہا ہے ساجدہ باجی... ورنہ میں خود ہی خلاف ہوں ان باتوں کے... اب ان کا اصرار تھا تو اسی لیے...'' فرح بیگم گڑبڑا کر وضاحتیں دینے لگیں۔

''ارے واہ... ابھی سے داماد سے دب گئیں... ارے بھئی ہماری بچی ابھی ہمارے پاس ہی ہے پھر وہ کیوں حکم چلا رہی ہیں۔ ابھی تو ہماری چلے گی اور تم نے ابھی سے ہتھیار ڈال دیے۔'' انہوں نے فرح بیگم کو لتاڑ کر رکھ دیا۔ فرح سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ کھسیانی سی ہو کر رہ گئیں۔

''ارے پھپھو... یہ شادی ہو رہی ہے یا جنگ... جو آپ ہتھیار بھی میدان میں لے آئیں۔'' نایاب نے ہنستے ہوئے چبھتی ہوئی بات کہہ دی۔ اس کی بات پر ایک لمحے کے لیے ساجدہ پھپھو کے چہرے کا رنگ بدلا مگر پھر انہوں نے نادان سمجھ کر اس کی بات جیسے ان سنی کر دی۔

''وہ آج پہلی بار ہمارے گھر آیا تھا ویسے تھوڑی ہر وقت آتا رہتا ہے... دراصل تو وہ آپ سے ملنے اور آپ کو سلام کرنے آیا تھا... اس کے سامنے تو آپ پہلی بار آئی ہیں نا کویت سے... اسی لیے میں نے اسے اجازت دے دی۔'' ان کے بگڑے بگڑے سے تیور دیکھ کر فرح بیگم نے خوشامدی سے انداز میں بات بنائی۔ انہیں معلوم تھا کہ ساجدہ آپا کے مزاج بگڑتے دیر نہیں لگتی اور اعتراض در اعتراض تو ان کی فطرت کا خاصہ تھا مگر اس وقت ان کی چاپلوسی کام آ گئی۔ ساری ناراضی رفع ہو گئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تب عندلیب اور فرح بیگم کی جان میں جان آئی۔

''ویسے ہے تو بڑا پیارا اور خوبرو... عادت کا بھی اچھا ہے... مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ عائشہ کا دیور اتنا اچھا ہے۔'' انہوں نے کھلے دل سے تعریف کی تو فرح بیگم کے چہرے کی رونق بحال ہوئی۔ لیکن اس کے بعد وہ ان کے سامنے بہت محتاط رہیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بلاوجہ عندلیب یا بابر پر کسی کی انگلی اٹھے۔ ان کے جانے کے بعد ہی انہوں نے عندلیب کو بابر کا فون سننے دیا تھا۔

☆☆☆

ایک روز بابر اچانک بنا اطلاع کے چلا آیا۔ خلافِ معمول وہ چپ چپ تھا۔ اس روز فرح بیگم بھی کسی ضروری کام سے نایاب کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ اکثر ہی اس کے ہمراہ عائشہ آپا ہوا کرتی تھیں مگر اس روز وہ بالکل اکیلا تھا۔

''میں بحرین جا رہا ہوں عندلیب... دو سال کے لیے۔'' بالآخر اس نے اپنے اندر کے خلفشار کو اس پر بھی ظاہر کر دیا۔ عندلیب کو بڑا زبردست جھٹکا لگا۔ ان کی باتوں میں اس کا ذکر تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

''وہاں مجھے بڑی اچھی جاب مل گئی ہے۔ بھابی اور بھیا تو یہی چاہتے ہیں کہ میں ضرور قسمت آزمائی کروں اور میرا بھی یہی ارادہ ہے کہ اس چانس کو مس نہ کروں کیونکہ میں فیوچر میں آرام دہ اور باسہولت زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تم میرے پاس آؤ تو میرے پاس سب کچھ اس قدر بھرپور ہو کہ تمہیں کبھی کوئی کمی یا کوئی تشنگی نہ رہے۔'' وہ سب کچھ طے کر کے آیا تھا۔ وہ اسے صرف اطلاع دے رہا تھا اور وہ سب کچھ سن کر بھی اسے نہیں روک پائی کیونکہ اسے تو جانا ہی تھا۔

☆☆☆

صبر آزما دن شروع ہو گئے تھے۔ وہ ہر پل اس کی یاد کے نگر میں اس کے ساتھ رہتا تھا اس کے دل کے پاس ہمہ وقت اس کی آہٹیں اور خوشبوئیں سرسراتی رہتی تھیں۔ عائشہ آپا جب بھی آتیں اس کے بارے میں اطلاعات ضرور دیتی تھیں۔

چھ ماہ کا عرصہ تڑپتی بلکتی بے قراریوں میں گزر گیا۔ ایک روز عائشہ آپا اس کے لیے بابر کی طرف سے بھیجے ہوئے ڈھیر تحائف لیے چلی آئیں مگر اسے خوشی نہ ہوئی۔ ان مادی اشیا سے بڑھ کر بابر کی اپنی ذات تھی۔ البتہ بابر کا بھیجا ہوا موبائل اس کے درد کو کم کر گیا۔ اب تو اکثر ہی اس سے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ ابھی مزید ایک سال دل پر پتھر رکھ کر گزارنا تھا۔ کچھ ماہ بعد بابر سے اس کا موبائل پر بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ اسے کال کرتی تو ناٹ رسپونڈنگ کا جواب آ جاتا۔ ایس ایم ایس کرتی مگر اس سے بھی کچھ حاصل ہوا نہ وصول۔

تین ماہ بعد بابر نے خود اس سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ وہ نئے فلیٹ کو حاصل کرنے اور اس میں شفٹ ہونے میں از حد مصروف تھا۔ اس دوران اس کا موبائل بھی چوری ہو گیا تھا۔ اب پہلی فرصت میں نیا موبائل لے کر وہ اس سے رابطہ کر رہا تھا۔ اس کے سارے شکوے دھل گئے اور دل سے سارے شکوک جاتے رہے۔ ویسے بھی اب بابر کے آنے میں دو چار ماہ ہی رہ گئے تھے۔ فرح بیگم تو تیار بیٹھی تھیں اس کی رخصتی کے لیے مگر اچانک ہی عائشہ آپا نے آ کر یہ انکشاف کیا کہ وہ خود بھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بحرین شفٹ ہو رہی ہیں۔ اس غیر متوقع اور غیر امکانی خبر سے عندلیب کے دل کو دھچکا لگا۔ منگنی کے دوران یا بعد میں بھی کبھی ان لوگوں کے درمیان کبھی اس قسم کی بات نہیں ہوئی تھی۔

''لو جی... یہ تو سب ہی کا بوریا بستر گول... یہ کیا مذاق ہے؟'' فرح بیگم بھنا کر رہ گئیں۔

''اور ان دونوں کی شادی کب ہو گی۔ میرا تو خیال ہے کہ بابر کو ابھی بلا لو پھر شادی کر کے سب اکٹھے جانا بحرین۔'' فرح بیگم نے عائشہ آپا کو مشورہ دیا۔

''ارے بھئی ابھی تو اپنا ہی بکھیڑا سمیٹ رہی ہوں۔ شادی کا تام جھام کیسے سنبھال پاؤں گی۔ تم بے فکر رہو۔ وہاں سیٹ ہوتے ہی میں پورے انتظام سے آؤں گی اور خوب دھوم دھڑکے سے عندلیب کو رخصت کرا کر لے جاؤں گی۔'' عائشہ آپا نے انہیں بھرپور یقین دلایا۔

''مگر آپ نے پہلے تو ایسے کسی پروگرام کا ذکر بھی نہیں کیا۔'' فرح بیگم کی فکر کم نہیں ہو رہی تھی۔

''ہاں تو سب ایکا ایکی ہوا ہے۔ یہ تو ہماری عندلیب بڑی بھاگوان ہے کہ دیور جی کے مقدر کھل گئے۔ اسے اتنی اچھی جاب ملے گی یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہمارے میاں نے بابر کے ذریعے ایک کمپنی میں کچھ رقم انویسٹ کی تھی خدا کے فضل سے وہاں برکت ہو گئی۔ اب ہم اسی لیے وہاں شفٹ کر رہے ہیں کہ کاروبار کو سنبھال سکیں۔'' عائشہ آپا نے طے شدہ پروگرام ان کے سامنے بیان کیا تو فرح بیگم ٹھنڈی سانس بھرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں۔

عائشہ آپا بحرین کوچ کر گئیں اور پیچھے عندلیب



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سناٹوں کی زد میں گم صم سی ہو گئی۔ ہر طرف اداسی بکھر گئی۔

اس کے بعد بابر سے اس کی صرف ایک ہی بار فون پر بات ہو پائی تھی۔ وہ جب بھی اس کا نمبر ملاتی وہ ریسیو ہی نہیں کرتا تھا۔ عائشہ آپا نے بھی وہاں پہنچنے کے بعد صرف ایک بار اپنی خیر خیریت کی اطلاع دی تھی اس کے بعد جیسے دوسری طرف بڑی تکلیف دہ سی خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

دن دبے پاؤں سرکتے گئے ساتھ ہی عندلیب کا دم بھی خشک ہوتا رہا۔ اس طرح اس سے پہلے بابر نے کبھی اتنی طویل خاموشی اختیار نہیں کی تھی۔ عندلیب کی پلکوں پر ہر وقت نمی سی رہنے لگی۔

ایک روز اچانک ہی اس کا فون چلا آیا۔ عندلیب کے مرجھائے زدہ چہرے کا قرار لوٹ آیا۔ سارے دل میں اندیشے چھو ہو گئے لیکن اسے واضح طور پر بابر کے نرالے انداز میں کمی نظر آئی۔ اس کے لہجے میں گرم جوشی نہیں تھی بلکہ وہ کافی بیزار سا لگ رہا تھا جیسے زبردستی کا ایک فرض ادا کر رہا ہو۔

''عائشہ بھابی کا گھر سیٹ کروا رہا ہوں ٹائم ہی اتنا کم ملتا ہے مجھے۔ میری ڈیوٹی بھی ڈبل شفٹ کی ہے۔ سر اٹھانے کی فرصت ہی نہیں۔''

وہ نہ جانے اپنی کیا کیا مصروفیات بتاتا رہا۔ عندلیب کا حال جاننے کی تو اس نے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ وہ بے طرح پریشان ہو گئی۔

اگلے کچھ ماہ میں اچانک ہی ساجدہ پھپھو کی آمد ہو گئی۔ اس بار انہوں نے بڑی جلدی پاکستان کا چکر لگا لیا تھا۔ ان کی آمد پر وقتی طور پر عندلیب نے اپنی پریشانی کو پس پشت ڈال دیا اور خود کو مصروفیتوں میں گم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

ساجدہ پھپھو کی گھاگ نظروں نے اس کی اڑی رنگت اور زرد چہرے کا فوراً ہی نوٹس لے لیا۔ اس کی آنکھوں کے ساگر میں امڈتی اداسی ان سے چھپی نہ رہی۔ دراصل اسے ابھی خود کو چھپا لینے کا فن نہیں آتا تھا ورنہ اکثر لوگ اپنی شخصیت کے برعکس خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کا غلاف چڑھا کر دوسروں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنے اندر کے خیالات اور دلوں کے کینے کو کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے لیکن عندلیب کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔

''تم کیوں اتنی دبلی ہو رہی ہو۔ کیا ہوا ہے کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟'' انہوں نے تشویش سے اسے دیکھا۔ فرح بیگم نے آنکھ کے مخصوص اشارے سے اسے کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ساجدہ آپا پر اندر کے معاملات کھلیں۔

''بالکل فٹ فاٹ ہوں پھپھو...... دراصل آج کل کے امتحان ہو رہے ہیں تو اس کے بدلے کا کام بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے بات بنائی۔

''فرح...... اس کا خیال کرو بھئی...... دیکھو تو کیسی کمزور ہو رہی ہے یہ۔ شادی وادی کا کیا کہا ان لوگوں نے؟'' انہوں نے جاننے کی سعی کی۔

''نہیں...... ابھی تو ان لوگوں کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' فرح بیگم نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو سنا ہے کہ عائشہ وغیرہ کی ساری فیملی بحرین شفٹ ہو گئی۔'' ان کی اطلاعات مستند تھیں۔ فرح بیگم چونکی ہو گئیں۔ انہیں تو ساری معلومات تھیں۔ اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ نئے بہانے سوچتیں وہ پھر بولنا شروع ہو گئیں۔

''تم بیٹی والی ہو...... ذرا سوچ سمجھ کر ہوشیاری سے سب خبر رکھو۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ عائشہ یہاں سے کیوں چلی گئی؟'' انہوں نے باقاعدہ سوال جواب شروع کر دیے۔ فرح بیگم نے انہیں سب کچھ بتانے سے خود کو قاصر پایا۔ ان کے سامنے وہ کوئی بھی بات نہ بنا پا رہی تھیں کہ وہ سب جانتی تھیں۔

''اس کا میاں یہاں قلاش ہو گیا تھا اب وہ وہاں بحرین جا کر بابر کے اوپر پڑ گئی...... سارا خرچا اور ذمے داریاں بابر کے کاندھوں پر ہیں، عندلیب تو وہاں جا کر پس جائے گی۔ یہ ساری عائشہ کی چالاکی ہے، دیور پر پورا قبضہ کر رکھا ہے اور خوب اس کی کمائی دونوں ہاتھوں اڑائی جا رہی ہے۔ جب ہی تو ابھی تک شادی کا نام نہیں لے رہی وہ۔'' ان کے بے رحم انکشافات نے فرح بیگم اور عندلیب کو بے حد پریشان کر دیا۔

''وہاں جا کر سوائے خواری اور عائشہ کی غلامی کے وہ بچی کچھ بھی نہیں کرے گی۔ اسے بابر پر پورا کنٹرول ہے ہر وقت بھابی کی سیوا میں لگا رہتا ہے وہ اس کے ایک اشارے پر کام کرتا ہے۔'' ساجدہ پھپھو زمانے کو دیکھی ہوئی تجربے کار اور ہوشیار عورت تھیں۔ ان کی باتوں نے فرح بیگم کا دل بہت برا کیا اور عندلیب کے نازک دل کو بھی بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس نے بابر کو دل و جان سے قبول کیا تھا مگر یہ بات اسے قطعاً برداشت نہیں تھی کہ بابر اس کا شوہر ہوتے ہوئے اپنی بھابی کو سر چڑھا کر بٹھائے اور ان کے مقابلے میں اسے کم اہمیت دے۔ اسے یہ بات تو پہلے بھی معلوم تھی کہ بابر اپنی بھابی عائشہ کی ہر بات مانتا ہے لیکن یہ بات ابھی معلوم ہوئی کہ بابر کی پوری کمائی پر بھی ان کا تصرف ہے نہ جانے اسے یہ اندازہ تھا کہ بابر کسی کٹھ پتلی کی طرح عائشہ آپا کی انگلیوں پر ناچتا ہے۔ اس کے اندر متعدد سوچوں نے مختلف انداز میں ابھرنا شروع کر دیا۔ اس نے بابر سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس کی اتنی کوشش کے باوجود بھی دوسری طرف وہی بے گانگی اور سرد مہری چھائی رہی۔ اس کی کسی بھی کال کا اس نے جواب





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں دیا وہ اور بھی زیادہ شکستہ اور نڈھال ہوگئی۔ اندیشوں کو مزید تقویت ملنے لگی اور جب وہ تھکنے لگی تو ایک روز بالآخر اس کی کال ریسیو کرلی گئی۔ اس کی ہیلو کے جواب میں عائشہ آپا کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری تو وہ بری طرح چونک گئی۔

''ہائے عندلیب کیسی ہو تم... کتنے روز ہوگئے بات کیے ہوئے۔ دراصل میں یہاں آکر اتنی بیمار پڑ گئی کہ تم دیکھو گی نا تو پہچانو گی نہیں۔ برسوں کی مریض لگ رہی ہوں بالکل... ڈاکٹرز تو کہہ رہے تھے کہ... ''وہ اپنی رام کہانی لے کر شروع ہوگئیں لیکن عندلیب کو تو کچھ بھی صحیح سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے تو بس یہ نظر آرہا تھا کہ جس نمبر پر اس نے کال ملائی تھی وہ بابر کا ذاتی موبائل نمبر تھا اور عائشہ آپا کا بابر کی ذاتی چیزوں پر بھی پورا اختیار تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

''بابر تو ابھی ہے نہیں... کسی کام سے گھر سے باہر گیا ہوا ہے۔ دراصل میری بیماری نے سارا گھر الٹا کر کے رکھ دیا۔ بابر بے چارے کا موبائل بھی اتنے روز سے الماری کے سامان میں گم ہوگیا تھا۔ آج ہی تو ملا ہے... بابر تو ویسے بھی بہت بے پروا ہے ان معاملوں میں... اس کی ایک ایک چیز کو سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے مجھے... مگر اس بیماری نے میرے ساتھ ساتھ سب ہی کو ہلا ڈالا۔ بابر تو سب سے زیادہ پریشان ہوا... ''وہ اپنی رو میں کہے جارہی تھیں اور عندلیب کے ذہن میں ان کی 'بابر، بابر' کی تکرار ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگ رہی تھی۔ اسے نہ ان کی بیماری سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ان کا حال احوال جاننے کا تجسس رہا تھا سب ہی کچھ تو اس پر کھل گیا تھا۔ اس نے ان کی کسی بھی بات پر توجہ دیے بغیر ٹھک سے فون بند کردیا۔ اس کے اندر کی سوچوں کی تپش نے اسے جھلسا کر رکھ دیا۔ رات گئے بابر نے اس کے موبائل پر کال کی مگر اس کا ذہن اتنا منتشر ہو چکا تھا کہ اسے بابر سے بات کرنا گوارا نہ ہوا۔ ویسے بھی اس کے دل میں جو کانٹا چبھا تھا اب اس کا نکلنا آسان نہیں تھا۔ ایک دم ہی اس کا بابر سے جی اچاٹ ہوا۔ اسے بابر کے ساتھ رہ کر خود کو ساری عمر کا روگ تھوڑی لگانا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہی بھابی کا کلمہ پڑھتا رہتا اور اس کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہ ہوتی۔ ساجدہ پھپھو کی باتوں میں وزن تھا۔ اور اب خود اسے بھی سب باتوں کا اندازہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

اگلے ہی روز عائشہ آپا کا فون چلا آیا۔ اگلے چھ ماہ تک وہ عندلیب اور بابر کی شادی کا ارادہ کررہی تھیں مگر جب عندلیب نے سنا تو اس نے اتنے روز سے اندر پکتے ہوئے لاوے کو باہر نکال دیا اور بابر سے شادی سے صاف انکار کردیا۔ اپنے جذبات کو پرے دھکیل کر اور اپنے خوابوں کو بے دردی سے روندتے ہوئے اس نے بڑی حقیقت پسندی سے یہ فیصلہ کیا تھا۔

''آپ تم کیسی بچکانہ بات کررہی ہو۔ بابر سے تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ یہ رشتے کچے دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں پیار محبت، تعاون، وفا اور قربانیوں سے پکا اور مضبوط کیا جاتا ہے۔ بابر بھائی خود بھی تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ رہیں عائشہ آپا تو میرا خیال ہے کہ تم انہیں اتنی اہمیت نہ دو۔ جب وہاں جاؤ گی، رہو گی تو خود بخود ہی آپس کے تعلقات میں حدیں قائم ہو جائیں گی۔'' نایاب نے اسے فیصلہ بدلنے پر بہت مجبور کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

وہ اپنی ساری عمر صرف مفروضوں کے تحت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بابر نے مکمل طور پر اپنے اختیارات کی ڈور عائشہ آپا کے ہاتھوں میں تھما رکھی تھی اور یہ پتلی تماشا وہ برداشت نہیں کرسکی تھی۔

اس کے انکار پر فرح بیگم بھی بہت ناراض ہوئیں۔ عائشہ آپا نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ انہوں نے اس سے بات کرنی چاہی مگر اس نے ان کی بات سننی گوارا نہیں کی۔ وہ ان سے اتنی بدگمان ہوچکی تھی کہ وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھیں اور بابر کی ہزار منتوں سماجتوں کے باوجود بھی اس کا دل نہ پگھلا۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس کی یادوں میں بابر کے سنگ گزری بڑی خوشگوار یادیں اور باتیں بھی تھیں۔ اس کے بہت سے ارمان اور خواب کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ فوری طور پر پاکستان آ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اپنے کچھ مسائل تھے یوں لمحہ بھر میں ہی بات ختم ہوگئی۔

اور اب جبکہ وہ عرفان احمد کے نکاح میں آچکی تھی اور کار چوبی آنچل کا گھونگٹ لیے ہوئے تھی تو اسے بے ساختہ ہی بابر کی یاد چلی آئی لیکن اسی وقت اس نے بڑی سختی سے خود کو یہ باور کرادیا کہ اب وہ عرفان احمد کی زندگی میں شامل ہو کر اس کی بن گئی ہے۔ بابر کی یاد کی مدھم سی پرچھائیں کو اس نے اسی وقت مٹا ڈالا تھا۔

☆☆☆

شادی کے فوراً بعد وہ پنی مون پر چلی گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر وہ تحائف کے انبار سے لدی فرح بیگم کے پاس پہنچی تو نئی خوشیوں اور نئی رُتوں کا عکس اس کے روپ کو خیرہ کررہا تھا۔ فرح بیگم نے محبت سے اسے گلے لگالیا مگر اس روز فرح بیگم کچھ افسردہ سی تھیں یا پھر بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا کہ اس کی نظر ٹیبل پر رکھے خوب صورت سے شادی کارڈ پر پڑ گئی تھی۔

''ارے، یہ کس کی شادی کا کارڈ ہے؟'' اس نے دلچسپی سے کارڈ اٹھالیا۔

''ہاں، یہ بابر کی شادی کا کارڈ ہے۔'' فرح بیگم نے سابقہ افسردگی سے جواب دیا۔

''اوہ..... تو یہ وجہ تھی امی کی اداسی کی۔'' اس نے فوراً سمجھ لیا۔

بابر کی شادی کی خبر سن کر جھٹکا تو اسے بھی لگا تھا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا کیونکہ بابر کو اس نے خود ہی رد کیا تھا اور اب عرفان احمد کی سنگت میں رہ کر اسے کوئی ملال نہ رہا تھا اور ویسے بھی ایک نہ ایک دن بابر کی شادی بھی ہونی ہی تھی۔ اس نے مگن سے انداز میں کارڈ کا مضمون پڑھنا شروع کیا مگر اگلے ہی پل کارڈ پر لکھے جلی حروف میں چمکتے ہوئے ناموں کو پڑھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور آنکھوں کے ستارے ماند پڑ گئے۔ اس نے بار بار غور سے کارڈ کو پڑھا مگر وہی لفظ لکھے نظر آرہے تھے جنہیں وہ اپنی نظر کا دھوکا سمجھ کر خود کو تسلی دے رہی تھی۔

دراصل بابر کی شادی جس لڑکی سے ہورہی تھی وہ ساجدہ پھپھو کی نواسی تھی جو ایک عرصے سے بحرین میں ہی رہ رہی تھی۔ ساری بات اس کی سمجھ میں اب آئی تھی۔ اس کے چہرے پر گئے دنوں کی راکھ سی اڑی اور چندن سی رنگت کو دھندلا دیا۔

ابھی ابھی اسی وقت اسے یہ محسوس ہوا کہ اپنی غلط اور نادانی میں وہ اپنی عمر کی سب سے قیمتی اور انمول شے گنوا بیٹھی ہے۔ بابر اس کے لیے ساری عمر کا روگ بن کر رہ گیا تھا لیکن اب وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ ایک بے کراں سناٹا اس کی روح میں پھیلتا چلا گیا جہاں دور دور تک کوئی آواز نہ تھی سوائے ہواؤں کے درد بھرے نوحے کے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حسین و دلکش الفاظ بیان کا مرقع ایک خوب صورت ناول

# خوشبو کا سفر

عالیہ بخاری

قسط 35

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں !
کارِ جہاں دراز ہے ، اب میرا انتظار کر

اور یہ کار جہاں دراز ہی نہیں بمہ جہت بھی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ تہ در تہ انسان پر کھلتا ہے اور وہ اس کے بدلتے رنگوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے میں اس طرح منہمک ہوتا ہے کہ کبھی کبھی تو خود اپنا آپ بھی بھلا بیٹھتا ہے۔ خوشبو کا سفر بھی زندگی کے ان ہی بدلتے رنگوں کی کہانی ہے جس میں سادگی اور سچائی کی نرماہٹ بھی گھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ریا کاری اور خود غرضی کی تلخی بھی کڑواہٹ کا احساس دلاتی ہے۔ ایک دہرا معیار رکھنے والے معاشرے میں حساس اور سادہ دل لوگ جس آسانی سے کبھی تقدیر کے نام پر اور کبھی اپنے جیسوں کی تدبیر کے باعث پٹ جاتے ہیں وہ زندگی کی بھی توہین ہے اور انسانیت کی بھی۔ اس اندھی گلی کی دوڑ کا اختتام کہاں جاکر ہوتا ہے یہ سادہ سی کہانی اپنی جستجو کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیٹ ملازم لڑکے نے کھولا تھا۔ نرمی سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اندر لاؤنج میں آئی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔

''امی!'' وہ آواز دیتے ہوئے اُن کے کمرے تک آئی۔ ادھ کھلے دروازے سے وہ سامنے ہی بیڈ پر لیٹی نظر آ گئی تھیں اور اتنی زرد اور تھکی ہوئی جیسی پہلے کبھی نہیں۔

''کیا ہو گیا ایسا جو آپ نے یہ حالت بنالی ہے؟'' وہ اس کی شکل دیکھتے ہی جس طرح رونا شروع ہوئی تھیں وہ زارا کے ہاتھ پاؤں پھلا رہا تھا۔

''مستقل بیمار رہتی ہیں، ذرا طبیعت سنبھلتی ہے پھر کوئی نئی ٹینشن، کیوں اپنی دشمن بن گئی ہیں آپ؟'' اُن کا ہاتھ تھام کر دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے، وہ فکر مندی انہیں دیکھے گئی۔

''میری اولاد، میری دشمن بن چکی ہے زارا...... زین نے اپنی خوشی کی خاطر ہم دونوں کو بے سہارا کر دیا ہے...... وہ اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے، بے شک ہم اس سے الگ ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ وہ ہم سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا ساری زندگی۔'' کمرے کی خاموشی میں ان کی کانپتی آواز نے سرگوشی کی سی کیفیت پیدا کی تھی اور ان کی آواز میں بڑا ہی دل توڑتا سا احساس جھلکتا تھا۔ زارا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے خود کو کمپوز رکھنا چاہا۔

''ابو کی ضد نے بھی معاملے کو بگاڑا ہے امی، سمجھایا بھی تھا انہیں کہ اسے انتہا تک مت جانے دیں مگر وہ کب سنتے ہیں۔''

''اور ان دونوں کی ضد نے مجھے ختم کر دیا ہے، کس طرف جاؤں، کیا کروں...... تمہارے ابو کہتے ہیں کہ اگر چاہوں تو میں بھی زین کے ساتھ چلی جاؤں، انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن پھر میں واپس اس گھر میں نہیں آ سکتی...... اس عمر میں مجھے رسوا کرنے پر تلے ہیں، ساری زندگی گزار کر یہ صلہ۔'' ان کی دبی دبی سی سسکی میں ایک عمر کا رونا تھا۔ عورت کا وہی روایتی سا گھسا پٹا سفر، گول دائرے میں گھومتا ہوا اور کبھی جو ذرا رک کر دیکھو تو وہیں کے وہیں۔ درد کے عنوان الگ مگر ٹیس کی اٹھتی ہوئی تکلیف بالکل ایک سی، یہاں صرف کردار بدلتے ہیں، محض ایک لمحے کے لیے تو زارا کو ایسا لگا جیسے سامنے امی نہیں وہ خود بیٹھی اپنے کسی غم کو رو رہی ہے اور سامنے خود اس کی اپنی بیٹی۔ پیچھے دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔

''السلام علیکم!'' کوئی تھا جو ٹھیک سر پر ہی آ کھڑا ہوا تھا۔ بے ساختہ ہی اس نے مڑ کر دیکھا۔

''آ جاؤ رضا!'' اس نے امی کو کہتے ہوئے سنا۔ ایک دبی دبی سی سانس زارا کے ہونٹوں سے آزاد ہوئی۔ ایک اور گم گشتہ کہانی۔ بہت عرصے بعد دیکھا تھا سو پہچاننے میں وقت کا سامنا ہوا تھا۔ رضا پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا تھا جھکے ہوئے کندھے، ماتھے سے اڑے ہوئے بال اور زردی مائل رنگت۔ ''اور کسی زمانے میں میں اس کے نام پر ہی شرما جاتی تھی اور اور اس نام نہاد منگنی کے ٹوٹ جانے پر رو رو کر کیا حال کر ڈالا تھا میں اس ٹھیک ٹھاک شرمندہ کرنے والی صورت حال پر اسے ایک دم ہی بڑے زور کی ہنسی آنی شروع ہوئی، رضا نے اسے منہ نیچے کر کے مسکراتے ہوئے بڑی توجہ سے دیکھا تھا۔

''کیسی ہو زارا؟''



''جی، میں بالکل ٹھیک۔''

''بہت دنوں بعد دیکھا تمہیں۔''

''میں نے بھی۔''

''بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے حسنہ بیگم نے چونک کر اس بدلے ہوئے رنگ کو دیکھا۔ رضا بڑی محویت سے زارا کے چہرے کو تک رہا تھا۔ زین اور اس سے ملا دکھ ذرا دیر کے لیے دل سے ایک طرف ہوئے۔

''زارا، ذرا جا کر چائے بنا لو بھائی کے لیے۔'' ان کا لہجہ انتہائی خشک تھا۔ رضا کا چہرہ اتر سا گیا۔

زارا لاؤنج میں آ کر دیر تک ہنستی چلی گئی۔ اس پریشانی کے عالم میں بھی امی کی سینس آف ہیومر غضب کی تھی اس نے پورے دل سے اعتراف کیا۔ گھر میں اس وقت اور کوئی بھی نہیں تھا۔ چائے بناتے سارا وقت وہ اسی اصل مسئلے میں الجھی رہی، جس کی وجہ سے اسے آج نکل کر خاص طور پر آنا پڑا تھا۔ زین، تہمینہ سے شادی کرنے جا رہا تھا۔ وہ مسئلہ جواب تک ہاں، نہ کے بیچوں بیچ لٹکا تھا بلکہ پچھلے دنوں تو قریب الختم محسوس ہوتا تھا، تر و تازہ ہو کر گھر کے امن و سکون کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے درپے تھا۔ امی کی فکر اور دکھ بے جا نہیں تھا۔ زین کے گھر چھوڑنے کا مطلب اتنا ہولناک تھا کہ تصور کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا...... پھر بھی اس نے چشم تصور میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو گھر کے تنہا در و دیوار میں قید دیکھا...... کوئی الگ کہانی، انوکھا قصہ بھی نہیں۔ معاشرے میں ماں باپ کے ضعیف ہاتھوں کو جھٹک کر اپنے لیے خوشیوں کی فصل اگاتے جوان ہاتھوں کی کون سی کمی پڑی ہے، اس نے زین کے رویے کو بھی justify کرنا چاہا مگر کچھ بھی دل پر بڑھتے ہوئے بوجھ کو کم کرنے میں مددگار نہ تھا۔ چائے کا پانی پک چکا تھا۔

وہ جب تک چائے کپوں میں نکال کر واپس کمرے میں آئی رضا اور حسنہ بیگم کے درمیان بات چیت ختم بھی ہو چکی تھی۔ زارا نے دونوں کے درمیان چھائی بوجھل سی خاموشی کو اندر قدم رکھتے ہی محسوس کیا تھا۔ ماحول میں بڑا واضح کھنچاؤ تھا اور وجہ نامعلوم؟ نہ امی اتنی بد اخلاق تھیں اور نہ ہی انہیں رضا سے اس بات کا گلہ تھا کہ وہ زارا کو عین وقت پر کیوں ٹھکرا چکا تھا بلکہ وہ تو الٹی اس کی شکر گزار تھیں کہ وہ نادانستہ ہی سہی ان کی دلی خواہش پوری ہونے کا سبب بنا تھا۔ نگاہیں جھکائے جھکائے اس نے ایک چھوٹا سا تجزیہ کیا۔ رضا کی پُرشوق نگاہ بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھی۔

''کیا آج کل تم یہیں رہ رہی ہو؟'' وہ بڑی امید سے پوچھنے لگا۔

''یہاں کیوں رہے گی، خدا نہ کرے۔'' حسنہ بیگم نے بڑی تیزی سے رضا کی بات کاٹی تھی۔

''اتنی تُخی۔'' زارا نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہتی ہے، وہ تو میں نے آج بلایا تھا تو ابھی ہارون چھوڑ کر گیا ہے، شام کو آئے گا تو ساتھ چلی جائے گی۔'' انہوں نے تفصیل سے جواب دینا ضروری سمجھا تھا۔ رضا تھوڑی دیر کے لیے چپ سا ہو گیا۔ زارا کو اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر رحم سا آ گیا۔

''تایا ابا وغیرہ کیسے ہیں رضا بھائی؟'' وہ یونہی بات برائے بات پوچھنے لگی۔ ددھیالی رشتے داروں سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب بھی کبھی ہی ملاقات ہوتی تھی مگر اڑتی اڑتی خبریں ملتی ہی رہتی تھیں۔ رضا نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔

"تمہیں تو پتا نہیں ہوگا کہ میں بھی اب یہیں آ گیا ہوں، اسلام آباد چھوڑ کر۔"

"جی سنا تھا۔" اگرچہ اسے حسنہ بیگم نے رضا اور اس کی بیوی کی طلاق کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر خاندان میں خبر اڑ چکی تھی۔

"شاید مجھے اس کی طلاق کا افسوس کرنا چاہیے۔" زارا کو خیال آیا تھا کہ وہ خود ہی بتانے لگا۔

"شادی بھی میری ختم ہوگئی، بڑا ہی غلط فیصلہ کیا تھا میں نے تو اس کی سزا بھگتنی پڑی، ساری عمر ملال رہے گا کہ..."

"رضا۔" ایک بار پھر حسنہ بیگم کی مداخلت ضروری ہوئی تھی۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم برا مت ماننا لیکن میں اب آرام کروں گی، تم پھر کسی وقت آنا، جب تمہارے چچا بھی گھر پر ہوں۔" بڑا ہی بے تاثر سا لہجہ تھا اور اب تک بھی انہوں نے صرف اس کی چائے کے ختم ہونے کا ہی انتظار کیا تھا۔

"جی۔" وہ مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زارا اسے رخصت کرنے صرف لاؤنج تک آئی تھی کہ پیچھے سے اسے اُن کی آواز سنائی دی۔

"زارا، صابر سے کہو، وہ گیٹ بند کر لے گا۔" وہ خود بخود رک سی گئی مگر رضا شاید اتنا کند ذہن تھا کہ بین السطور مفہوم کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

"چچی کچھ زیادہ پریشان ہیں، میں جب آیا تھا تو شاید رو بھی رہی تھیں، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بس ایسے ہی۔" وہ پھر بھی بغور زارا کی شکل دیکھے گیا۔

"کوئی تمہارا مسئلہ ہے، بتانا نہیں چاہ رہی ہو لیکن ہم کوئی غیر تو نہیں ہیں زارا سگے تایا چچا کی اولاد۔" اتنی دیر میں پہلی بار وہ زارا کے لیے بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہوا۔

"میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے رضا بھائی، میں بہت خوش ہوں۔ ہارون بے حد محبت کرتے ہیں مجھ سے، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ تھوڑی اپ سیٹ ہو رہی ہیں اور بس۔"

"ہارون بے حد خوش قسمت ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔" رضا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کا چھپا ہوا چہرہ دیکھا۔

"خدا حافظ۔" زارا نے محض اتنا کہا اور واپس کمرے میں چلی آئی۔

"کچھ کہہ رہا تھا تم سے؟"

"نہیں امی، کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔" وہ کہتے ہوئے پھر سے ان کے پاس بیڈ پر بیٹھی۔ "لائیں، میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔" حسنہ بیگم بنا کچھ کہے لیٹ گئیں۔

شادی سے پہلے وہ انہیں گھٹنوں دبایا کرتی تھی منع کرنے کے باوجود بھی، کتنی عادی ہو چکی تھیں وہ اس کی خدمت گزاری کی، کبھی اکیلے پن کا احساس تک نہیں ہونے دیتی تھیں اور اس کی ہارون سے شادی، ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ٹھہری تھی۔ ہر طرح سے بڑی ہی بابرکت۔

"تمہارے ابو کو بالکل بھی پسند نہیں ہے رضا کا یہاں آنا لیکن پتا نہیں کیوں آئے دن چلا آتا ہے، میرا تو



شکل تک دیکھنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔" انہیں آج اس کی زارا پر جمی نگاہیں بہت کھلی تھیں۔

"اور تم تو اسے بالکل منہ مت لگانا، اب اگر سامنا ہو اور نہ ہی ہارون سے کچھ اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہے، سمجھیں!"

"ہارون ایسے نہیں ہیں امی، انہیں نہیں فرق پڑتا۔"

"ہر مرد کو پڑتا ہے اور بیوی کے معاملے میں تو کوئی بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ جو تم سے کہتی ہوں اسے سن لیا کرو۔" وہ خفا ہونے لگیں۔

"اچھا غصہ نہ کریں، پہلے ہی کیا کم ٹینشن لے رکھی ہے آپ نے۔ ابو کب تک آئیں گے، مرزا چچا کے گھر سے؟"

"جب دل ہوگا آ جائیں گے۔ انہوں نے تو ایک گوشۂ عافیت ڈھونڈ ہی رکھا ہے۔ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر فرس بول بھی لیتے ہیں۔ آئیں گے تو کھا پی کر سو جائیں گے۔ اچھی گزر رہی ہے باپ، بیٹے دونوں کی۔"

"امی۔"

"ہوں۔"

"اگر ہم لوگ اس لڑکی کو قبول کر ہی لیں تو کیا حرج ہے، زین کی پسند ہے، کیا خبر اچھی ہی ہو۔ اس طرح بغیر دیکھے کسی کو رد کر دینا ٹھیک نہیں ہے ایک بار مل کر تو دیکھیں۔" بہت نرمی اور طریقے سے جو بات اس نے کہنی چاہی تھی، وہ انہیں ذرا سی بھی گوارا نہیں تھی۔

"مفروضے قائم مت کرو زارا۔ اپنے باپ کو اچھی طرح جانتی ہو تم۔ بات اب صرف اس لڑکی کے اچھے برے ہونے کی نہیں رہی ہے، زین اگر دنیا کی سب سے بہترین لڑکی بھی ان کے سامنے لا کر کھڑی کر دے گا تو وہ اسے بھی قبول کرنے والے نہیں ہیں، جو بات اُن کے منہ سے نکل گئی سو نکل گئی، زین کو تو یہاں سے جانا ہی ہوگا اور وہ جا ہی تو رہا ہے۔" زارا نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔

"اور رہے گا کہاں، کھائے پیے گا کہاں سے، اچھی تنخواہ ہے مگر گھر افورڈ کرنا آسان ہے کیا اور پھر گھر کا ایڈوانس اس کے اپنے اکاؤنٹ میں تو لاکھ دو لاکھ بھی نہیں ہوں گے، سب کچھ ابا ہی کا ہے۔"

"اس لڑکی کے پاس ہوگا مال دولت، جب ہی تو بے فکر ہے، وہی خرچہ کر دے گی سارا۔"

"کب تک کر رہا ہے شادی؟" اسے بڑا عجیب سا لگا تھا اپنا سوال اور ظالمانہ بھی۔

"بہت جلد، مجھ سے تو صرف اتنا ہی کہا ہے، آگے پوچھنے کی ہمت تھی نہ ہی تمہارے ابو نے مہلت دی، وہ ہنگامہ مچا رات کہ خدا کی پناہ۔" ان کی آواز میں نمی اتری۔

"صبح ناشتا بھی نہیں کر کے گیا ہے، پتا نہیں کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔" زارا نے بے ساختہ ہی ان سے نگاہ چرائی۔ پتا ہی نہیں چلا، کب زین سب سے ہاتھ چھڑا کر اتنی دور جا کھڑا ہوا کہ آواز دینے پر بھی مڑ کر دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ آج یہاں آ کر وہ واقعی دکھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

آج آفس میں دن کا آغاز اچھا نہیں ہوا تھا۔ سو سب ہی کو جلد ہی اس کے خراب موڈ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ روز کے کتنے کام کتنے اپائنمنٹ لیکن وہ کسی کے لیے بھی سیدھے منہ نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سمیہ کو ہارون کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیمبر کا رخ کرتے ہوئے دیکھا۔

''سمیعہ عبدالعزیز! سر نے منع کیا ہے، کسی کو بھی اندر آنے سے۔'' ہارون کا پرسنل اسسٹنٹ مستعدی سے آگے بڑھا۔

''کیا؟'' سمیعہ نے نے اس طرح اسے دیکھا جیسے وہ دماغ کی خرابی میں مبتلا ہے مگر وہ خجالت سے مسکرا دیا۔

''ہارون صاحب نے منع کیا تھا کہ کوئی نہ آئے، جب تک وہ اجازت نہ دیں۔'' آفس میں سمیعہ کے بڑھے ہوئے اثر سے سب ہی اس سے خائف رہتے تھے مگر اس وقت مجبوری تھی۔

''وہ آرڈر دوسروں کے لیے ہے سمجھے!'' مختصر سا جواب دے کر اس نے پورے استحقاق کے ساتھ دروازہ کھولا اور اندر چلی آئی۔ ہارون نے چونک کر سمیعہ کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا، برا لگا میرا آنا؟''

''نہیں، برا کیوں لگے گا، بیٹھو۔'' وہ سامنے کھلی فائل پر مزید دھیان لگاتے ہوئے نارمل سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

سمیعہ کو مایوسی سی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رضا اور زارا کی ممکنہ ملاقات کے بارے میں سوچ کر خود کو ہلکان کیے ہوئے ہوگا مگر ایسا نہیں تھا..... باہر جیسا بھی تاثر سہی، اپنے چیمبر میں وہ بہر حال یونہی خالی نہیں بیٹھا تھا، کام میں مصروف تھا۔

''کچھ کام تھا مجھ سے؟''

''ہاں، وہ..... باہر سب کہہ رہے تھے کہ تم آج کسی سے بھی نہیں مل رہے ہو، میں پریشان ہوگئی تھی سن کر۔''

''ایسی کوئی بات نہیں، کافی کام جمع تھا، میں وہ نمٹانا چاہ رہا تھا، آج مجھے آفس سے جلدی اٹھنا ہے۔''

سمیعہ نے نوٹ کیا کہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہا ہے..... اور لوگ اب اس کی طرف دیکھنے سے عموماً گریز ہی کرنے لگے ہیں۔ تھی تو ایک بہت تلخ حقیقت مگر پچھلے کچھ عرصے میں اسے بارہا یہ احساس ہوا تھا، محمود اختر نے پھر کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہارون، ساری توجہ، ساری اہمیت دینے کے باوجود ایک فاصلہ برقرار رکھنے پر بضد، عارف سامنا کرنے کو ہی تیار نہیں اور تو اور وہ سامنے والی سڑک والا نوفل جو رشتے کے لیے مار باپ کو روزانہ بھیجا کرتا تھا اور خود سالوں اس کے کالج کے راستے پر آنکھیں بچھائے کھڑا رہا، اب اپنی نئی نویلی دلہن کو اسکوٹر پر بٹھائے زن سے سامنے سے گزرنے لگا تھا کیا وہ اپنی دل کشی کھونے لگی ہے یا پھر لوگوں کی نظر ہی کمزور ہو چکی ہے جو بھی تھا مگر وہ اپنی اس اکلوتی طاقت کو کھونے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''تمہیں کوئی ضروری کام ہے کیا آج ہارون؟''

''زارا کو شام میں لینا ہے نا تو کچھ دیر پہلے جاؤں گا تاکہ کچھ دیر پھوپی، پھوپا کے ساتھ بیٹھ بھی سکوں۔'' وہ بہت نارمل سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''کیا؟''

''کیوں، حیرت کی کیا بات ہے؟''

''نہیں حیرت کی تو نہیں مگر.....!'' وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں تجسس سا بڑھاتی تھی۔



ہارون چند لمحے اس کی طرف دیکھے گیا۔ ''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''چھوڑو، تمہیں برا لگ جائے گا لیکن میرا نہیں خیال کہ تمہیں آج وہاں جانا چاہیے، خاص طور پر اس لیے بھی آج وہاں رضا بھی آیا ہوا ہے، بے چاری زارا خوامخواہ ہی.....''

''سمیعہ پلیز!'' ہارون کی آواز قدرے اونچی ہوئی اور لہجے میں بڑی اجنبی سی سختی اتری۔ ''رضا، زارا کا تایا زاد بھائی ہے اور اگر وہ وہاں آیا ہے تو یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم صبح سے کئی بار جتا چکی ہو اور مجھے ہر بار برا لگا ہے۔ پلیز زارا کے بارے میں اس طرح بات مت کرو۔'' سمیعہ کے لب حیرت سے کھلے اور پھر کچھ کہے بغیر ہی بند ہوئے۔ بڑا ہی توہین آمیز سا احساس تھا جس سے اس وقت وہ دوچار ہوئی تھی۔

''سوری، اگر تمہیں برا لگا تو۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے نکل گئی۔ ہارون نے اسے آواز دے کر روکنا بھی نہیں چاہا سو یونہی خاموش نگاہوں سے بند دروازے کو دیکھے گیا۔ زارا اور اپنے بیچ بڑھتے ہوئے فاصلے کو اور بھی طول دینا عقل مندی نہیں تھی۔

واپسی پر سارا وقت سمیعہ نے زارا اور رضا کے پچھلے تعلق کے حوالے سے بہت کچھ کہہ لیا تھا وہ اندر ہی اندر جتنا بھی اپ سیٹ سہی مگر دل اندر سے کہیں شدت سے ہر بات کی نفی کرتا تھا۔ غلط فہمیاں، ٹوٹتی ہوئی امیدیں، دبی دبی سی سرد جنگ، سب بجا پر بے وفائی کی تہمت! اسے لگا تھا جیسے وہ پھر زارا کا نام لینے کے بھی قابل نہیں رہ جائے گا۔

فون کی بیل ہو رہی تھی۔ دوسری طرف دادی تھیں۔ ہارون اُن کی آواز سنتے ہی چونکا تھا۔

''ذرا جلدی گھر آنا، عارف کی اماں آرہی ہیں اور مجھ سے وہ عورت اکیلی سنبھالی نہیں جائے گی سمجھے!'' بنا کسی تمہید کے انہوں نے ہدایت جاری کی تھی۔

''ٹھیک ہے دادی میں زارا کو لیتا ہوا آجاتا ہوں۔'' اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پروگرام سیٹ کرنا چاہا مگر انہوں نے فوراً ہی منع کر دیا۔

''حسنہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، زارا رات میں خود آجائے گی۔ ابھی تم گھر آجاؤ، زارا کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے اس وقت، چائے وغیرہ تو رحمت بوا اور ان کی بیٹی بھی سنبھال لے گی۔'' انہوں نے جواب سنے بغیر فون بند بھی کر دیا۔ دادی کا کہا ٹالا نہیں جا سکتا تھا سو وہ سامنے رکھی فائل کو نمٹاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ سمیعہ نے اسے تیز قدموں سے پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

''زارا کے لیے ایسی تڑپ۔'' حسد کی ایک تند لہر نے اس کے پورے وجود کو پھر سے راکھ کیا۔

☆☆☆

دادی کی گھبراہٹ بے جا نہیں تھی۔ عارف کی اماں کا ہر دورہ، دورۂ خاص ٹھہرتا تھا اور پچھلے چند ماہ میں پتی اور اپنے بیٹے کی آؤ بھگت کے بعد بتدریج وہ جس طرح Attitude کا مظاہرہ کرنے لگی تھیں، وہ سامنے والے کے لیے خاصا صبر آزما ہوتا جا رہا تھا اور دادی جیسی نازک مزاج خاتون کے لیے تو قطعی ناقابلِ برداشت۔ لوازمات سے بھری ٹرالی سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے انہوں نے کچھ بھی تنقید کیے بغیر اپنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیٹ میں نہیں جانے دیا تھا۔

کباب میں مرچیں کم، رول میں زیادہ، کیک میں بس شکر ہی شکر اور دہی بڑے پتا نہیں کیسے..... اور یہ ''پتا نہیں کیسے'' کی اصطلاح وہ صرف کھانے میں ہی.... نہیں ہر اس چیز پر استعمال کرتی تھیں جس پر وہ کوئی معقول اور نامعقول اعتراض نہیں ڈھونڈ پاتی تھیں، اس کا علم بھی گھر والوں کو اب تک ہو چکا تھا۔ اپنی خاطر مدارات کے بعد انہوں نے اوپر کا گھر دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔

''اب جب آ کر رہنا ہے تو دیکھ تو لیں، جو کام کروانے ہیں وہ آنے سے پہلے ہی ہو جائیں تو اچھا ہے پھر تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' انہوں نے کسی ٹک چڑھے کرایے دار کی طرح فرمائشی پروگرام شروع کیا۔ دادی کو بے حد برا لگا تھا۔

''ہمارا گھر ماشاء اللہ بہت اچھا ہے اور اللہ کے فضل سے یہاں کسی شے کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

''وہ تو آپ کہہ رہی ہیں مگر ہر ایک کے دیکھنے کا نظریہ مختلف ہوتا ہے۔ اب ہمارا ہی گھر ہے کتنا چھوٹا سا اور پرانا مگر برا مت مانیے گا آپ کے اس بڑے سارے گھر سے کہیں روشن اور ہوادار ہے، آپ کے ہاں تو دھوپ، ہوا کھانے کے لیے آگے یا پیچھے کے برآمدے میں جا کر بیٹھنا پڑتا ہے، کمرے، لاؤنج سب تاریک۔'' انہوں نے بہت ذوق شوق سے اس بے حد خوب صورت گھر کے بخیے ادھیڑے اور پھر خود ہی ہنس دیں۔

''تو پھر آپ وہیں رہیے نا، یہاں عارف اور روما رہ لیں گے، مسئلہ کس بات کا ہے؟'' دادی نے صاف جواب پکڑانے میں دیر نہیں کی۔

ہارون نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد غصے میں آ چکی تھیں اور اگر محض چند منٹ وہ لوگ یونہی آمنے سامنے بیٹھی رہیں گی تو معاملہ اتنا بگڑ سکتا تھا جس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ سو وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلیں آنٹی، میں آپ کو اوپر کا گھر دکھاتا ہوں۔'' زارا گھر پر نہیں تھی اور دادی نے اب روما کا ان لوگوں کے سامنے آنا ممنوع قرار دے دیا تھا سو یہ کمپنی اسے ہی دینی تھی۔

''ایک ہی تو بیٹا ہے میرا، کیسے چھوڑ دوں اکیلا۔'' انہوں نے جواباً ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''چلو دیکھے لیتے ہیں اب جو بھی ہے رہنا تو ہے نا یہاں'' وہ اطمینان سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''آپ نہیں چلیں گی آپا؟'' انہوں نے دادی سے پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا۔

''میرا تو گھر ہے، دیکھنا تو تمہیں ہے، جاؤ دیکھ آؤ۔'' دادی ''آپ'' سے ''تم'' پر آ چکی تھیں۔

''آجا عارف تو بھی چل۔'' انہوں نے فرمانبرداری سے چائے پیتے برخوردار کو بھی دعوت دی تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''اماں کو ایسے ہی مذاق کی عادت ہے دادی، جب ساتھ رہیں گی تب آپ کو بھی عادت ہو جائے گی۔'' اس نے دادی کا برا منا لینا بھانپ لیا تھا سو جانے سے پہلے دل جوئی کی۔ دادی نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ پاس بیٹھی رحمت بوا نے ایک نگاہ اُن کے متفکر چہرے پر ڈالی اور ٹھنڈی سانس لی۔

''اللہ روما بیٹی کا نصیب بہت اچھا کرے گا۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔''

''کیسے فکر نہ کروں، اس کی ماں زندہ ہوتی تو میں ایک دفعہ بھی نہ دیکھتی نہ سوچتی مگر اب تو ایسا لگتا ہے جیسے



کندھوں پر جواب طلبی کا بوجھ رکھا ہے رحمت، کیا منہ دکھاؤں گی اس کی ماں کو میں اگر کوئی اونچ نیچ.....'' نمی سے ان کی آواز بھرائی تھی۔

''دل بھاری مت کریں، دن رات پروردگار سے رو رو کر دعائیں کر رہی ہوں بیگم صاحبہ، کیا پتا اللہ مجھ گناہ گار کی سن ہی لے، وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ روما کو ہماری امید سے بڑھ کر نوازے گا، انشاء اللہ۔'' بوا رحمت کے بوڑھے کمزور ہاتھوں میں دوپٹے کا پلو پھیلا تھا اور چہرے کی جھریوں میں پانی کے قطرے موتیوں کے مانند چمکے ہوئے تھے۔ دادی کے دل کو اچانک ہی بڑے سکون کا سا احساس ہوا تھا، چند لمحوں پہلے چھائی وحشت قرار میں بدلی تھی۔ بیوگی کی طویل زندگی، حلال رزق کما کر کھانے والی بوا رحمت کی وفاداری بڑی اجلی، بڑی خالص تھی اور اس سچے پاکیزہ دل سے نکلی دعا پر دل خود بخود ٹھہرتا تھا۔

''اللہ تجھے جزائے خیر دے رحمت، خدا تیری زبان مبارک کرے میں تو ہمیشہ کے لیے تیری مقروض ہوئی۔'' پہلی بار وہ بوا رحمت کے گلے لگ کر رو پڑیں۔ دادی کے کروفر اور جاہ و جلال کو دیکھنے والی بوا رحمت کے لیے یہ اتنا انوکھا تجربہ تھا کہ وہ بری طرح بوکھلائی جا رہی تھیں۔ ہارون نے آج پہلی بار، عارف اور والدہ کو اکیلے جھیلا تھا، نہ زارا نہ دادی اور حد تو یہ کہ سمیعہ بھی نہیں۔ آج دادی نے کسی کی بھی موجودگی ضروری نہیں سمجھی تھی۔

''یہ اتنی بڑی بڑی کھڑکیاں لگوانے کی کیا ضرورت تھی، ایک کھلے گی تو اتنی مٹی آئے گی، ساری کھل گئیں تو بس کباڑا سمجھو۔ یہ تو تمہیں چھوٹی لگوا کر دینی پڑیں گی صاف بات ہے۔'' کھڑکی سے لان کا پُربہار نظارہ کرتے ہوئے وہ دل میں چاہے جتنی بھی خوش تھیں لیکن چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

ہارون پچھلے بیس پچیس منٹ میں ان سے اتنے اعتراضات سن چکا تھا کہ اسے لگنے لگا تھا کہ ابا سے زندگی میں کوئی اور غلطی چاہے نہ ہوئی ہو لیکن اس گھر کو بنانے میں انہوں نے اتنی غلطیاں کی ہیں کہ یہ گھر بہ مشکل ہی رہنے کے قابل کہلایا جا سکتا ہے۔

''اب بس بھی کرو اماں، ابھی تو تم لائٹ اور ہوا کا رونا رو رہی تھیں اب نیا قصہ شروع کر دیا، ہو کیا رہا ہے تمہیں؟'' ہارون نے عارف کو دبے لہجے میں ماں کو کہتے ہوئے سنا۔ وہ دانستہ تھوڑے فاصلے پر ہوا۔ اماں نے جواب میں کیا کہا، اس نے سننا بھی نہیں چاہا تھا لیکن اگلے چند منٹ وہ جس طرح خاموش رہیں، اس سے ان کی ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''چلیں اب نیچے۔'' اس نے آخر اس مستقل چلتے پروگرام کو مختصر کرنا چاہا۔ اب تک وہ بے حد اکتا چکا تھا اور جس بے تکلفی سے وہ سب کمرے کھول کر دیکھ چکی تھیں نہ چاہتے ہوئے بھی برا لگا تھا۔

''ابھی تک تو تم لوگوں نے اپنا سامان بھی نہیں ہٹایا، کب خالی ہوگا، کب ہمارا سامان لگے گا، تمہارے ہاں تو جلدی کے کوئی آثار نہیں دکھائی دے رہے ہیں بھئی ہمیں۔'' سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی ایک بے اعتنائی بھرا تجزیہ۔ ہارون بالکل خاموش رہا۔

آج پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے عارف کے گھر والوں کے لیے ناکافی ہے۔ جب پہلی بار وہ لوگ یہاں آئے تھے اس وقت سے اب تک ان کے رویے میں زمین آسمان کا فرق آ چکا تھا۔ شاید وہی نہیں سمجھ سکا تھا یا پھر دادی اور زارا ہی ہر بار عارف کی والدہ کو جھیلنے کی ذمے دار رہتی تھیں اس لیے وہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھیان ہی نہیں دے پاتا تھا۔ وہ الجھا الجھا سا ان لوگوں کے ساتھ نیچے آیا تھا۔ رحمت بوا ٹرالی سمیٹ چکی تھیں۔ اماں کے ساتھ عارف کو بھی افسوس ہوا لیکن محض دل میں..... اماں کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔

''ہٹا بھی لیا سب، ابھی وہ پڑا تو میں نے چکھا بھی نہیں تھا۔''

''آپ کو پسند نہیں آرہا تھا اس لیے رکھ دیا لے جا کر واپس، ابھی چائے بن کر آرہی ہے آپ کو ضرور پسند آئے گی۔'' متانت سے کہتے ہوئے بوا رحمت کچن کی طرف چلی گئیں۔ ہارون یادادی میں سے کسی نے اُن کی بات کی تصحیح نہیں کی۔

''بڑی تیز بڑھیا ہے، لگتا ہے تم لوگوں نے بہت سر پر چڑھالیا ہے۔'' بنا کسی کی طرف دیکھے، وہ بہت تپے ہوئے انداز میں بولیں۔ دادی اور ہارون نے بے ساختہ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دادی نے ہلکے سے اپنا گلا صاف کیا۔

''رحمت ہمارے ہاں گھر کے فرد کی طرح ہے اور ان دونوں بچوں ہارون اور روما کے لیے وہ اتنی ہی قابلِ احترام ہے جتنا کسی بھی شریف گھر میں کوئی بزرگ ہوسکتا ہے۔'' دادی نے بھی بنا کسی کو مخاطب کیے ہی کہا تھا لیکن ماحول پر گمبھیر سی خاموشی اگلے چند لمحوں میں طاری رہی۔ ہارون کو آج درحقیقت مایوسی ہوئی تھی۔ دادی نے شاید آج اسے ان لوگوں کے ساتھ اکیلا اسی لیے چھوڑا تھا کہ وہ کچھ باتیں کچھ روتے، خود اپنے تجربے سے گزار کر دیکھے۔ قالین کے پرنٹ پر نگاہ جمائے، وہ کسی دھیان میں تھا۔ عارف نے ماحول پر چھائے بوجھل پن کو بخوبی محسوس کیا تھا، سو اب بوکھلائے ہوئے انداز میں خود ہی بولے جارہا تھا۔

''میرے تو آفس میں بھی خبر اڑ گئی ہے کہ میں نوکری چھوڑ کر ہارون بھائی کے ساتھ بزنس جوائن کررہا ہوں، لوگ تو مجھے ابھی سے سفارشیں دینے لگے ہیں کہ اپنے سالے صاحب کے آفس میں ہمارے بیٹے یا بھائی کو بھی جاب دلوا دینا، مہربانی ہوگی۔ تین تو ہماری اماں کے ہی بھتیجے ہیں، برسوں سے بیکار بیٹھے ہیں۔''

''عارف۔'' ہارون کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی اور اس نے اتنی دیر میں کم از کم ایک فیصلہ تو کر ہی لیا تھا۔

''جی ہارون بھائی۔'' عارف کی گہری سانولی رنگت خوشی سے چمک رہی تھی۔

''میرے خیال میں کچھ باتیں ہم لوگوں کے بیچ کلیئر ہونے سے رہ گئی ہیں، بہتر ہوگا ہم ان پر بھی بات کرلیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ تم اپنی جاب کرتے رہو گے، شادی کے ایک سال بعد ہم تمہیں اپنے آفس میں کسی اچھی پوسٹ پر رکھ سکتے ہیں اس سے پہلے نہیں اور کسی کو بھی جاب ہمارے ہاں اس کی قابلیت پر ملتی ہے نا کہ سفارش پر، اس لیے مہربانی کر کے لوگوں سے الٹے سیدھے وعدے مت کرنا ورنہ بیکار کی شرمندگی تمہیں اٹھانی پڑے گی، ابھی سے بتا رہا ہوں۔'' ہارون نے غور سے باری باری دونوں ماں بیٹے کے چہروں کو دیکھا۔

''ہماری کوئی بات بری لگ گئی ہے آپ کو یقیناً۔'' عارف کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

''جب لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو کچھ اچھا برا لگنا نارمل سی بات ہے، ہوسکتا ہے تمہیں بھی میری بات بری لگی ہو لیکن اگر سوچو گے تو میرا نقطۂ نظر بہتر طور پر سمجھ لو گے۔'' ہارون کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

دادی کو آج پہلی بار، وہ روما کی شادی کے اس سلسلے میں غیر جذباتی ہو کر بات کرتا ہوا محسوس ہوا تھا اور یہ



بہر حال ایک نیک فال تو تھی۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، اتنے بڑے گھر کا داماد بن کر بھی اگر عارف جونیئر کلرکی ہی کرتا رہے گا تو ہم سے زیادہ تو تمہاری بے عزتی ہوگی، ہم تو ٹھہرے غریب لوگ مگر تمہیں اور تمہارے والد کو تو آدھا شہر جانتا ہی ہوگا نا، کیا بتاؤ گے تم..... کہاں کی ہے، بہن کی شادی؟'' وہ جو ٹرالی سمیٹے جانے کے غم میں مبتلا تھیں اب بری طرح تلملائی ہوئی تھیں۔ ہارون نے پورے صبر سے اُن کی بات سنی تھی۔

''ہماری بات جانے دیں آنٹی، جو ہم نے کہا ہے وہ ہماری عین خوشی ہے، عارف ایک جائز، حلال آمدنی کمارہا ہے، ہم سب سے پورے فخر کے ساتھ اس کا تعارف کرائیں گے، بے فکر رہیں۔''

''تم کہاں کے بڑے ہو، جو فیصلے کرنے لگے، تمہارے ابا نے بھی حد ہی کردی تمہیں ساری ذمے داری سونپ کر..... میرے عارف سے کچھ سال چھوٹے ہی ہو گے، کیوں آیا؟'' وہ بے تکے پن سے بات کو کہاں سے کہاں لے جانے لگیں مگر ہارون نے اس بار انہیں زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا۔

''اب جیسا بھی ہے، ہمارے گھر کا یہی سیٹ اپ ہے آنٹی..... اس لیے شاید مجھے زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔'' وہ رک کر ذرا مسکرایا۔

''اور ایک بات، اس وقت ہم جو کچھ بھی روما کو دیں گے وہ اگلے پانچ سال تک نہ تو بیچا جائے گا اور نہ ہی کسی کے نام ٹرانسفر ہوگا، آپ لوگ یہاں رہیں گے تو وہ فلیٹ جو روما کے نام ہے کرایے پر جائے گا اور اس کا کرایہ روما کے اکاؤنٹ میں مستقل جمع رہے گا۔'' بات مکمل کر کے وہ اس طرح ہلکا ہو کر بیٹھا جیسے ایک بڑا بوجھ کندھوں سے اترا ہے۔ دادی نے بہت محبت سے اس کی طرف دیکھا دل کو آیا قرار بے وجہ نہیں تھا۔

''اور اگر ہم نہ مانیں یہ شرائط تو.....؟'' سناٹے میں عارف کی اماں کی سرسراتی ہوئی سی آواز گونجی۔ وہ ابھی تک شاید کسی غلط فہمی میں تھیں اور ہارون کے لیے یہ آدھی ادھوری بات اتنی خوفناک کہ اس نے اس برے امکان سے بھی بچ کر گزرنے کی ٹھان رکھی تھی مگر اس بار کوئی اور نہیں..... نہ زارا، نہ دادی، نہ روما کوئی بھی اس ادھوری ڈھکی چھپی سی وارننگ کا جو لڑکیوں کے ماں باپ کا دل دہلاتی ہے، سبب نہیں بنا تھا۔ وہ خود اس چبھتے ہوئے سوال کو سامنے لایا تھا۔ عارف کی اماں بہت طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، ہارون کی جد سے بڑی سخاوت اور جھکاؤ دونوں ہی جس رفتار سے اُن کا دماغ خراب کر چکے تھے اس کے بعد وہ خاصی پُراعتماد تھیں۔

''یونہی لڑکے کے دماغ کا خلل، ابھی جی جی کرنے بیٹھ جائے گا۔'' انہوں نے خود سے کہا تھا مگر وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

''تو پھر جو اللہ کی مرضی، میری کیا حیثیت ہے آنٹی۔''

''تو ہم ہمارا کہا مان لو گے، ہونا بھی یہی چاہیے بیٹا، بہن بیٹی والے کو دل بڑا اور سر جھکا کر رکھنا چاہیے تب ہی لڑکیوں کے گھر بستے ہیں، ورنہ تو بھئی.....''

''میں نے رب کی مرضی کا ذکر کیا ہے آنٹی۔'' اس بار اس نے اُن کی بات تیزی سے کاٹی تھی۔ ''اور اسلام میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا حکم ہے اور ان کے نکاح کے وقت، باپ، بھائی، چچا، ماموں جو بھی ولی ہو، اس پر یہ بات فرض ہے کہ وہ ان حقوق کو پامال نہ ہونے دے، سر اٹھا کر پورے احترام کے ساتھ انہیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رخصت کرے۔'' اس کی آنکھوں میں پتا نہیں کیوں آنسو آنے لگے تھے سو وہ یونہی نظر چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''لو بھئی یہاں ''عالم آن لائن'' کا پروگرام شروع ہوگیا، ہم یہاں شادی کے فنکشن کی تفصیلات طے کرنے کے لیے آئے تھے کوئی شرعی مسئلہ پوچھنے نہیں، چلتے ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں تو بس یہ کہوں گی کہ اب تاریخ طے ہو چکی ہے ایسی باتیں نکالنے سے گریز ہی کرو تو اچھا ہے۔'' عارف کی اماں ''سنو تو'' کی گردان کے باوجود کہہ کر باہر نکل چکی تھیں اور ان کے پیچھے عارف۔ دادی فکر مندی ہو کر ہارون کو دیکھنے لگیں۔

''بہت ناراض ہوگئی ہیں، یہی باتیں پہلے کر لیتے تو کتنا اچھا تھا مگر جب تو سن ہی نہیں رہے تھے کسی کی...... زارا غریب نے کتنی ڈانٹ کھائی تم سے۔''

''اب بھی کسی کی نہیں سنی، بس اپنے دل کے سوا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دل نے کہا لوگوں کو اتنا ہی آزماؤ جتنا ان کا ظرف ہے اور میں نے عارف کی والدہ کو ان کے ظرف سے زیادہ بڑی فکر بخش دی تھی سو صرف ان کا بوجھ ہلکا کیا ہے، اب بالکل ٹھیک ہو جائیں گی وہ دیکھ لیجیے گا۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ ہنس دیا مگر دادی مسکرائی تک نہیں۔

''لوگوں کی امیدیں ٹوٹنے کا ردِعمل بھی کم نہیں ہوتا بیٹا، کیا تم نے روما کی شادی کا یہاں ارادہ بدل ''

''خدا نہ کرے دادی۔'' ہارون کا چہرہ سرخ پڑا تھا۔ ''اب تو شکر ہے کہ بہت تھوڑا عرصہ رہ گیا میں تو صرف انہیں تھوڑا سا ٹھیک کرنا چاہ رہا تھا شادی کیوں کینسل ہونے لگی، آپ آرام سے تیاریاں مکمل کیجیے، سب کچھ انشاء اللہ بہت اچھا ہوگا بے فکر رہیے۔ عارف کی والدہ محترمہ کہیں جانے والی نہیں ہیں۔'' وہ کہتا ہوا پھر سے مڑنے لگا تھا کہ کچھ یاد آیا۔

''بہت شکریہ دادی۔'' وہ ان کے پھر سے قریب آیا۔

''اور سوری بھی...... آج اگر آپ ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں دیتیں تو شاید میں یہ سب کچھ کہہ نہیں پاتا جو کہنا سب سے زیادہ ضروری تھا، میں پتا نہیں خوف زدہ زیادہ ہو چکا تھا روما کی طلاق کے بعد کہ میں اس کی شادی کے لیے تو سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس کی عزتِ نفس برقرار رکھنے کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا قدم بھی نہیں اٹھایا، خدا کا شکر ہے جو یہ کام بھی بروقت ہوا، آپ مجھے معاف کر دیجیے گا پچھلے دنوں کی ساری بدتمیزیوں پر۔'' کسی چھوٹے سے بچے کے مانند کیا جانے والا اظہارِ ندامت۔ دادی نے بہت محبت سے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''اور معافی مجھ سے زیادہ زارا سے مانگنے کی ضرورت ہے، مقابلہ بالشانہ تو وہ بھی بے نہایہ ہے۔''

''اس سے بھی مانگ لوں گا اور روما سے بھی، پتا نہیں کیا سوچتی ہوگی کہ میں اسے بوجھ سمجھ رہا ہوں ...... حد ہے۔'' آج بہت دن بعد وہ پہلے والا ہارون تھا، ہنستے والا، احساس و محبت کرنے والا ...... مگر دادی کے دل میں ایک بات آج بھی اندر کہیں چبھن پیدا کر رہی تھی۔

''عارف واقعی روما کے قابل ہے ہارون؟'' اس کی روشن مسکراہٹ دیکھ کر پوچھ رہی تھیں۔

''لوگ اتنے اچھے نہیں ہوتے جتنی دادی ہم ان سے توقع کرتے ہیں ...... عارف اگر ......



قابل نہیں ہے تو ہم اس کی مدد کریں گے کہ وہ روما کے قابل بن جائے، ویسے وہ اتنا برا نہیں ہے، آفس میں، محلے میں اس کی شہرت خراب نہیں ہے، بس سنا ہے کہ تھوڑا سا کنجوس ہے سو یہ کوئی عیب نہیں...... اگر کنجوس کی جگہ کفایت شعار کا لفظ استعمال کریں تو اچھا بھی لگنے لگے گا۔'' اس بار دادی ہلکے سے مسکرائی تھیں۔

☆☆☆

رات بہت روشن تھی اور ان کے کمرے کی کھلی کھڑکی پر ستاروں کا روپہلا غبار جھکا پڑتا تھا۔ ہارون نے بہت محبت سے، کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی زارا کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیریں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں، پتا نہیں کیا ہوتا ہے زارا جو میں تم سے دور ہوتا چلا جاتا ہوں، میں بار بار خود سے عہد کرتا ہوں کہ اب کچھ نہیں ہوگا مگر پھر وہی جھگڑا......'' ایک گہری سانس لیتے ہوئے زارا نے کھڑکی سے باہر پھیلی خوب صورتی پر دھیان لگانا چاہا۔ جھگڑے فساد کی وجہ بیان کرتی تو ایک فوری نیا جھگڑا حاضر تھا سو چپ بھلی۔

''تم نے آج جو کچھ عارف کے گھر والوں سے کہا، مجھے اس پر فخر ہے ہارون...... تمہیں جیسے بھی خیال آیا، آیا تو سہی...... میرے لیے تو بس یہی مقامِ شکر ہے۔''

حسنہ بیگم کے پاس سے وہ زین کی وجہ سے جتنی اپ سیٹ آئی تھی گھر آ کر سنی تفصیل اتنی ہی تسلی بخش تھی۔

''وہ بہت لالچی خاتون ہیں زارا حالانکہ مجھے شروع سے پتا تھا کہ یہ لوگ روما کے لیے محض اپنے لالچ میں رشتہ لائے ہیں مگر پھر بھی دل میں خواہش اور زبان سے مانگتے رہنے میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے، تمہیں پتا ہے سب سے زیادہ انہیں ہمارے گھر میں کیا پسند آیا؟'' وہ کچھ بتاتے بتاتے رکا تو زارا ہنس دی۔

''کمال ہے، انہیں کچھ پسند بھی آیا تھا؟''

''ہاں، انہیں ہمارا یہ گھر اپسند آیا تھا۔''

''اچھا۔'' زارا کو اچھا لگا تھا۔ ''میں صاف بھی تو بہت رکھتی ہوں نا...... اسی لیے تعریف کر رہی ہوں گی۔''

''نہیں، اس لیے کہ یہ سب سے بڑا ہے، کہہ رہی تھیں کہ یہ گھر لے لیں گی۔'' ہارون کا انداز چڑانے والا تھا۔

''لے لیں، روما خوش رہے گھر تو کیا گھر بھی لے لیں تو کیا فرق پڑتا ہے ہارون۔'' وہ بڑی بے پروائی سے کہہ رہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ آج بہت دن بعد ڈھیر ساری باتیں، دوستی کا گم گشتہ جذبہ واپس ملا تھا۔ تب ہی ہارون کو کچھ یاد سا آیا۔

''اور وہاں پھپھو کے ہاں کی کوئی خاص خیر خبر، کیا ہو رہا تھا وہاں، کسی سے ملاقات ہوئی؟'' آخری سوال پر وہ خود ہی جھینپ گیا۔ ''کیا تھا وہ خود ہی بتا دیتی، آج نہیں تو کل۔''

''وہاں بس زین کا مسئلہ تھا، امی بہت پریشان ہیں اور ابو بھی، بس اسی کی بات ہوتی رہی، دل بہت خراب ہوا جا کر۔'' وہ یاد کر کے بھی افسردہ ہوئی۔ ہارون نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''کوئی مہمان بھی آئے تھے کیا پھپھو کے ہاں، میرا مطلب ہے ان کی طبیعت پوچھنے کے لیے؟'' اب جب بات منہ سے نکلی تھی تو تسلی کیے بغیر رہا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''کوئی مہمان وہمان نہیں، وہاں اب لوگوں کا آنا جانا تقریباً ختم ہی ہوگیا ہے ہارون، کوئی نہیں آتا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں۔'' وہ تکیے وغیرہ ٹھیک کر کے لیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہارون نے بہ مشکل خود کو کمپوز کیا۔

''اچھا!'' اس کی ساری خوش گمانی رخصت ہوئی۔

''تم بھی سو جاؤ، صبح آفس جانا ہے۔'' زارا کی پلکیں بند ہونے لگیں..... مگر وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔

☆☆☆

تہمینہ آج پھر اس کے آفس میں آئی بیٹھی تھی۔

''شادی کا کارڈ دینے آئی ہو؟'' سیف اسے دیکھتے ہی مسکرایا تھا۔

''نہیں، ابھی کچھ دن ہیں اور ویسے بھی یہ شادی کارڈ اور دعوت والی نہیں ہے، آنا چاہیں تو بس دعا دینے کے لیے آجائیے گا۔'' اس کی مسکراہٹ میں اب پھیکا پن آرہا تھا اور چہرے پر ہلکی سی زردی۔ پتا نہیں صحت کی خرابی تھی یا حالات کی لیکن سیف کو اسے دیکھ کر ہلکی سی فکر ضرور ہوئی تھی۔

''دعائیں تو ہر وقت ہی تمہارے ساتھ ہیں لیکن اگر کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ، میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔'' اس کے مہربان لہجے میں بڑی تسلی، بڑا خیال تھا اور اس کی سخاوت کے قصے معلوم نہیں کیسے مگر عرصے سے عام تھے۔ پورے سرکل میں سیف الاسلام کی طرف سے کیے گئے رفاہی کاموں کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے اعلیٰ کردار کی گواہی اس کی روشن پیشانی اور آنکھیں دیتی تھیں۔ تہمینہ کے دل پر آنسو کے چند قطرے بوند بوند کر کے ٹپکے اور نگاہ بے اختیار ہی جھکی۔ وہ تو شاید اس قابل بھی نہیں کہ سیف کی طرف نگاہ جما کر دیکھنے کی بھی حق دار ٹھہرے۔ اس نے ذرا رک کر خود کو اپنی اوقات یاد دلائی۔

''بتاؤ نا تہمینہ، اگر دوست سمجھتی ہو، کوئی بڑی پرابلم آگئی ہے کیا، تمہارے ریلیشن شپ میں۔ میں ملتا ہوں زین سے اگر تم کہو۔'' وہ جیسے بھی بن پڑے اس کی تسلی کروانا چاہ رہا تھا۔ تہمینہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آہی گئی۔

''یہ روتی دھوتی سی مسکراہٹ، تم پر بالکل سوٹ نہیں کر رہی کم از کم ڈھنگ سے ہنس تو لو، تم تو ایکٹنگ بھی بھول گئی ہو لگ رہا ہے، حالانکہ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں اپنی اگلی سیریل میں کاسٹ کرلوں مگر اب ارادہ بدلنا پڑے گا۔''

''کیا واقعی؟'' وہ جس طرح چونک کر سنبھل کر بیٹھی تھی، بڑا ہی بے ساختہ انداز تھا، سادہ اور بناوٹ سے پاک۔ بلاشبہ وہ حسین تر تھی لیکن قسمت کی خرابی کا مستقل شکار سیف نے اس کی جدوجہد کا سارا نہیں مگر کچھ زمانہ دیکھا تھا۔

''ضرور دے دیں سیف صاحب، مجھے تو آج کل پیسوں کی سخت ضرورت بھی ہے، کوئی کام نہیں ہے میرے پاس اور آپ کے مشورے پر شادی کا ارادہ کرلیا، نہ چاہتے ہوئے بھی..... تو زین کے والدین نے بہت زبردست جھگڑا ڈالا ہوا ہے کسی صورت بھی تیار نہیں ہیں وہ مجھے اپنی بہو بنانے کے لیے۔'' وہ ایک سانس میں ہی اپنی پریشانیوں کا پیراگراف پڑھتی چلی گئی۔

''انہیں کیا اعتراض ہے، خرابی کیا ہے تم میں..... اتنی اچھی لڑکی انہیں کہاں ملنی ہے؟'' سیف کی روشن خیالی اسے ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کا عادی بنا چکی تھی مگر وہ شرمندہ تھی۔



''میں اچھی لڑکی تو نہیں ہوں خیر، خاصی بدنامیاں سمیٹ چکی ہوں، ہمدانی کے حوالے سے..... آپ بھول گئے ہوں گے مگر لوگوں کی یادداشت آپ کی طرح خراب نہیں ہے۔'' اپنی بات کہہ کر وہ ہلکے سے ہنس بھی دی مگر سیف ایسی ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔

''بچوں جیسی باتیں مت کرو تہمینہ، ہمدانی ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور جو بیت گیا سو بیت گیا، منگنی یا شادی ختم ہوجانے کا مطلب بدنامی کیسے ہوسکتا ہے یہ تو زندگیوں کے معمول میں آنے والی باتیں ہیں، کوئی ان سے بچ کر نکل جاتا ہے اور کوئی ان آزمائشوں کو جھیلتا ہی ہے جیسے میں، تم..... ہم جیسے کتنے ہی..... تو کیا ہم سب برے لوگ ہیں۔''

''آپ اپنی مثال تو مت دیجیے، آپ جیسا کون ہوسکتا ہے؟''

''سب ہوسکتے ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ ''دیکھو زندگی آسان بھی ہوسکتی ہے اور مشکل بھی لیکن یہ خود ہم پر ہے کہ ہم اسے مزید آسان یا مزید مشکل کیسے بنا سکتے ہیں اور تم تو زندگی کو آسان بنانا جانتی ہو تہمینہ اپنے سارے خاندان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، اتنی محنت، اتنی قربانی دینے والی لڑکی.....''

''چھوڑیں اس قصے کو۔'' وہ اب خاندان یا خاندان والوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی سخت کنفیوزن کا شکار ہونے لگی تھی۔

''میرا رشتوں پر سے اعتماد ختم ہوا ہے سر، میں آپ سے سچ کہتی ہوں کہ میں زین سے کبھی شادی کرنے کے لیے ہاں نہ کہتی اگر میرے اپنے گھر میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ باقی رہ جاتی مگر وہاں تو اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔'' وہ افسردہ زیادہ تھی یا شرمندہ؟ مگر جنہیں اس کی جگہ شرمندہ ہونا چاہیے وہ تو سب کس ڈھٹائی سے خوش و خرم زندگی گزارتے ہوں گے، دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، پوری بے شرمی کے ساتھ ہنستے ہوں گے۔ سیف کا حساس دل بری طرح دکھا۔

''میں نے زین سے بہت کہا کہ میں اس کے گھر والوں کو چل کر خود منا لیتی ہوں، ماں باپ ہیں، پیر پکڑ لوں گی، ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوجاؤں گی تو یہ بھی میری خوش نصیبی ہوگی، میں نے کبھی بزرگوں سے دعا نہیں لی کبھی ان کی شفقت بھری ڈانٹ نہیں سنی ہے سیف..... میرے حصے میں صرف وہ غصہ آیا ہے جو پیسے نہ لانے پر میری ماں نے، میرے باپ نے کیا مگر زین مجھے وہاں لے جانے پر راضی ہی نہیں ہوتا، کہتا ہے کہ کچھ فائدہ نہیں..... اب بتائیں میرے جائے بغیر اسے فائدہ اور نقصان کیسے پتا چل گیا؟'' آج اس کی باتوں میں سوال ہی سوال تھے۔ پتا نہیں کیوں..... مگر سیف کو زین پر غصہ آنے لگا۔

''اگر اس پر والدین کا اتنا پریشر تھا تو پھر اسے آگے بڑھنا ہی نہیں چاہیے تھا، خوامخواہ کسی لڑکی کو دھوکے میں رکھنا.....''

''اس نے کبھی کوئی دھوکا نہیں دیا سیف..... وہ بہت اچھا ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی اور نہ کرسکوں گی، پھر بھی وہ میری خاطر اپنے والدین کو چھوڑ رہا ہے۔''

''اگر وہ اچھا ہے تو اپنے والدین کو اس ضعیفی میں اکیلا چھوڑنا اس کی ساری اچھائی پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہے۔ کسی بھی طرح انہیں مناتا، تب بات تھی۔'' زین کی ساری اچھائی کو اس نے یکسر رد کیا۔ تہمینہ نے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھکے تھکے انداز میں اسے دیکھا۔

''آپ مجھے کام دے دیں، میں چاہتی ہوں کہ ہم ایک الگ گھر لے لیں کرایے کا ہی، اس بار میں صرف اپنے لیے خودغرض ہونا چاہتی ہوں، اس لیے کہ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مجھے مت روکیں پلیز۔'' اس کی مجبوری چہرے سے پڑھی جارہی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے سیف الاسلام نے، ان دیکھے لوگوں کا دکھ بڑے قریب سے محسوس کیا۔

''اور اس کے ماں باپ، وہ اکیلے پڑے رہیں گے اپنے گھر میں، ان کے بارے میں کون سوچے گا؟''

''وہ زین کا مسئلہ ہے۔''

''لیکن وہ تو تمہارے مسئلے کا حل نکال رہا ہے نا!''

''ہاں، تو ان لوگوں کا خاندان ہے، شادی شدہ بیٹی ہے، کوئی تو سنبھالے گا اور ضد انہوں نے لگائی ہے زین نے نہیں مگر وہ تو میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کررہی تھی۔

''کام تم جب چاہو کرسکتی ہو، کئی نئے پروجیکٹ اسٹارٹ ہونے والے ہیں لیکن اچھا ہوگا جو اس شادی کو فی الحال ڈیلے کردو کم از کم زین کے والدین کی رضامندی حاصل ہونے تک۔ ان کی ذمے داری، زین کی بہن سے کہیں زیادہ خود زین پر ہے۔''

''اور اتنے عرصے میں کہاں رہوں، سڑک پر یا پھر کسی غلط دھندے میں پھنس کر.....'' وہ اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ماحول کی کڑواہٹ یک دم بڑھی تھی۔ ''میں صباحت سے کام کی تفصیلات لے لیتی ہوں ابھی۔'' ذرا رک کر اس نے دھیمے سے کہا اور باہر چلی گئی۔ سیف نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا تھا۔ کبھی کبھی ساری نصیحت، ساری اخلاقیات یونہی ایک طرف دھری منہ چڑاتی رہتی ہیں، مجبوریوں کی ان گنت شکلیں اور دکھوں کے نہ ختم ہوتے سلسلے پھر بھی پھر بھی! اس کی فطری خوش امیدی شاید اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھی۔

موبائل پر صادق چچا کا فون آرہا تھا۔ آج کل وہ اسے پھر سے فون کرنے لگے تھے۔ رفیعہ بیگم دو ماہ کے لیے مہرین کے پاس کینیڈا چلی گئی تھیں۔ سو اسے صادق چچا کے ہاں جانے کے لیے کسی بہانے کو تلاش کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آرہی تھی۔

''سیف، شہوار کا کہیں پتا نہیں چل رہا، اس کا موبائل بند ہے اور گھر پر تالا لگا ہوا ہے، پڑوسی بتا رہے ہیں کہ وہ علی الصباح کی نکلی ہوئی ہے، اس کی ماں کا برا حال ہے۔'' دوسری طرف سے صادق چچا گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''آپ فکر نہ کریں، میں پتا کرتا ہوں۔''

''ہاں، جتنی جلد ہو سکے مجھے اطلاع کرو، شہر کے حالات ویسے ہی کتنے خراب ہیں، میں کسی کو اسپتال وغیرہ بھیج کر چیک کرواتا ہوں۔ کہیں خدانہ کرے.....'' ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ تنویر کا انہوں نے نام تک نہیں لیا تھا۔ ایک نافرمان، ضدی اور خودسر بیٹی کے لیے، جس کی وہ شکل نہ دیکھنے کی ضد باندھے ہوئے تھے اور جس کا صادق پیلس میں داخلہ اب ممنوع تھا۔



''میں تو دعا کررہا ہوں کہ اس بدنصیب کی لاش ہی مل جائے مگر لاپتا نہ ہو، ورنہ مجھے تو قبر میں بھی صبر نہیں آئے گا میرے کن گناہوں کی سزا ہے میری اولاد، میں نے اس کی خاطر تمہاری زندگی برباد کی اور پھر بھی.....'' وہ ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ سیف کو انہیں چپ کرانا بھی بڑا ہی عجیب سا لگا۔ بے حد بارعب، کروفر کے ساتھ زندگی گزارنے والے صادق چچا، جن کے سامنے کھڑا ہونا آج بھی بہت سوں کے بس سے باہر تھا۔

''اللہ پر بھروسا رکھیں چچا، میں کرتا ہوں کچھ۔'' جب وہ انہیں تسلی دینے کے لیے دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا تو خود اس کا دل ہلکے سے کانپا تھا۔ فون بند کرکے بھی، وہ چند منٹ یونہی ساکت ہوا بیٹھا رہا۔ اس اتنے بڑے شہر میں، وہ اس ایک عورت کو جس کا ذہنی توازن ہمیشہ سے مشکوک تھا کہاں ڈھونڈے بھلا؟ دونوں ہاتھوں پر سر جھکائے وہ یکسو ہوکر سوچ میں ڈوبا، تب ہی ایک بھولا بسرا سا مقام اسے یاد آیا۔ شہوار کے حوالے سے اب جتنے بھی Links تھے، وہ تنویر ہی کے ہو سکتے تھے سو وہ اسی لائن پر چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، باہر ابھی سہ پہر ہی ٹھہری تھی۔

☆☆☆

''روما!'' زارا نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے جھانکا۔ وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی اپنے کپڑے استری کررہی تھی، اس کی آواز پر مڑ کر دیکھا۔ آج کل وہ اور بھی زیادہ خاموش اور بھی زیادہ منظر سے ہٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

''فارغ ہو تو میرے ساتھ، نیلر کے ہاں چلو۔'' وہ کہتے ہوئے اندر آئی تھی، روما نے حسب عادت فرمانبرداری سے سر ہلا دیا۔

''چلتی ہوں، یہ چند کپڑے رہ گئے ہیں استری سے۔''

''میں کردیتی ہوں، تم جاؤ تیار ہوجاؤ۔'' زارا نے نرمی سے کہتے ہوئے، اس کے ہاتھ سے استری لی تو وہ خاموشی سے کپڑے اٹھا کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

''لاؤ میں تمہارے بال بناؤں۔'' کپڑے ہینگر کرکے وہ روما کے پیچھے آکر کھڑی ہوئی۔ روما ہلکے سے مسکرادی۔

''میری کتنی عادتیں خراب کروگی تم، پہلے ہی دادی کے لاڈ پیار میں بگڑی ہوئی تھی اچھی خاصی۔''

''کوئی بگڑی وگڑی نہیں۔'' زارا محبت سے اس کے ریشمی سیاہ بالوں میں برش پھر رہی تھی۔ ''اتنی سیدھی بلکہ احمق لڑکیاں اب ہوتی کہاں ہیں، مجھے تو بڑی فکر ہے کہ اتنی چالاک ساس سے کیسے نمٹو گی تم، کتنا بولتی ہیں اور اتنا ہی بے تکا۔'' روما بڑے خوشگوار انداز میں ہنسی تھی۔

''اُن سے نمٹنے کے لیے تم اور دادی ہو، اس لیے مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں، عارف بھی تو ہوگا، تمہارا سب سے بڑا حمایتی، اسے کیوں بھول رہی ہو۔'' زارا نے شرارت سے چھیڑا تو اس بار وہ اپنی مسکراہٹ دبا گئی۔

''اچھا بس فضول باتیں نہیں۔'' اس کے چہرے پر رنگ سا اترا ہوا تھا۔ زارا کو بے حد اچھا لگا۔ اتنے بہت سارے دنوں میں، آج وہ خوش تھی سو یہ بڑی ہی غنیمت بات تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اب تو ہماری باتیں فضول ہی لگیں گی، اچھی باتیں تو کوئی اور ہی کرنے آرہا ہے۔'' بالوں میں بینڈ لگاتے ہوئے وہ روما کے چہرے کو محبت سے دیکھے گئی۔

''اچھا، اب دیر نہیں ہو رہی، میں دادی کو بتا کر آتی ہوں۔'' وہ تیزی سے کہتے ہوئے قریب سے گزر کر جانے لگی تھی کہ زارا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''اب تو خوش ہو نا؟''

''ہوں۔'' اس کا سر دھیرے سے ہلا۔ ''کل رات تم تو دیر سے آئی تھیں مگر وہ لوگ شام سے ہی آچکے تھے، یہاں تک بھی کئی آوازیں آئیں وہی الٹی سیدھی باتیں..... میں کمرا بند کیے بیٹھی رہی، روئی بھی۔'' وہ ذرا رکی۔ زارا نے نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا۔

''مجھے لگتا تھا زارا کہ بھائی ایک ناگوار بوجھ کو اتارنے کے لیے سزا کے طور پر ان سب کی باتیں برداشت کر رہے ہیں اور جرمانے کے طور پر میرے ساتھ مال و دولت کا ڈھیر لگا رہے ہیں تاکہ کوئی اس پیسے کے صدقے میں ہی سہی مجھے قبول کر لے تو وہ آزاد ہو جائیں، مجھے اب یقین ہونے لگا تھا کہ میں اب اپنے بھائی کے لیے زندگی کی سب سے بڑی تکلیف بن کر رہ گئی ہوں اور کچھ نہیں۔'' اس نے ایک تھکی تھکی سی سانس لی۔ وہ اب کمزور ہو رہی تھی پچھلے چند ماہ میں اس کا بڑھتا ہوا وزن، تیزی سے کم ہو کر اسے ایک دل کش سراپا عطا کر چکا تھا۔ شاید وہ بہت زیادہ ٹینشن لے چکی تھی۔

''اتنا مت سوچا کرو اور وہ بھی سب غلط سلط، ہارون بہت زیادہ محبت کرتے ہیں تم سے، اتنی جتنی وہ کسی اور سے کر ہی نہیں سکتے دنیا میں۔''

''مجھے پتا ہے زارا، رات جو کچھ انہوں نے عارف کی والدہ سے کہا، وہ ان کی گہری محبت کا ثبوت نہیں تو اور کیا تھا۔'' اس کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔

''میرے بھائی نے مجھے میری نگاہوں میں گرنے سے بچا لیا زارا، ورنہ میں جیتے جی مر گئی تھی، اب یہ شادی ہو گی تو بھی میں خوش ہوں اور اگر نہیں ہوتی تب بھی اتنی ہی خوش رہوں گی، خدا کی مصلحت سمجھوں گی، تم بھائی سے میرا شکریہ کہہ دینا، پتا نہیں کیوں میری ہمت نہیں پڑی کہنے کی۔'' اس کی آواز میں بار بار نمی اتری تھی۔ زارا نے بہت پیار سے بنا کچھ کہے اسے گلے سے لگایا۔ چند لمحے وہ یونہی اس کے کندھے سے ساکت لگی کھڑی رہی پھر دھیرے سے الگ ہوئی۔

''میں دادی کو بتا کر آتی ہوں کہ ہم جا رہے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

''چلو، میں بھی چلتی ہوں۔'' وہ کہہ بھی نہیں پائی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل بجی تھی، کوئی غیر مانوس سا نمبر تھا۔

''ہیلو۔''

''رضا بول رہا ہوں زارا، کیسی ہو؟'' دوسری طرف سے وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ زارا کا دل بڑے ناگوار انداز میں دھڑکا۔

''آپ کو میرا نمبر کہاں سے مل گیا؟''

''کزن ہو، خاندان میں کس کے پاس تمہارا نمبر نہیں ہو گا، ایک میں ہی محروم تھا سو میں نے بھی لے ہی لیا



کسی سے۔''

''آپ نے فون کیوں کیا مجھے؟'' وہ اب تک خود پر کنٹرول کر رہی تھی۔

''ایسے ہی کر لیا، دل گھبرا رہا تھا، تنہائی بھی اصل میں بڑا ہی عذاب ہے..... اب دیکھ لو.....''

''آپ ہوش میں رہیں رضا بھائی، اپنی تنہائی اپنے گھر والوں کے ساتھ بانٹیں، بہت بڑا خاندان ہے کہیں بھی فون گھما لیں مگر مجھے آئندہ فون مت کیجیے گا سمجھے!'' اس نے بہت غصے میں فون بند کیا تھا کہ روما واپس آئی۔

''کیا ہوا، کس کا فون تھا؟'' اس نے زارا کے چہرے اور ہاتھ میں تھمے فون دونوں پر ہی نگاہ ڈالی۔

''کچھ نہیں، رانگ نمبر تھا، چلو۔'' تیزی سے بات کو ٹالتے ہوئے وہ کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ دوبارہ بیل ہوئی۔ وہی نمبر تھا۔ زارا نے اس بار سیل فون آف کیا تھا۔

''کل امی کو رضا کا آنا ٹھیک ہی برا لگا تھا۔'' وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی۔

☆☆☆

مہینے کی ابتدائی تاریخوں کی وجہ سے بینک میں بلا کا رش تھا۔ پھر بھی وہ اس وقت تک پورے صبر سے بیٹھی رہی، جب تک اس کا نمبر نہیں آیا۔ اتنے گھنٹوں میں پاس بیٹھی عورتوں نے ایک دوسرے کے حالیہ حالات سے لے کر شجرے تک کھنگال لیے، دس بار اٹھ کر کولر سے ٹھنڈا پانی نکال کر پی لیا اور آپس میں کئی بار چپس، چھالیا سونف وغیرہ کا تبادلہ تک کر لیا مگر اس کا وہ صرف نام ہی جان سکی تھیں، وہ بھی انتہائی کھردرے انداز میں اور بار بار پوچھے جانے پر۔

''شہوار۔'' اس کے بعد جو اس کے ہونٹوں کو گوند لگی تو پھر بینک آفیسر کے سامنے ہی جا کر اتری۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے شاید ابھی ابھی تیسری بار یہ کہا تھا۔

''تو میں آپ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا، جو بھی ہے آپ کے سامنے ہے۔'' وہ بھی کچھ چڑ سا گیا۔

''آپ کے شوہر اپنا اور آپ کا جوائنٹ اکاؤنٹ ختم کر کے گئے ہیں، سارا اماؤنٹ انہوں نے نکلوا لیا تھا، خود آپ کے سائن تھے چیک پر۔'' وہ ہر طرح سے تشفی کر رہا تھا۔

''پھر اتنا سارا پیسہ لے کر وہ کہاں چلے گئے، کہیں پتا نہیں ہے۔'' بینک آفیسر نے بہت ہمدردی سے شہوار کو دیکھا۔

''آپ کو پولیس میں رپورٹ کرانی چاہیے، یہاں تو چند روپوں پر قتل ہو جاتے ہیں، یہ تو ایک بہت بڑا اماؤنٹ ہے، اپنے کسی رشتے دار کی مدد لینی چاہیے آپ کو۔'' وہ بغیر کچھ کہے کاؤنٹر سے ہٹ آئی، بینک آفیسر نے تاسف سے سر ہلایا جب وہ ویل کم اسٹیٹ ایجنسی کے آفس کے سامنے..... تپتے ہوئے رکشے میں سے اتری تو اسے گرمی کی شدت کا اور بھی اندازہ ہوا، زمین بھی جیسے چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور چاروں طرف گہرا سناٹا۔

یہ موسم کا گرم ترین دن تھا اور شاید اس کے مقدر کا بھی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی اور اسٹیٹ ایجنسی کا مالک باہر شیڈ کے نیچے بیٹھا اخبار سے پنکھا جھل رہا تھا، اسے آتا دیکھتے ہی وہ اپنے پنکھے کی رفتار تیز کر چکا تھا اور نگاہوں کا رخ دوسری طرف۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''السلام علیکم۔'' شہوار نے ٹھیک اس کے سامنے جا کر کہا، تب اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے شہوار کی طرف دیکھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا تک گوارا نہیں کیا تھا، ورنہ پچھلے پورے ماہ جب وہ لوگ اس کے ساتھ گھر دیکھتے پھر رہے تھے تب اس کے اخلاق اور عمل کا دوسرا ہی انداز تھا۔

''وہ میرے شوہر اس دن آپ کے پاس گھر کی پے منٹ اور ایگریمنٹ کے لیے.....''

''اوہ بی بی!'' اس نے بات سنے بغیر اپنے ہاتھ جوڑ کر جس حقارت سے شہوار کو دیکھا تھا، شہوار کے بدترین خدشات کی بھی تصدیق ہوگئی۔

''آجاتے ہیں دوسرے کا بھی دماغ خراب کرنے، سیکڑوں روپے چائے پانی پر خرچ کیے، وقت الگ برباد، پارٹی تین گھنٹے انتظار میں بیٹھی رہی، جب لینا نہیں تھا تو خوامخواہ کا ڈراما کیوں کیا تھا۔'' جب تک وہ واپس رکشا میں بیٹھی وہ مستقل بولے گیا تھا۔

''بس اب ایک آخری جگہ، جہاں میں تنویر کا سراغ پا سکتی ہوں اس کے بعد کا منظر نامہ بالکل خالی۔'' شہوار نے خود اپنے آپ سے کہا۔ پرس میں اب صرف اتنے پیسے تھے جن میں وہ جہاں جا رہی تھی وہاں تک کا کرایہ تھا اور اگر تنویر وہاں بھی نہیں تھا تب کہیں بھی جانے کے لیے اس کے پاس صرف اپنی ٹانگوں کا سہارا تھا۔

بدحالی کا شکار دکھائی دیتی اس عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آج اسے نہ گھن آئی اور نہ ہی دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ چوتھی منزل تک پہنچنے تک اسے کئی عورتوں، مردوں نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ ''وہی ہے.....''

آخر وہ یہاں کچھ عرصے رہ چکی تھی، چاہے کسی نے اسے سلام دعا کے قابل بھی نہ سمجھا ہو مگر وہ لوگوں کی یادداشت میں تھی۔ فلیٹ کا دروازہ وہ کسی دیوانے کی طرح بغیر رکے بجائے چلی گئی۔ تب ہی کسی کو اس پر رحم آیا تھا۔

''وہ یہاں نہیں رہتے اب چلے گئے ہیں۔'' برابر والے فلیٹ کے دروازے سے ایک نوعمر سی لڑکی نے جھانک کر اطلاع دی۔

''کون چلے گئے ہیں؟''

''تنویر بھائی اور ان کے بیوی بچے، پانچ چھ دن ہو گئے اب تو ان کو گئے ہوئے بھی۔''

''تنویر کی بیوی!'' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے خود اپنے وجود پر نگاہ ڈالی۔ ''تو پھر میں کون ہوں؟''

''وہ سب لوگ چلے گئے ہیں پنجاب، کہہ رہے تھے کراچی اب رہنے کے قابل نہیں رہا ہے، روزانہ کے جھگڑے فساد ہیں یہاں، ہم تو اب یہاں پلٹ کر آنے والے بھی نہیں ہیں۔'' لڑکی اس کی خاموشی سے بے نیاز اپنی معلومات شیئر کرنے میں مصروف تھی، تب ہی شہوار تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

''اس بار ہرگز بھی نہیں، وہ حشر کروں گی تنویر کا کہ اس کے بیوی بچے تو کیا، خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکے گا۔'' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے جب وہ احاطے میں سے گزر رہی تھی تو ادھ کھلے بال اور ایک کندھے پر جھولتا ہوا دوپٹا کسی بڑے ذہنی انتشار کی نشاندہی کر رہے تھے مگر وہ سب سے بے نیاز آگے بڑھتی چلی گئی۔ احاطے کا زنگ خوردہ پھاٹک ہمیشہ کی طرح پورا کھلا پڑا تھا۔ ''اور اگر میں چلتی ہی جاؤں چلتی ہی جاؤں تو ضرور شام ڈھلے تک کسی منزل تک پہنچ سکتی ہوں۔'' باہر نکلتے ہوئے اس نے خود کو یاد دلایا تھا کہ کوئی اچانک سامنے آیا۔



''تم.....!'' وہ بری طرح چونکی تھی۔

''کہاں جانا ہے چلو میں چھوڑ دوں۔'' وہ مخصوص نرم گرفتاری۔

''کون یقین کرے گا کہ کبھی میں اس بے حد شاندار شخص کی بیوی تھی۔'' پچھتاوے کے اعصاب شکن احساس نے اسے نگاہ اٹھانے کے بھی قابل نہیں چھوڑا۔

''میں چلی جاؤں گی خود۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تم جا سکتی ہو؟'' وہ اس کے راستے سے ہٹا تب ہی شہوار کا بڑھتا ہوا قدم تھما تھا۔

''نہیں، اس لیے کہ میرے پاس رکشے کا کرایہ نہیں ہے۔'' سیف نے اندر ہی اندر خدا سے پناہ مانگی تھی۔ غرور اس کی ذات کے علاوہ بھلا کسے زیبا ہے اور اس کی زمین پر اکڑ کر چلنا بھلا کسے راس آیا ہے۔ اول فنا، آخر فنا۔ وہ اسے لے کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جانے پہچانے سے راستے سامنے آتے جا رہے تھے اور ان دونوں کے درمیان ایک لفظ بھی مزید کہا سنا نہیں گیا تھا، دونوں ہی نے ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن شہوار کی منزل کا تعین ابھی باقی تھا۔

''کہاں جاؤ گی؟'' سامنے سڑک پر نگاہ جمائے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

''صادق پیلس۔'' سکون کے ایک گہرے احساس نے سیف کو مطمئن کیا، شکر ہے جو وہ اب کسی اور آزمائش سے بچی۔

''بس یہیں باہر روک دو، اندر میں خود چلی جاؤں گی۔'' اس نے سیف سے گاڑی رکوائی تھی۔ سیف نے سامنے پھیلے لمبے سے ڈرائیوے کی طرف دیکھا۔

''میں چھوڑ دیتا ہوں اندر بہت چلنا پڑے گا تمہیں۔'' نہ جانے کتنے عرصے بعد وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

''بہت تو میں چل چکی ہوں سیف، یہ تو کوئی فاصلہ ہی نہیں، جاؤ تم واپس چلے جاؤ اور کوشش کرنا کہ آئندہ یہاں نہ آؤ یا کم از کم میری وجہ سے تمہیں نہ آنا پڑے۔'' گاڑی سے اتر کر اس نے بہت نرمی سے کہا اور آگے بڑھنے لگی تھی کہ کچھ یاد آیا۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا تم۔''

''تم بھی۔'' وہ اگر نہ کہتا تو شاید دل پر کوئی بوجھ سا رہ جاتا۔ شہوار نے دھیمے سے انداز میں سر کو جنبش دی اور اندر بڑھتی چلی گئی۔ سیف نے تیزی سے گاڑی کو ریورس کیا تھا۔

☆☆☆

کمرے میں صرف سمیعہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی گونج رہی تھی، باقی سب صرف شکل دیکھنے پر مامور تھے یا اس کی ہنسی کے ختم ہونے کے انتظار میں۔

''اب بس بھی کرو، کوئی زعفران کا کھیت تو دیکھ نہیں لیا، یوں باؤلوں کی طرح ہنسے ہی جا رہی ہو۔'' عارف کی اماں سخت بدمزہ ہوئی بیٹھی تھیں، پچھلے چار دن سے بلڈ پریشر تھا کہ نیچے آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اور سر درد سے پھٹا جاتا تھا۔

''یہاں تمہیں اپنا مذاق اڑوانے کے لیے نہیں بلایا ہے ہم نے، یہ رشتہ تم نے ہی طے کروایا تھا، اس شرط



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر کہ فلیٹ وہ مجھے سلامی میں دیں گے اور رجسٹری میرے نام پہلے ہی ہوگی۔ یہی کہا تھا نا!" ہارون کے سامنے بھیگی بلی بنا عارف اس وقت بالکل مختلف روپ میں تھا۔

"بالکل کہا تھا۔ اور میں نے بات کروا بھی دی تھی تم لوگوں کی، اس کے بعد کیوں ہارون اپنی بات سے پلٹا ہے یہ تم جانتے ہو گے یا پھر وہ لوگ، میرا کوئی بیچ نہیں ہے اب تم لوگوں کے درمیان۔" وہ تھوڑی سی غصے میں آنے لگی، پچھلے کچھ عرصے سے اسے اپنے نظرانداز ہونے کا بھی قلق تھا اور عارف اینڈ فیملی کی مستقل کامیابیوں کا بھی سو آج دونوں ہی حساب برابر ہوئے تھے۔

"دیکھو سمیعہ، میں نے سوچا تھا کہ کچھ عرصے یہاں رہ کر اماں اور رخشی کو روما کے سپرد کروں گا اور خود لگاؤں گا یورپ کا چکر، وہاں سیٹ ہونے کی کوشش کروں گا تو اس کے لیے تو ہاتھ میں پیسے چاہئیں نا، یہاں تو پانچ سال تک کے لیے ہر شے پر تالا لگ گیا ہے اور تو اور اپنے ہاں کی نوکری بھی نہیں کہ ذرا آفیسری کا ہی مزہ لے لیتے، مقدر میں وہی کلرکی، مجھے تو اب کچھ بھی نہیں مل رہا، سوائے اس بدشکل لڑکی کے، جس کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" گلی میں کھلنے والے دروازے سے اندر آنے والا جیسے وہیں صحن میں جما کھڑا تھا۔

"مت دیکھنا شکل، پڑی رہے گی ایک کونے میں، ویسے بھی زندگی ایسے ہی گزری ہے اس کی، عادی ہے یونہی گھٹ گھٹ کر جینے کی، کوئی فرق نہیں پڑے گا اسے۔" بہت مانوس آواز، تنگ دل اور حسد میں ڈوبا لہجہ۔

"مگر یہ پیسے کا معاملہ تو حل کرواؤ، میں صاف کہہ رہا ہوں خالی اس بڑے گھر میں رہنے کی کوئی حسرت نہیں ہے مجھے، تھوکتا ہوں ہزار بار ایسے گھروں پر، مجھے تو کیش چاہیے کیش، ورنہ مجھ جیسا حسن پرست آدمی اس لڑکی سے شادی پر راضی ہوتا جو کسی کو بھی پسند نہیں آتی تھی۔" ان کے گھر میں آئینوں کی سخت کمی تھی۔

"مت کرو شادی، منع کر دو، کوئی زبردستی تھوڑی ہے، ہو سکتا ہے ہارون دباؤ میں آکر مان جائے پھر سے۔" سمیعہ نے کولڈ ڈرنک کا گلاس لبوں سے لگایا۔ آج یہاں بہت دن بعد اس کی مدارات کے لیے کم از کم اتنا تردد تو کر ہی لیا گیا تھا۔ عارف کی اماں نے بے ساختہ ہی سینے پر ہاتھ رکھا۔

"اور جو نہ مانے تو، پاگل ہو گئے ہو کیا سارے، میں نہیں رہنے کی اب یہاں اس ڈربے میں، اب اس عمر میں اللہ عیش کے دن دکھا رہا ہے تو کیوں نہ دیکھیں، جا بھئی جا، ہم سے غلطی ہو گئی جو تجھے مشورے کے لیے بلا لیا۔" انہوں نے بدلحاظی کی حد پار کی مگر آج اسے کچھ بھی برا نہیں لگا تھا، مزے سے ہنسے گئی۔

"تو پھر کیا کہوں خالہ، بے وقوفی کی باتیں آپ لوگ کر رہے ہیں اور مشورہ مجھ سے طلب کر رہے ہیں! اس عارف میں اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ بیوی کے گلے پر ہاتھ رکھ کر بعد میں وہ دستخط ہی کروا لے دو چار کاغذوں پر، کون پوچھ سکتا ہے بعد میں، حد ہے ایمان سے ارے ہونے دو ابھی جو ہو رہا ہے کیوں اپنا تاثر خراب کر رہے ہو؟" وہ کچھ ناراض سی ہو کر اٹھنے لگی تھی مگر اندر ایک بڑا ناخوشگوار سا ہنگامہ جاگنے لگا تھا۔

دہلیز پر کھڑی زارا بے آواز قدموں سے واپس مڑی تھی، اس کا پورا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے آتا دیکھ کر تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا، زارا بالکل بے جان سے انداز میں گاڑی کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ)



# چلیں گے ساتھ مل کر ہم

عمرہ عالم

کچھ گھریلو حالات اور کچھ بہنوں کے مسائل نے اسے خاصا چڑچڑا اور مردوں کی ذات سے متنفر کر دیا تھا۔ بڑی دونوں بہنیں شادی شدہ تھیں ایک تین بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم کی سزا کاٹ رہی تھی اور دوسری بے اولادی کا جرم سہہ رہی تھی۔ یہ قدرتی عوامل ان دونوں کے لیے جرم اور گناہ بن گئے تھے جو انہوں نے نہیں کیے تھے لیکن پھر بھی مجرم بن کر سزا کاٹ رہی تھیں۔ ایسے ام ... جن پر بندہ اں ...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دسترس نہیں ہوتی ہے وہ یہاں بے بس ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ ربیعہ اور شافیہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ یہاں نہ وہ خود اپنی مدد کر سکتی تھیں اور نہ ماں بہن بلکہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان معاملات کو اُن کے لیے جرم اور سزا بنایا تھا وہی ان کے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ پتا نہیں اولاد اور بیٹا، بیٹی کے معاملات میں ان مردوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ اکثر بہت پڑھے لکھے مردوں کی عقل بھی یہاں آ کر پٹ ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رضا میں راضی ہونے کے بجائے وہ بیوی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ وہ خود بھی اس کام میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ مجبور اور شریف عورتیں آسانی سے اپنا جرم قبول کر لیتی ہیں، مرد انہیں ڈرانے، دبانے اور مجرم ثابت کرنے کے لیے اپنا سب سے طاقتور ہتھیار طلاق یا اس کی دھمکی استعمال کرتے ہیں اور جن عورتوں کی پشت طاقتور ہوتی ہے وہ شوہر کے گھر میں رہ کر اپنا دفاع کرتی رہتی ہیں۔ اریکہ نے اپنے حقوق کی جنگ، لڑنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔

انہی سب حالات نے اریکہ کو شادی اور مردوں سے بددل اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ آج کل پھر اس کا ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہوا تھا۔ احتشام احمد امیر کبیر آدمی تھے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے پہلی بیوی کو چھوڑ چکے تھے۔

''دیکھو اریکہ، تمہارا خوف تمہاری بے وقوفی اور نادانی ہے۔ سب مرد ایسے نہیں ہوتے ہیں۔''

''لیکن آپ کی بیٹیوں کی قسمت میں ایسے ہی مرد ہیں اگر تیسرے میں کوئی اچھائی ہوگی بھی تو ان دونوں کو دیکھ کر ختم ہو جائے گی۔''

''اصل میں ان دونوں کو دیکھ کر تم اس قدر ڈر گئی ہو کہ ہر مرد تمہیں انہی جیسا لگنے لگا ہے۔''

''امی مرد کو آزمانے کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے احکامات کو جھٹلاتا ہے۔ بیٹا، بیٹی اور اولاد تو اللہ تعالیٰ کے کام ہیں۔ عورت تو مرد کی عزت ہوتی ہے جو مرد قدرتی عوامل پر اپنی عورت کی دھجیاں بکھیرتا ہے وہ تو نہ مرد کہلانے کا مستحق ہے اور نہ کسی طرح انسانیت کے درجے پر فائز ہے اور احتشام احمد اولاد نہ ہونے کی بنا پر ایک عورت پر یہ ظلم کر چکے ہیں۔''

''مرد کو اللہ تعالیٰ نے عورت سے زیادہ طاقتور بنایا ہے۔ اس کا رتبہ بھی عورت سے بلند رکھا ہے۔ بہت سے مرد اپنی بڑائی کے زعم میں اللہ اور رسول کے احکامات کو فراموش کر دیتے ہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ جو دبتا ہے اسے دبایا بھی خوب جاتا ہے لیکن پھر بھی میں احتشام کے ساتھ شادی پر زور نہیں دوں گی اگر تمہارے نصیب میں اولاد ہوگی تو وہ کسی بھی مرد سے شادی ہو کے تمہیں مل جائے گی۔''

''امی میں اللہ کی رضا میں راضی رہنے والی اس کی ادنیٰ سی بندی ہوں آپ انہیں ہاں کر دیں۔''

☆☆☆

''میں بہت اصول پسند آدمی ہوں۔'' احتشام احمد دلہن بنی اریکہ کے سامنے اپنے اصول بتا رہے تھے۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، میں بھی اصولوں پر ہی زندگی گزارنے کی قائل ہوں، انسان کا ضابطۂ حیات ضرور ہونا چاہیے ورنہ تو انسان اور جانور میں فرق ہی نہیں رہے گا۔'' احتشام احمد چونک کے اس کی شکل تکنے لگے۔ نئی نویلی دلہن کی طرف سے انہیں ایسے کڑکتے ہوئے جواب کی امید ہرگز نہیں تھی۔

شادی کے بعد بہت سے لوگوں نے ان کی دعوت کی، ان کی جوڑی کو سراہا گیا حالانکہ وہ احتشام سے چودہ سال چھوٹی تھی لیکن پھر بھی اُن کے ساتھ بہت جچ رہی تھی۔



رات کو کھانے سے فارغ ہو کے احتشام بیڈروم میں آئے تو اریکہ بھی پانی کا جگ گلاس لے کر آ گئی۔

''اگر آپ ہنی مون پر جانے کا سوچ رہی ہیں تو میرے لیے یہ بالکل ممکن نہیں ہے۔''

''آپ میری سوچوں پر الزام لگانے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتے، میں تو ہنی مون پر جانے کے سخت خلاف ہوں پھر آپ نے کیسے اپنی طرف سے میرے لیے یہ بات کہہ دی۔ پلیز آئندہ ایسا مت کیجیے گا جو کام میں نے کیا نہیں ہے اور جو بات میں نے کہی نہیں ہے وہ میں اپنے لیے مفروضے کے طور پر بھی نہیں سننا چاہتی ہوں اور ویسے بھی ہنی مون پہلی شادی کا چونچلا تو ہو سکتا ہے، ہر شادی کا نہیں۔'' اس نے چلچلاتا ہوا مفصل جواب دیا اور جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی اور احتشام احمد منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اس کی پشت تکتے چلے گئے اور جب سگریٹ ختم ہو کے انگلیوں تک پہنچی تو وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئے۔

☆☆☆

امی اریکہ کی شادی سے خاصی مطمئن تھیں انہیں احتشام کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی اور وہ بھی ہر بات امی تک نہیں پہنچاتی تھی۔

''آپ نے جاب سے ریزائن کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''ہماری شادی اسی بات پر ہوئی تھی کہ میں بعد میں جاب نہیں چھوڑوں گی۔'' اریکہ نے سختی سے کہا۔

''مجھے یاد ہے یہ بات... لیکن آپ کو یہاں کس چیز کی کمی ہے؟''

''اگر ہمارے بچے نہیں ہوئے تو پھر ہمیں اپنے راستے تو الگ کرنے ہوں گے ناں یہاں تو میرا کچھ نہیں ہے سب آپ کا ہے اور آپ کی کسی چیز پر میرا کوئی حق نہیں ہوگا پھر مجھے اپنی جاب کے سہارے ہی زندگی گزارنی ہوگی۔''

''آپ نے ایسا کیوں سوچا؟''

''ایسا ہی ہوگا، بچے ہوئے تو ویل اینڈ گڈ اور نہیں ہوئے تو دونوں الگ الگ... اگر میں آپ کو بچہ نہیں دے سکی تو آپ کی مرضی ہے کہ آپ مجھے رکھیں یا چھوڑ دیں لیکن اگر آپ کی طرف سے کوئی کمی ہوئی تو میں ضرور آپ کو چھوڑ دوں گی۔'' احتشام احمد جیسے آسمان سے زمین پر گرے ان کا وجود جھٹکوں کی زد میں آ گیا۔

''اگر میں تمہیں طلاق نہ دینا چاہوں تو...؟'' گھٹی ہوئی آواز اُن کے گلے سے برآمد ہوئی۔

''میں آپ سے طلاق مانگوں گی بھی نہیں، میرے پاس خلع کا اختیار ہے، میں اپنا وہ حق استعمال کروں گی۔'' احتشام کو لگا ان کے وجود پر کسی نے بلڈوزر پھیر دیا، وہ خود کو سینے سنبھالنے میں لگ گئے اور وہ حسینہ انہیں قتل کر کے یہ جا وہ جا۔

☆☆☆

پھر کئی دن تک ان دونوں کے درمیان کھل کر ڈھنگ سے کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔

''میں نے اس دن آپ سے نوکری سے ریزائن کرنے کے لیے کہا تھا ہسبینڈ ریزائن کرنے کے لیے نہیں، آپ تو ہسبینڈ ریزائن کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔'' آج کئی دن بعد انہوں نے اسے پکڑ لیا۔

''ایسا نہیں ہے لیکن فی الحال آپ مجھے نوکری چھوڑنے پر مجبور نہ کریں، ویسے بھی فی الحال میں چھٹی پر ہوں۔'' احتشام خاموش ہو گئے اس نے ان کی ذات پر جو کئی تابڑ توڑ حملے کیے تھے انہیں دیکھتے ہوئے فی الحال خاموشی ہی بہتر تھی۔

اریکہ کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو اس نے دوبارہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسکول جوائن کرلیا۔ رات کو اریکہ تمام کاموں سے فارغ ہو کے بیڈ روم میں آئی تو احتشام پہلے سے موجود تھے۔

''ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا ہے، سالگرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''بیکار کی باتیں ہیں یہ سب۔'' اریکہ نے بیزاری سے کہا۔

''ہوں، خیال تو میرا بھی یہی ہے، دراصل ہماری زندگی میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی کوئی ہلہ گلہ نہیں ہوا تو میں نے سوچا اسی طرح کچھ انجوائے کیا جائے۔''

''یہ تبدیلی اور ہلا گلا تو چند گھنٹوں کا ہوتا ہے اس کے بعد زندگی پھر اسی ڈگر پر آجاتی ہے۔ آپ کس تبدیلی کی بات کررہے ہیں؟'' اریکہ بہت حد تک ان کی بات کا مفہوم سمجھ چکی تھی۔

آخر وہ لمحہ آگیا جس کی وہ کافی دن سے منتظر تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم کسی لیڈی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرالو۔'' انہوں نے اصل بات بالآخر کہہ ہی دی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر تیزی سے کہا۔

''جبھی تم ابھی تک ماں نہیں بن سکی ہو۔''

''ابھی تک تو آپ بھی باپ نہیں بن سکے ہیں۔'' احتشام چونک کے آنکھیں پھاڑے اس کی شکل تکنے لگے۔

''جب آپ نے اپنا چیک اپ کرایا تو کیا رزلٹ آیا؟''

''میں کیوں اپنا چیک اپ کراتا؟'' انہوں نے تلملا کر جواب دیا۔

''جس بات کے لیے آپ میرا چیک اپ کرا رہے ہیں، دونوں کا چیک اپ ہونے سے ہی صحیح بات پتا چلے گی۔''

''پرابلم ہمیشہ عورتوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔'' انہوں نے کچھ چڑ کر، کچھ جل کر کہا۔

''نہیں، تخلیق مشق ہمیشہ عورتوں کو بنایا جاتا ہے جیسے بچہ پیدا کرنے کے ذمے دار دونوں ہوتے ہیں اسی طرح پرابلم بھی دونوں میں ہی ہوتا ہے۔'' اریکہ نے خاصی تلخی سے ان کے کانوں میں سچائی انڈیلی۔

''بہرحال میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، میں نے ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے کل تم چلی جانا۔''

''جیسے آپ بغیر چیک اپ کے خود کو صحیح سمجھ رہے ہیں بالکل اسی طرح میں بھی سمجھ رہی ہوں۔ چیک اپ ہوگا تو دونوں کا ورنہ ایک کا بھی نہیں۔ جس کام کے دونوں ذمے دار ہیں اس میں پکڑ بھی دونوں کی ہوگی۔ میں دونوں طرف سے مکمل بات جاننا چاہتی ہوں ادھوری نہیں، آپ کیوں خوف زدہ ہیں؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے خوفزدہ ہونے کی۔''

انہوں نے چڑ کے کہا، وہ تو اریکہ کو ایسا کھرا سمجھتے ہی نہیں تھے۔

''آپ تو بہت اصول پسند آدمی ہیں، یہ کیسے اصول ہیں آپ کے جن پر آپ خود ہی عمل نہیں کرنا چاہ رہے ہیں تو میں کیسے کرسکتی ہوں۔ آپ کی جو بات آپ کو اپنے لیے پسند نہیں ہے وہ مجھے کیسے پسند آسکتی ہے۔ آپ کے اصول آپ کے اور میرے لیے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن میرے اصول ہم دونوں کے لیے ایک جیسے ہیں۔'' وہ انہیں سناٹے میں چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

انہیں اندازہ ہوگیا کہ یہ لڑکی آسانی سے ان کے آگے دبنے اور جھکنے والی نہیں ہے۔ انہوں نے



پہلی بیوی کو دو سال بعد اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ علاج کے باوجود وہ ماں نہیں بن سکی۔ چیک اپ والا تو کوئی معاملہ ہی نہیں آیا تھا۔ انہوں نے اپنے بارے میں تو کچھ سوچا ہی نہیں تھا، یہ بھی ابھی تک ماں نہیں بن سکی ہے تو کیا اُن میں ہی کوئی کمی ہے کہیں سے ایک صدا ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''نہیں، نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔'' انہوں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''یہ مسائل تو ہمیشہ خواتین میں ہی ہوتے ہیں۔'' انہوں نے تو کبھی کسی مرد کا علاج ہوتے ہوئے نہ دیکھا نہ سنا۔ اس لڑکی نے تو ایک ہی سال میں ان کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔

''اگر میں اپنا چیک اپ نہیں کراؤں گا تو شاید وہ بھی نہیں کرائے گی... چلو یہ تجربہ بھی سہی ویسے بھی میں تو نارمل ہی ہوں، اس کی یہ ضد بھی مان لیتا ہوں۔''

پھر دونوں نے اپنا چیک اپ کرالیا۔

رپورٹ تین دن بعد ملنی تھی، ان تین دنوں میں دونوں ایک دوسرے کے اوپر اپنا اطمینان ظاہر کرتے رہے اور آج دونوں رپورٹ لیے ڈاکٹر شازیہ کے کلینک پہنچ گئے۔

''یہ آپ دونوں کی رپورٹس ہیں۔'' ڈاکٹر نے دو لفافے احتشام کی طرف بڑھائے۔

''آپ بتا دیجیے ڈاکٹر، میں اپنی بیوی کی طرف سے ہر بات سننے کو تیار ہوں، میں ایک دفعہ پہلے بھی اس قسم کے تلخ تجربے سے گزر چکا ہوں۔'' احتشام نہایت بیزاری اور اکتاہٹ سے کہا۔

''احتشام صاحب صرف بیگم کی طرف سے نہیں بلکہ آپ کو اپنے لیے بھی سننا ہے، دونوں کا چیک اپ ہوا ہے دونوں کی رپورٹیں آئی ہیں۔ احتشام صاحب آپ کی بیگم بالکل نارمل ہیں۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نارمل ہیں تو پھر اب تک ہمارے یہاں کوئی خوش خبری کیوں نہیں نظر آئی۔'' احتشام نے تیزی سے پہلو بدلا۔

''خوش خبری کبھی نظر آئے گی بھی نہیں۔'' ڈاکٹر نے نہایت سہولت سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' احتشام کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

''احتشام صاحب آپ باپ نہیں بن سکتے ہیں۔''

وات، وات ڈو یو مین ڈاکٹر۔'' احتشام کو جھٹکا لگا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں غور سے دیکھیے رپورٹ پر نام تبدیل ہوگئے ہوں گے۔'' احتشام نے کچھ تیزی اور غصے سے کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا، آپ چاہیں تو کہیں اور سے ٹیسٹ کروا سکتے ہیں۔''

''یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔'' ان سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی، رپورٹ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئے۔

اریکہ شادی کے سات ماہ بعد ہی اپنا ٹیسٹ کروا چکی تھی اسے اسی وقت اپنے نارمل ہونے کا پتا چل چکا تھا لیکن وہ اس لمحے کے انتظار میں خاموش بیٹھی تھی پھر احتشام نے مزید کئی جگہ سے دونوں کے ٹیسٹ کروائے ہر جگہ سے ایک ہی رپورٹ ملی۔ احتشام بدحواس ہو چکے تھے۔ جو انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا وہ ہو گیا تھا۔ بیویوں کے ساتھ ہونے والی بات ان کے ساتھ ہو چکی تھی۔

''میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''کیا.....'' احتشام دھک سے رہ گئے۔ ''یہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' ان کی پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

''اپنے گھر میں اولاد نہ ہونے پر آپ اپنی پہلی بیوی کو نکال چکے ہیں، اولاد اب بھی نہیں ہو سکتی ہے پھر ہمارے ایک ساتھ رہنے کا کیا جواز ہے۔''

''تو کیا تم مجھے اس بات پر چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟'' انہوں نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

''اس بات پر آپ نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا تھا، میں اپنا شوہر چھوڑ دوں گی تو کیا بری بات ہے، یہ اصول تو میں نے آپ سے ہی سیکھا ہے۔''

''قدرت کے اس کام میں، میں بالکل بے بس ہوں۔'' احتشام نے شکستگی سے کہا۔

''بیوی چھوڑنے کے معاملے میں تو آپ بے بس نہیں تھے وہ تو آپ کے اختیار میں تھا۔''

''میں نے اس وقت اپنا چیک اپ نہیں کروایا تھا۔'' انہوں نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''چیک اپ تو آپ نے اس کا بھی نہیں کروایا تھا اور ایک بے قصور عورت کو پوری بات جانے بغیر گھر سے نکال دیا۔''

''ہاں، میں اس کا گناہ گار ہوں لیکن اریکہ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ، میں کیسے تنہا جی پاؤں گا۔ میری زندگی میں تو اب تمہارے دم سے ہی اجالا ہے تم میرے اس اجاڑ گھر کا دیا ہو۔ ضروری تو نہیں ہے کہ مجھے چھوڑ کر تم کسی اور کو اپناؤ تو وہاں اولاد ہو جائے۔'' چھوڑنے کے نام پر اریکہ کے دل پر دھچکا سا پڑا وہ تو اس متکبر بت کا تکبر توڑنا چاہتی تھی جو اس وقت پاش پاش ہو کے اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا تھا... ورنہ اسے کہاں جانا تھا۔ جینا مرنا اب یہیں تھا۔ اس نے ان کے آنسو صاف کیے ان کے ہاتھوں کو چوما اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے زندگی بھر ساتھ رہنے کی مہر ثبت کر دی۔

آنکھ کھلتے ہی اسے چاروں طرف پھیلی روشنی کا احساس ہوا تو اس نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے مقررہ وقت سے دس منٹ بعد جاگی تھی۔ ہڑبڑا کر بستر چھوڑتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک سی گئی، روزانہ کے معمول کے مطابق فضا میں چڑیوں کی چہکار اور سویرے سویرے آنے والی اسکول وین کے مختلف قسم کے ہارن کی آوازوں کے باوجود ایک مہیب سا سناٹا ہر جانب چھایا ہوا تھا،

# جینا ہے

[illegible]



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے سرگوشیوں میں گزرے ہوئے سانحے کا ماتم کررہے تھے۔ صحن میں لگا ہوا نیم کا درخت سر نہوڑائے جیسے اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ اِک ویرانی سی ویرانی تھی..... اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس کیفیت سے باہر لانا چاہا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ پوری رات بے چینی میں کٹی تھی۔ سارے دن کی تھکن سے چور چور جسم پر بھی نیند غلبہ پالیتی مگر کچھ ہی دیر گزرتی کہ کوئی بے رحم ہاتھ جھنجھوڑ کر جگا دیتا اور نظروں کے سامنے وہی چہرہ آجاتا..... وہی کشادہ پیشانی، سیاہ بال جن میں ہلکی سی نمی اس وقت بھی موجود تھی، گھنی پلکوں والی بند آنکھیں جن کی چمک ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھی بھر بھرے لب، سفید رنگت میں گھلی زردی جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو مگر اس کے باوجود چہرے پر چھایا دائمی سکون، ایسا سکون جو دنیا کی تمام الجھنوں سے نجات مل جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے اور الجھنوں سے نجات تو اسے مل ہی گئی تھی مگر سکون ملا تھا یا نہیں اس کا جواب اب کون دیتا۔

''جلدی کرو بھئی، ابھی تک بچے تیار نہیں ہوئے؟'' مدثر کی آواز پر اس نے گھبرا کر جلدی جلدی روا کے بالوں کی پونی بنا کر حسن کے بالوں میں برش کیا اور کچن سے دونوں کے لنچ باکس لا کر ان کے بیگ میں رکھے۔ دونوں بچے تیار ہو چکے تھے مدثر انہیں اسکول چھوڑنے چلے گئے تو اس نے دوبارہ کچن کا رخ کیا۔ ابھی مدثر کے لیے ناشتا بنانا تھا اور پھر ان کا لنچ پیک کرنا تھا۔ خود اس کا تو کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ناشتا تو اس نے کئی دنوں سے چھوڑا ہوا تھا۔ صبح اٹھ کر طبیعت ہی ایسی ہوتی تھی کہ کھانے کی کسی چیز پر نظر ڈالنا بھی مشکل ہوتا تھا۔

مدثر دونوں بچوں کو اسکول پہنچا کر آئے تو اُن کا ناشتا تیار تھا۔ چائے کا کپ اُن کے سامنے رکھ کر وہ بچوں کے کپڑے سمیٹنے میں لگ گئی۔

''تمہارے پاس دو سو روپے ہوں گے؟'' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بالوں میں برش کرتے ہوئے مدثر نے بہت آہستگی سے پوچھا تھا، بیڈ کی چادر کی شکنیں درست کرتے اس کے ہاتھ ایک دم ساکت ہوگئے اور جواب دینے کے بجائے اس نے پلٹ کر مدثر کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر گہری شرمندگی کے آثار تھے۔

''وہ دراصل کل اتنی جگہ جانا پڑا کہ بائک میں پیٹرول ختم ہوگیا۔'' انہوں نے جیسے صفائی دینے کی کوشش کی مگر وہ اب بھی کچھ کہے بنا الماری کی طرف بڑھ گئی اور اپنے پرس میں سے آخری پانچ سو کا نوٹ نکال کر مدثر کی طرف بڑھا دیا۔

''میں باقی کے تین سو روپے شام کو واپس کردوں گا۔'' بڑے بجھے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھے جہاں لمحہ بھر رک کر دھیرے سے خدا حافظ کہا اور باہر نکل گئے۔ دل ہی دل میں انہیں اللہ کے سپرد کر کے وہ بوجھل دل کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بائک اسٹارٹ ہونے اور بیرونی گیٹ بند ہونے کی آواز تک وہ یونہی بیٹھی رہی پھر تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو ایک تواتر سے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

☆☆☆

دس سال پہلے مدثر سے شادی کے بعد جب وہ ملتان سے کراچی جیسے بڑے شہر کے اس چھوٹے سے محلے میں آئی تھی تو وہ زین ہی تھا جو ہر وقت بھابی، بھابی کرتے ہوئے اس کے گرد رہتا تھا۔ ان دنوں وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور اس کے



پاس کوئی اور مصروفیت نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ ہر تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی بہانے سے اُن کے گھر آجاتا اور اپنی دلچسپ باتوں سے اس کا دل بہلائے رکھتا ورنہ مدثر تو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور وہ جیسے بھرے پرے گھر سے آئی تھی اگر زین نہ ہوتا تو بیمار اور خاموش طبیعت ساس کے ساتھ دن کاٹنا کس قدر مشکل ہوجاتا۔

متوسط طبقے کی زندگی کے لیے بڑے محدود سے مطالبات ہوتے ہیں۔ خوبیوں اور خامیوں کا ایک مخصوص دائرہ جس کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس کی شادی بھی ان ہی خوبیوں کے معیار کے تحت ہوئی تھی۔ مدثر تعلیم یافتہ اور خوش شکل تو تھے ہی مگر مناسب ذریعۂ آمدنی کے ساتھ ان کا اکلوتا ہونا سب سے بڑی خوبی تھی۔ ماں باپ کے نزدیک ان کی بیٹی کے لیے نہ تندوں کا بکھیڑا تھا نہ دیور جیٹھ کی پریشانی بس ساس سسر تھے جن کو ظاہر ہے ہمیشہ نہیں رہنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اضافی خوبی یہ تھی کہ سسر کی پنشن آتی تھی اور ان کے اخراجات کی ذمے داری بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔

ایک سو بیس گز پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہنے والے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کبھی چاہ کر اور کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی شریک ہوجاتے ہیں اور زین کا گھر تو اُن سے بس ایک دیوار کے فاصلے پر تھا لہٰذا ان دونوں گھروں میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی بات ایک دوسرے کے علم میں آئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ زین کی امی نفیسہ بیگم خوش اخلاق اور سلیقہ شعار خاتون تھیں مگر ان خوبیوں کے ساتھ ہی ان کے مزاج میں خود پسندی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی رائے کو بہترین اور اپنے فیصلے کو آخری سمجھنا ان کی وہ کمزوری تھی جسے اگر نظر انداز کردیا جاتا تو وہ محبت کرنے اور وقت پر کام آنے کی وجہ سے نہ صرف اچھی پڑوسن بلکہ ہمدرد خاتون تھیں۔ ان کے چاروں بچے ان کی دی ہوئی تربیت کا بہترین نمونہ تھے۔ دونوں بیٹیاں حنا اور ثنا کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ زین نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور نومی آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ نفیسہ بیگم کی تربیت میں سختی کا عنصر غالب تھا شاید اسی وجہ سے زین اپنے مزاج کی شوخی اور عمر کے کھلنڈرے پن کا مظاہرہ اپنے گھر میں کم ہی کرتا تھا مگر ان کے گھر آکر خوب چٹکلے چھوڑتا اور ان کے گھر کا خاموش ماحول پل بھر میں بدل کر رکھ دیتا تھا۔

وقت اور ماحول تو پل پل بدلتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی یہ بدلاؤ بڑی جلدی آتے تھے۔ شادی جس کے معنی اور مفہوم ہی خوشیوں سے وابستہ ہوتے ہیں اور لڑکیاں تو عام طور پر بس یہی خواب آنکھوں میں سجا کر سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں کہ اب ان کی زندگی نئی اور انوکھی خوشیوں سے عبارت ہوگی تو اس نے بھی کچھ ایسا ہی سوچا تھا اور شادی کے بعد..... چند مہینے اسی طور سے گزرے کہ اس کے لبوں پر ہر لمحے مسکراہٹ رہتی اور آنکھوں میں آنے والے دنوں کے خوابوں کی جگمگاہٹ..... مگر وقت نے بڑے غیر محسوس انداز میں لبوں سے مسکراہٹ چھین کر آنکھوں میں کچھ ایسی دھندلاہٹ بھر دی کہ مستقبل کے سارے رنگ کہر میں گم ہوگئے۔

☆☆☆

ابا کو کئی دنوں سے نیند نہیں آرہی تھی۔ مدثر نے کہا بھی کہ ڈاکٹر کے پاس چلے چلیں مگر انہوں نے اگلے دن پر ٹال دیا اور پھر اس رات وہ ایسے سوئے کہ صبح مدثر کے جھنجھوڑنے پر بھی نہیں جاگے..... اماں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ان کی اچانک موت کا اس قدر صدمہ لیا کہ ان کی تمام تکلیفوں میں شدت آگئی۔ یہ وہ دن تھے جب اسے گھر میں ایک ننھے وجود کی آمد کی نوید ملی تھی۔ ابا کی موت اور اماں کی بیماری کی وجہ سے گھر میں ہر وقت رشتے داروں کی آمد و رفت کا سلسلہ رہتا، اماں کی دوا اور غذا کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ہر وقت کی مہمانداری اسے تھکا دیتی مگر وہ وقت ایسا تھا کہ وہ کوئی حرفِ شکایت بھی زبان پر نہیں لا سکتی تھی مگر اسے کیا پتا تھا کہ یہ خاموشی اس کا کتنا بڑا نقصان کر دے گی۔ ہر وقت رہنے والے درد کو وہ دن رات کی بے آرامی کا نتیجہ سمجھتی رہی اور ننھا مہمان اس کی گود میں آئے بغیر ہی دنیا سے منہ موڑ گیا۔

خالی گود اور بھرے دل کے ساتھ جب وہ اسپتال سے گھر واپس آئی تو نفیسہ بیگم ہی تھیں جو اسے سہارا دے کر کمرے تک لے گئی تھیں اور جب وہ بلک بلک کر روئی تھی تو اس کا سر اپنے کاندھے سے لگائے بس خاموشی سے اسے تھپکتی رہی تھیں اور ان کی یہ خاموش دلجوئی تھی جو آہستہ آہستہ طاقت بن کر اس کے وجود میں سرایت کر گئی اور اس میں اتنی ہمت آگئی کہ وہ اگلے ہی دن سے روزمرہ کے معمولات میں لگ گئی۔ حالانکہ اس کی حالت کے پیشِ نظر نفیسہ بیگم روز ہی آجاتی تھیں اور چھوٹے چھوٹے کئی کام نمٹا دیتی تھیں مگر گھر کی ذمے داری تو بہرحال اس کی ہی تھی۔

باپ کی اچانک موت کا غم، ماں کی بیماری اور اخراجات کی زیادتی نے مدثر کو ذہنی طور پر اس قدر تھکا ڈالا تھا کہ وہ آنے والی خوشی کے چھن جانے پر شریکِ زندگی کی حیثیت سے اسے تسلی بھی نہ دے سکے۔ وہ دونوں اپنا غم الگ الگ ہی سہتے رہے تمام تر محبت اور قربت کے باوجود ایک دیوار سی ان کے درمیان حائل ہوتی گئی اور چند ماہ کا ساتھ برسوں پرانے بے رنگ اور بے کیف ازدواجی زندگی کا عکس بن کر رہ گیا۔

☆☆☆

دو سال کیسے گزرے پتا نہیں چلا۔ اماں کی حالت ایسی تھی کہ جب لاکھ محبت اور پریشانی کے باوجود چاہنے والے مشکل آسان ہونے کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔ نیم دلی سے مانگی گئی دعاؤں کا اثر تھا یا اُن کا وقت پورا ہو گیا تھا برستی بارش کی سرد رات اپنے ساتھ اُن کی زندگی بھی لے گئی۔ اماں کیا گئیں اسے ایسا لگا جیسے دنیا کے سارے کام اچانک نمٹ گئے ہوں۔ مدثر کے آفس جانے کے بعد وہ سارے گھر میں بولائی بولائی سی پھرتی، شادی کے بعد تین سال تک مسلسل مصروفیت اور ذمے داری کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے وہ اس بوجھ کی اس حد تک عادی ہو چکی تھی کہ اب اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے زندگی خالی خالی سی ہو گئی ہو۔ گھر کو نئے سرے سے ترتیب دینے میں بھی چند دن ہی لگے پھر اس کے بعد پہاڑ سا دن کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ شام ڈھلے مدثر آفس سے لوٹ کر آتے مگر گزرے وقت نے ان کے رشتے کی ساری خوب صورتی چھین لی تھی وہ اگر گھر میں موجود ہوتے بھی تھے تو ان کے درمیان ضرورت کے چند جملوں کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اور بات ہوتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے روزمرہ کے معمولات کسی روبوٹ کی طرح انجام دے کر کسی اور غیر دلچسپ مشغلے میں وقت کاٹنے کی کوشش کرتے۔

نفیسہ بیگم دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیتیں اور کبھی حنا اور ثنا کو بھیج دیتیں۔ زین اب ان کے گھر کم کم ہی آتا، وہ بھی مدثر کی موجودگی میں مگر اب بھی اس کی شوخیاں ان دونوں کے ہنسی سے نا آشنا لبوں کو



مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ اسے تو وہ بالکل اپنے بھائیوں کی طرح پیارا تھا۔ اس کے مستقبل کے عزائم کے بارے میں سن کر وہ اسی طرح خوش ہوتی جیسے اپنے بھائیوں کی ترقی اور خوش حالی کی خبر سن کر ہوتی تھی۔

''بھابی آپ دیکھیے گا میں چند سالوں میں ہی اس قابل ہو جاؤں گا کہ ہم اس چھوٹے سے گھر کو چھوڑ کر کسی اچھی سی جگہ پر بڑا سا گھر بنوا سکیں گے۔ جس میں ایک خوب صورت سا لان ہوگا اور جس کا کچن اتنا بڑا ہوگا کہ ہم اس میں چار کرسیوں والی ٹیبل رکھ سکیں۔''

''پھر تو تم ہم سے دور چلے جاؤ گے۔'' وہ اس کی جگمگاتی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتی تو وہ یکلخت شرمندہ سا ہو جاتا۔

''نہیں۔ پھر آپ بھی ہمارے قریب ہی کہیں گھر لے لیجیے گا۔''

''چلو پھر ٹھیک ہے، میں بھی آج ہی سے اپنے نئے گھر کے لیے پیسے جوڑنے شروع کر دیتی ہوں۔'' وہ ہنس کر کہتی تو وہ مطمئن سا ہو جاتا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر ہو جانے کے باوجود اس کی فطرت میں بچوں جیسی سادگی تھی۔

زندگی ایسے ہی بے ثمر رہتی اگر نفیسہ بیگم اسے ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتیں۔

''پچھلے نقصان کی وجہ سے کچھ پیچیدگی ہو گئی ہے مگر ایسا نہیں کہ ٹھیک نہ ہو سکے، علاج تو ہو جائے گا مگر پابندی شرط ہے۔'' ڈاکٹر کی غیر جذباتی آواز اس کے اندر کئی جذبے جگا گئی۔ امید کا ننھا سا دیا روشن ہوا تو زندگی کے رنگ نکھرے نکھرے سے لگنے لگے۔ مدثر کو پتا چلا تو ان کے چہرے پر لمحے بھر کو ایک سایہ سا آکر گزر گیا شاید پچھلا دکھ یاد آگیا تھا۔

''ڈاکٹر کہہ رہی تھیں تین مہینے کا علاج ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہہ کر مدثر کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر اب نرم نرم سا تاثر ابھر آیا تھا۔

ایک آس کیا بندھی روزمرہ کے معمولات ہی بدل گئے۔ وہ جو ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے چھوٹے چھوٹے جملوں کی ڈور سے بندھ کر نزدیک آنے لگے۔ برف کی دیواریں جذبوں کی حدت سے پگھلنے لگیں۔

''بیٹا چاہیے یا بیٹی.....'' کی تکرار ہنسی کی چھنکار میں بدلنے لگی اور اللہ کو بھی ان کا بدلا ہوا انداز کچھ اتنا بھایا کہ تین مہینے کا علاج مکمل ہونے سے پہلے ہی خوش خبری مل گئی۔

خوشیوں کا حصول اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے رپورٹس چیک کرنے کے بعد جہاں اس کے امید سے ہونے کی خبر دی وہیں ڈھیر سارے ٹیسٹ اور الٹرساؤنڈ بھی لکھ دیے۔

''آپ کے پچھلے کیس کو نظر میں رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم اس مرتبہ پہلے ہی سے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ آپ فوری طور پر یہ سارے ٹیسٹ کروا لیں تاکہ ہم اسی حساب سے آپ کی پرگنسی کو مانیٹر کر سکیں۔ یہ تو طے ہے کہ آپ کو اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا۔'' ڈاکٹر کی باتوں نے اسے سہا دیا۔ نفیسہ بیگم بھی گھبرا گئیں۔

''تم ایسا کرو ملتان چلی جاؤ یا پھر اپنے میکے سے کسی کو یہاں بلوا لو۔'' انہوں نے مشورہ دیا مگر دونوں باتیں ہی قابلِ عمل نہیں تھیں۔ نہ وہ ملتان جا سکتی تھی کیونکہ مدثر کا کہنا تھا کہ جو ڈاکٹر شروع سے اس کا علاج کر رہی ہے اسے چھوڑ کر دوسرے شہر اور دوسرے ڈاکٹر کے پاس جانا ٹھیک نہیں ہوگا اور اس کے میکے سے کسی کا ایک لمبے عرصے کے لیے کراچی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنا بھی ممکن نہیں تھا۔

''تم کیوں پریشان ہورہی ہو، یہاں پر ہر قسم کی سہولتیں ہیں اور پھر نفیسہ خالہ بھی تو تمہارا اتنا خیال رکھتی ہیں۔'' مدثر کا کہنا بھی ٹھیک تھا مگر آنے والا وقت ان کے لیے بہت کٹھن ثابت ہوا۔ مکمل بیڈ ریسٹ آئے دن کے ٹیسٹ اور الٹراساؤنڈ، ڈاکٹر کی فیس اور ایک طویل انتظار کے بعد آپریشن کے اخراجات مدثر کو آفس سے لون لینا پڑ گیا مگر اتنی مشکلات کا انعام جب انہیں ردا اور حسن کی صورت میں ملا تو وہ دونوں سب کچھ بھلا کر خوشی اور ذمے داری کے نئے احساس سے سرشار ہو گئے۔

ردا اور حسن جڑواں ہونے کی وجہ سے خاصے کمزور تھے لہٰذا انہیں عام بچوں سے زیادہ دیکھ بھال اور توجہ کی ضرورت تھی، آپریشن کے باوجود اسے ہفتے بھر بعد ہی بچوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ گھر داری کے کاموں میں بھی ہاتھ ڈالنا پڑا حالانکہ ملتان سے امی کا آنے کا ارادہ تھا مگر عین وقت پر ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور پھر نفیسہ بیگم نے ہی اسے اور بچوں کو سنبھالا ورنہ اسے کہاں آتا تھا اتنے ننھے ننھے بچوں کو نہلانا، ان کے کپڑے تبدیل کرتے وقت یہ خیال رکھنا کہ کہیں ہاتھ نہ مڑ جائے یا گردن میں جھٹکا نہ آجائے۔ نفیسہ بیگم کے تجربہ کار ہاتھ یہ سب کام بڑی آسانی سے کر لیتے اور اس نے بھی چند ہی دنوں میں ان سے اچھی خاصی ٹریننگ لے لی اور دونوں بچوں کی پرورش جی جان سے کرنے لگی۔ بچوں کے کام میں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا، وہ سارے دن لگی رہتی مگر کام تھے کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتے۔ کبھی روئی بازار سے آتی تو کبھی مدثر کو ناشتا کیے بنا ہی آفس جانا پڑتا مگر اس کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کبھی گلہ نہیں کیا بلکہ کئی چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے کو بھی تیار رہتے۔

☆☆☆

وقت کیسے گزرا اس کا اندازہ ہی نہیں ہوسکا۔ زندگی میں آنے والی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں بچوں کی معصوم معصوم حرکتوں میں پتا بھی نہیں چلیں اور ان کے اسکول میں ایڈمیشن کا وقت آگیا۔ یہ ایک ایسا مرحلہ تھا جہاں آکر بڑے سوالیہ نشان نے ان کے حواس گم کردیے۔ ایک اچھے اسکول کی پڑھائی کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ مدثر کی ماہانہ آمدنی اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی اور گلی محلے کے اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کروانے پر ان دونوں کا ہی دل راضی نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اچھی تعلیم کے لیے اچھی بنیاد کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

''میں کہیں پارٹ ٹائم جاب کرلیتا ہوں۔'' بہت سوچنے کے بعد بس یہی ایک حل مدثر کو نظر آیا اور اسے بھی نہ چاہتے ہوئے اس پر راضی ہونا پڑا۔ ایک اور جاب کرنے کے باوجود ہر چیز کے لیے دس بار سوچنا پڑتا تھا۔ اخراجات کا دائرہ مختصر کرنے کے باوجود مدثر کو ہر مہینے کسی نہ کسی دوست سے رقم قرض لینی پڑتی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے ان کا گھرانہ ہی اس کا میکا اور سسرال ہو کیونکہ وہ کبھی ماں بن کر اسے زندگی کی اونچ نیچ سمجھاتی تھیں اور کبھی ساس کی طرح سرزنش کرتی تھیں بہرحال ہر حوالے سے ان کی ذات اس کے لیے ایک بڑا سہارا تھی۔

حنا کی شادی کی تاریخ طے پا گئی تھی اور نفیسہ بیگم بازار کے چکروں میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہیں اس کے گھر آنے کا وقت ذرا کم ہی ملتا تھا البتہ حنا اور ثنا چکر لگا لیتی تھیں۔ اس روز حنا آئی تو بہت خاموش خاموش سی لگ رہی تھی۔ وہ مدثر اور دونوں بچوں کے جانے کے بعد گھر کی صفائی کر کے



فارغ ہوئی تھی حنا کی اداسی فوراً ہی اس کی نظر میں آگئی۔

''کیا بات ہے، کیا سسرال جانے سے ڈر لگ رہا ہے؟'' اس نے یونہی ہلکے پھلکے انداز میں سوال کیا تو حنا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''نہیں بھابی، یہ بات نہیں بس آج کل گھر میں بہت ٹینشن چل رہی ہے۔'' حنا نے دھیمی آواز میں جواب دیا تو وہ چونک پڑی۔

''ایسی کیا بات ہوگئی؟ نفیسہ خالہ نے کچھ کہہ دیا۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نفیسہ بیگم کا ہی نام نکلا کیونکہ اسے پتا تھا کہ ان کے گھر میں کوئی معمولی سی بات بھی اگر نفیسہ بیگم کی مرضی کے خلاف ہوجاتی تھی تو کئی کئی دنوں تک ان کا موڈ خراب رہتا تھا۔

''دراصل زین پھپھو کی بیٹی عینی کو پسند کرتا ہے اور امی بالکل نہیں چاہتیں کہ زین کی شادی پھپھو کے گھر ہو۔'' حنا کی بات سن کر تو وہ بھی گھبرا گئی کیونکہ نفیسہ بیگم جب چھوٹی چھوٹی باتوں پر قیامت اٹھا دیتی تھیں تو یہ تو بہت بڑی بات تھی اور اس بات کا اندازہ تو اسے بھی تھا کہ وہ اپنی نند سے زیادہ خوش نہیں تھیں بس دنیا داری ہی نبھاتی تھیں دوسری طرف زین اکثر جس انداز میں عینی کا تذکرہ کرتا تھا اس سے اس کی پسند کا بھی پتا چلتا تھا۔

''مگر ابھی تو زین کی شادی کا کوئی امکان نہیں تو پھر ابھی سے یہ بات نفیسہ خالہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنے سالوں میں وہ نفیسہ بیگم کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوچکی تھی لہٰذا معاملے کی سنگینی کے خیال سے پریشان ہوگئی۔

''دراصل عینی کے لیے کوئی رشتہ آیا ہوا ہے تو زین چاہتا ہے کہ امی پھپھو سے بات کرلیں۔'' حنا دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں خشک کررہی تھیں اسے بے ساختہ اس پر رحم آگیا۔

''اچھا تم رو رو کر اپنی آنکھیں خراب مت کرو، یہ وقت تمہارے لیے اس طرح پریشان ہونے کا نہیں، بس تم خوش رہو۔ میں موقع پا کر نفیسہ خالہ سے بات کروں گی۔'' حنا کی تسلی کے لیے اس نے کہہ تو دیا مگر آنے والے دن خود اس کے لیے ایسی پریشانی لے کر آئے کہ وہ سب کچھ بھول کر اسی میں الجھ کر رہ گئی۔

طبیعت تو اس کی کئی دنوں سے سست ہو رہی تھی مگر اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ قدرت ایک بار پھر اس پر مہربان ہوئی ہے اور جب اسے احساس ہوا تو کتنی دیر تک تو وہ یونہی گم صم ایک جگہ بیٹھی رہ گئی۔ ساری پچھلی باتیں یاد آگئیں۔ ردا اور حسن کی دفعہ کتنی مشکل ہوئی تھی اگر اس مرتبہ بھی وہی سب کچھ ہوا تو وہ کیا کرے گی، اس وقت تو بس مدثر اور وہ تھے۔ کھانا بھی بازار سے آجاتا تھا، کبھی نفیسہ بیگم اپنے گھر سے بھیج دیتی تھیں یا خود اُن کے گھر آکر پکا دیتی تھیں۔ گھر کی صفائی بھی بس جیسے تیسے ہو ہی جاتی تھی، مدثر چھٹی والے دن مشین لگا کر کپڑے دھو لیتے تھے مگر اب تو حالات ہی دوسرے تھے۔ ردا اور حسن ابھی چھ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے ان کے کام اتنے زیادہ ہوتے تھے اور یہ کام ماں ہونے کی حیثیت سے صرف وہی کرسکتی تھی۔ اور پھر اتنے سالوں بعد نفیسہ بیگم کی عمر اور صحت ایسی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ یہ امید کرتی کہ وہ پہلے کی طرح اس کی مدد کرسکیں گی۔

''کیا ہوگا؟'' یہ سوال کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا سارا وجود سن ہوا جارہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بچوں کا اسکول سے واپسی کا وقت ہو رہا ہے تو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ گھبرا کر اٹھی اور کچن کا رخ کیا تھا۔ مدثر کو یہ خبر دیتے ہوئے اس کا انداز اس بار بالکل مختلف تھا اور مدثر کا ردِعمل بھی۔

''میں تو پہلے ہی قرضدار ہوں اگر اس بار بھی تمہاری حالت پہلے جیسی ہوئی تو کیا ہوگا؟'' ان کی پریشانی کے اسباب کچھ اور تھے۔ وہ رات دونوں نے تقریباً جاگ کر کاٹی مگر الگ الگ، اپنی، اپنی ذمّے داریوں کے خوف سے ہراساں۔

''ڈاکٹر کے پاس کب چلنا ہے؟'' اگلی صبح اس نے ناشتا مدثر کے سامنے لا کر رکھا تو انہوں نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر سوال کیا۔

''اتنی جلدی......'' وہ چور سی ہو رہی تھی جیسے سارا قصور اس کا ہو۔

''تو پھر کب جاؤ گی؟ جب کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔'' مدثر کا لہجہ اتنا برا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''سوری... میرا مطلب تھا کہ بلاوجہ دیر کرنے سے کیا فائدہ۔'' مدثر کو اپنے رویّے کی بدصورتی کا احساس ہوا تو کسی قدر نرمی سے بولے۔

''پرسوں حنا کی شادی ہے... اس کے بعد ہی...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر آنکھوں میں آئی نمی کو آنچل میں جذب کیا اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

''اچھا، اب اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے مدثر خود بھی ایک غیر یقینی کی کیفیت کا شکار تھے۔

مدثر کے آفس جانے کے بعد وہ کچن سمیٹ کر نفیسہ بیگم کے گھر جانے کے لیے تیار ہونے لگی حالانکہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے سر بوجھل ہو رہا تھا مگر رات کو حنا کی مہندی تھی اور اسے ان کے گھر جا کر رات کی تیاری میں کچھ نہ کچھ ہاتھ تو بٹانا ہی تھا۔

حنا کی مہندی میں خوب ہلا گلا ہوا، زرین بیٹی کے گرد پروانے کی طرح گھوم رہا تھا اور نفیسہ بیگم کی پیشانی پر شکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی اور وہ پورے طور پر خوش نہیں تھیں۔ یہ خیال بہت تکلیف دہ تھا، اتنے سالوں تک انہوں نے ہر مشکل گھڑی میں جس طرح اس کا ساتھ دیا تھا اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ بھی اس وقت ان کی پریشانی کم کرنے میں ان کی مدد کر سکتی مگر وہ اپنے آگے کسی اور کی سنتی بھی کہاں تھیں۔ ملے جلے احساسات کا بوجھ لیے رات گئے جب وہ گھر میں واپس آئی تو ردا اور حسن سو چکے تھے مگر مدثر جاگ رہے تھے اسے حیرت بھی ہوئی کیونکہ وہ نیند کے بہت کچے تھے اور گزشتہ رات بھی تقریباً جاگ کر ہی گئی تھی۔

''آپ اب تک جاگ رہے ہیں؟'' بچوں کی نیند ڈسٹرب نہ ہو اس خیال سے اس نے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں سوال کیا تھا۔

''ہاں، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے، آؤ باہر چلتے ہیں۔'' مدثر نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے جواب دیا اور دبے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے... اور وہ جو یہ سوچ کر جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے بغیر میک اپ صاف کیے بیڈ تک آئی تھی کہ اب فوراً آنکھیں بند کر کے سو جانا ہے شدید بیزاری کے عالم میں پیر گھسیٹتی ان کے پیچھے آئی تھی۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور وہ بے صبری سے ان کے کچھ کہنے کا انتظار کرتی رہی۔

''ایسی کیا بات ہے کہ صبح کا انتظار کرنے کے بجائے ابھی کہنا ضروری ہے۔'' ان کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر اسے کہنا ہی پڑا۔

''دراصل آج میں نے جاوید سے بات کی تھی تم تو جانتی ہو کہ اس کے سال ڈیڑھ سال کے فرق سے چار بچے ہیں اور وہ بھی اپنے معاشی حالات کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتا ہے۔'' بالآخر مدثر نے رک رک کر بولنا شروع کیا اور وہ ایک بار پھر حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگی کہ بھلا رات کے اس پہر جاوید کے بچوں کی تعداد اور مالی پریشانی کا تذکرہ اتنا ضروری کیوں ہو گیا کہ وہ خود بھی جاگ رہے تھے اور اس کے تھکن اور نیند سے بوجھل ذہن کو بھی مزید الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔

''وہ ایک بہت اچھی ڈاکٹر کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' مدثر کی آواز گھٹ سی گئی، انہوں نے ہلکے سے کھنکھار کے جیسے گلا صاف کرنے کی کوشش کی اور ذرا دیر کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''تم کو تو یاد ہوگا پچھلی مرتبہ بھی مجھے آفس سے لون لینا پڑا تھا اور اب چھ سال بعد تو مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے تو ڈاکٹروں کی فیس، دواؤں کا خرچہ اور پھر آپریشن... تم خود سوچو یہ سب کہاں سے ہوگا۔''

مدثر کے بے ربط جملے آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر اثر انداز ہونے لگے۔ نیند اور تھکن کا احساس اچانک ہی غائب ہو گیا اور وہ جو اب تک نڈھال سی بیٹھی تھی یکلخت سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ہلکے سے اندھیرے میں مدثر کا چہرہ صاف نہیں نظر آ رہا تھا مگر ان کی آواز میں رفتہ رفتہ اعتماد بڑھنے لگا تھا۔

''اگر ابھی ہم ان تمام اخراجات کا انتظام کسی نہ کسی طرح سے کر بھی لیں تو آنے والی زندگی میں ہم اپنے بچوں کو کیا دے سکیں گے۔ ابھی ردا اور حسن کے اسکول کی فیس ہی اس قدر مشکل سے نکلتی ہے جبکہ ہم نے انہیں بس ایک درمیانے درجے کے اسکول میں ڈالا ہے اور پھر صرف پڑھائی ہی تو نہیں۔ اپنے بچوں کے لیے اور بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تم خود سوچو اگر ہم ایک اور زندگی کو دنیا میں لے آئیں اور اسے کچھ نہ دے سکیں جو اس کا حق ہے تو ہم ہمیشہ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اپنی اولاد سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔'' مدثر نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک گہری سانس لی اور وہ تو جیسے سانس لینا بھی بھولی ہوئی تھی۔

''ردا اور حسن بھی اتنے چھوٹے ہیں ان کے پیچھے بھاگ کر ویسے بھی تمہاری صحت پہلے جیسی نہیں رہی تو ایک اور بچے کے بعد تم کیسے اتنا سب کچھ کر پاؤ گی، تم اچھی طرح سوچ لو، مجھ پر تو صرف ایک ہی ذمّے داری ہے مگر تمہیں تو بچوں کی صحت، ان کی تربیت اور تعلیم کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ گھر بھی دیکھنا ہے، ایسا نہ ہو کہ کہیں کوئی کمی رہ جائے اور ہم بعد میں پچھتائیں، ابھی ہمارے پاس وقت ہے کہ ہم کوئی فیصلہ کر لیں، جاوید بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی بھی اس ڈاکٹر کے پاس جا چکی ہے لہٰذا ڈرنے کی ضرورت نہیں تم ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر بھی واپس آ جاؤ گی۔'' فیصلے کا بوجھ اس کے کاندھوں پر ڈال کر وہ مطمئن ہو گئے۔

''چلو اب سو جاؤ مگر سوچنے میں زیادہ وقت نہ لگانا، جو بھی کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔'' وہ کمرے میں جا چکے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ مرد کتنی آسانی سے اپنی مرضی اور اپنے ارادوں کی وضاحت کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کا اختیار عورت کو دینے کا احسان بھی کر دیتے ہیں۔

کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حادثہ ہوگیا جس نے انہیں تو کیا پورے محلے کو ہلا کر رکھ دیا۔

جس روز حنا کی برات تھی زین نے نفیسہ بیگم سے ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ وہ پھپھو سے اس کے اور عینی کے رشتے کی بات کرلیں۔ نفیسہ بیگم ویسے بھی زین کا والہانہ انداز اور عینی کی شرمیلی ادائیں دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پی رہی تھیں زین کی بات سن کر ان کی برداشت ہی جواب دے گئی اور انہوں نے زین کا ہاتھ پکڑا اور مدثر کے گھر آکر ہفتے بھر سے جولا وا ان کے اندر پک رہا تھا وہ سب زین پر انڈیل دیا۔ ان کے منہ میں جو جو آیا وہ کہتی گئیں اور زین خاموشی سے سر جھکائے سنتا رہا۔

''تم میری بات اچھی طرح سے کان کھول کر سن لو میرے گھر میں آج تک کوئی معمولی سا کام بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہوا نہ کہ شادی جیسا اہم اور زندگی بھر کا معاملہ..... اگر تم پر ایسا ہی عشق کا بھوت سوار ہے تو جاؤ جا کر عینی سے شادی کرلو مگر یہ دھیان رہے کہ اس کے بعد میں تمہارے لیے مرگئی اور تم میرے لیے مرگئے۔'' اس نے دہل کر اُن کی طرف دیکھا مگر وہ اپنی بات ختم کر کے رکی نہیں اور اسی طرح غصے میں بھری اپنے گھر میں چلی گئیں ان کے جانے کے بعد اس نے پلٹ کر زین پر نظر ڈالی جو ابھی تک گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''زین خدا کا واسطہ اس وقت یہ ضد چھوڑو، حنا کی شادی ہوجانے دو پھر میں خود بات کروں گی نفیسہ خالہ سے۔'' اس نے زین کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''چھوڑ دیں بھابی..... ہر ضد چھوڑ دی..... آپ بالکل فکر نہ کریں اور امی کو بھی جا کر اطمینان دلا دیں کہ میں نے عینی سے شادی کا خیال دل سے نکال دیا ہے، وہ بھی ہر پریشانی اپنے دل سے نکال دیں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب زخمی سی مسکراہٹ تھی، وہ الجھن آمیز نظروں سے زین کی طرف دیکھنے لگی تو وہ ہنس دیا۔

''کیا بات ہے بھابی، میری بات کا یقین نہیں ہو رہا، ارے یہ عشق محبت تو سب وقتی باتیں ہوتی ہیں بس ذرا سی ماں باپ کی جھاڑ پڑی اور سب اڑن چھو..... بس آپ جائیں اور امی کو بتا دیں کہ تاکہ اُن کا موڈ ٹھیک ہوجائے، میں بھی اب چلتا ہوں گھر میں بہت کام ہے، بس حنا کی شادی ہوجائے پھر.....'' وہ جملہ پورا کیے بنا ہی چلا گیا اور وہ سوچتی رہ گئی کہ کیا واقعی سب وقتی باتیں ہوتی ہیں۔ نفیسہ بیگم کے لبوں پر زین کا پیغام سن کر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی مگر انہیں کیا پتا تھا کہ یہ لمحے بھر کی جیت زندگی بھر کی ہار میں تبدیل ہونے والی ہے۔ اگلے روز حنا کے سسرال جانے کی تیاری ہو رہی تھی رات رخصتی میں دیر ہوجانے کی وجہ سے صبح سب ہی دیر سے سو کر اٹھے تھے۔

''زین کہاں ہے اسے بلاؤ، آخر وہی تو بہن کو لینے جائے گا۔'' نفیسہ بیگم کے کہنے پر عینی نے بتایا کہ زین بھائی تو ابھی تک سو رہے ہیں، نفیسہ بیگم نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے زین کو جگانے کے لیے چل دیں مگر زین جاگنے کے لیے نہیں سویا تھا۔ رات گئے بہن کو رخصت کرنے کے بعد اس نے ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھالی تھیں، آخر وہ بھی تو نفیسہ بیگم کا ہی خون تھا۔ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات کیسے برداشت کرتا۔

☆☆☆

حادثہ بڑا ہو یا چھوٹا دھیرے دھیرے اس کے



اثرات مدھم پڑنے لگتے ہیں، زندگی معمول پر آنے لگتی ہے۔ زین کو دنیا سے گئے تین روز گزر چکے تھے۔ نفیسہ بیگم کا تڑپ تڑپ کر رونا، نئی نویلی دلہن کا سسرال والوں کے تیکھے سوالوں پر بے بسی سے منہ تکنا، معصوم صورت عینی کا چبھتی ہوئی نگاہوں سے ڈر کر آنکھوں میں آنسوؤں کو حلق میں اتارنا اور اپنے پرائے لوگوں کی چہ مگوئیاں بالآخر کم ہوتے ہوتے ختم ہوجانی تھیں مگر نوجوانی کی تمام تر رعنائیوں سے... بھرپور ایک زندگی ہمیشہ کے لیے موت کے اندھیروں میں گم ہوگئی تھی۔ اس کا وہ چلبلا انداز، شرارت سے چمکتی آنکھیں جن میں ایک بہتر زندگی کے خواب سجتے تھے محض ایک یاد بن کر رہ گئے تھے۔

یہ خیال مسلسل اسے کچوکے لگا رہا تھا کہ کاش زین تھوڑا سا انتظار کرلیتا تو شاید نفیسہ بیگم جو پھپھو اور عینی کی گھر میں موجودگی کی وجہ سے یہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کے کہنے میں آکر زین بار بار رشتہ طے کرنے کی ضد کر رہا ہے ان کے جانے کے بعد اور حنا کی شادی کی مصروفیت سے فارغ ہوکر ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کرلیتیں یا پھر نفیسہ بیگم ہی سمجھ داری سے کام لے کر اس قدر سختی سے انکار کرنے کے بجائے زین کو کسی بہانے سے ٹال دیتیں مگر دونوں نے ہی جلد بازی سے کام لیا۔ ایک زندگی سے منہ موڑ گیا اور باقی رہ جانے والے کے پاس عمر بھر کا پچھتاوا رہ گیا۔

☆☆☆

وہ ردا اور حسن کو ہوم ورک کروا کر فارغ ہوئی تھی کہ گیٹ پر بائک رکنے کی آواز آئی اس نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا اور غیر ارادی طور پر گردن باہر نکال کر گلی کے نکڑ تک جھانکا اور پھر بوجھل قدموں سے واپس آگئی۔ اس ہنستے مسکراتے چہرے کی جھلک اب کہاں نظر آنی تھی۔ چار دن گزر جانے کے باوجود کسی پل اس کا خیال ذہن سے نہیں نکلتا تھا، پرانے تعلق کا خیال کر کے وہ نفیسہ بیگم کے گھر جاتی مگر اُن کی حالت دیکھ کر اس کے لیے وہاں بیٹھنا مشکل ہوجاتا اور وہ تھوڑی ہی دیر میں واپس آجاتی۔ پورے محلے میں ایک سوگواری سی طاری تھی۔ زین کی موت نے چھوٹے بڑے سب کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی تھی۔ اس وقت بھی مدثر فریش ہونے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے کسی سوچ میں گم تھے جب اس نے چائے کا کپ لا کر ان کے سامنے رکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی، آہٹ پا کر مدثر نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیسی ہیں نفیسہ خالہ؟'' مدثر نے آہستگی سے سوال کیا۔

''بس ویسی ہی..... اتنی جلدی کہاں صبر آئے گا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا، کتنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی لمحے خاموشی سے گزر گئے، مدثر بے دلی سے چائے کے گھونٹ لے رہے تھے اور وہ اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے خیالات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی تھی۔

''کیا زندگی اس قدر ارزاں ہے کہ کسی بھی بات پر مایوس ہو کر اپنے ہی ہاتھوں ختم کر دی جائے؟'' کافی دیر بعد وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ مدثر نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر اس کے اترے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم اپنے ذہن پر اتنا بوجھ مت ڈالو، جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور آج کل تو خودکشی کرنا بہت ہی عام ہو چکا ہے۔ ہر دوسرے روز اخبار میں یہی خبر ہوتی ہیں۔ کسی نے بے روزگاری سے گھبرا کر تو کسی نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا، ہم یہ خبریں سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے کوئی بڑی بات نہ ہو مگر زین چونکہ ہماری آنکھوں کے سامنے بچے سے بڑا ہوا اور پھر وہ اتنا ہنس مکھ اور ملنسار تھا کہ محلے میں سب ہی اس کو پسند کرتے تھے اور ہم سے تو اس کا خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ ہم سب نے اس کی موت کا اتنا اثر لیا ہے کہ کئی دن گزر جانے کے باوجود سارے محلے میں سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔'' کھوئے کھوئے انداز میں کہتے ہوئے مدثر کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''مگر دکھ اور پریشانیاں تو ہر ایک کی زندگی میں ہوتی ہیں اور کبھی ایسا وقت آتا ہے کہ انسان نہ اپنے مال سے مطمئن ہوتا ہے نہ مستقبل سے پُرامید۔۔۔ مگر جینا تو پھر بھی پڑتا ہے اگر ہر شخص اس طرح مایوس ہو کر اپنی جان دینا شروع کر دے تو دنیا کا نظام ہی بگڑ کر رہ جائے گا۔'' وہ گہری سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

''در اصل یہ بزدلی کی انتہا ہے کہ انسان حالات کی سختی سے گھبرا کر زندگی سے فرار حاصل کر لے اور اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں نہ سوچے کہ اس کے جانے کے بعد ان پر کیا گزرے گی جیسے نفیسہ خالہ اب اپنی باقی کی ساری زندگی اس لمحے کو کوستی رہیں گی جب انہوں نے اس قدر بے رحمی سے زین کی خواہش کو ٹھکرایا اور وہ معصوم بچی کیا کبھی پورے طور پر ایک نارمل زندگی جی سکے گی، اس کی شادی بھی ہو گی، بچے بھی ہوں گے مگر یہ خیال ہمیشہ اسے رُلائے گا کہ اس کی چاہت میں ایک اتنا پیارا انسان اپنی جان سے گزر گیا۔'' مدثر کی آواز میں رنج کے علاوہ معاشرتی بگاڑ کے خلاف احتجاج بھی در آیا تھا۔

''اور ہم بھی تو کچھ ایسا ہی کرنے جا رہے ہیں۔'' وہ ابھی بھی بہت آہستہ بولی تھی مگر مدثر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہم بھی تو حالات کی سختی سے گھبرا کر زندگی ہارنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔ کس کی زندگی؟'' مدثر کی حیران نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری ہوئی تھیں اور وہ کسی نادیدہ چیز پر نظریں جمائے ساکت بیٹھی تھی بس اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

''اس کی زندگی جو ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں، اللہ ہم سے مایوس نہیں ہے اسی لیے اتنے سالوں بعد اس کی قدرت پھر ہم پر مہربان ہوئی ہے مگر ہم اس کی رحمت سے مایوس ہیں، مجھے یہ ڈر ہے کہ میں ایک اور ننھے وجود کے ساتھ آپ کی اور گھر کی ذمے داری کیسے نباہ پاؤں گی اور آپ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اپنی محدود آمدنی میں نئے



اخراجات کیسے پورے کر پائیں گے، ہم بھول گئے ہیں کہ ہمت دینے اور پورا کرنے والی ذات تو اللہ کی ہے، وہ کسی پر اس کے حوصلے سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا، بس ہم ہی وقت سے پہلے ہمت ہار جاتے ہیں اور پھر زندگی میں ایک ملال سا رہ جاتا ہے، ایک ایسا پچھتاوا جو جسم و جاں میں شیشے کی کرچ کی طرح چبھتا رہتا ہے۔'' اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور آنکھوں میں بھرے آنسو آہستگی سے بہہ نکلے۔ مدثر کو ایسا لگا جیسے کسی نے قد آدم آئینہ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا ہو جس میں اس کے بجائے کسی قاتل کا چہرہ تمام تر سفاکی سمیت اسے گھور رہا ہو۔ کئی بے رحم لمحے اسی طرح گزر گئے۔ اپنا محاسبہ کرنا اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔

☆☆☆

ردا اور حسن ٹام اینڈ جیری دیکھنے میں مشغول تھے۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی، تھوڑی دیر بعد دونوں بچوں کو رات کا کھانا کھلا کر سلانا بھی تھا تاکہ صبح سویرے اٹھ سکیں، اس نے چاہا کہ اٹھ کر کچن میں جائے مگر جسم نے ارادے کا ساتھ نہیں دیا۔

''فاطمہ!'' مدثر کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آئی تھی۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں، تمہیں سہارا دینے کے بجائے خود ہمت ہار بیٹھا، شادی کے بعد سے آج تک میں نے تم کو دیا ہی کیا ہے، شروع سے لے کر آج تک سارے دکھ ساری مشکلات کا سامنا تو تم نے ہی کیا ہے اور مجھ میں اتنا ظرف بھی نہیں تھا کہ میں تمہارے سامنے آ کر کم از کم تمہاری قربانیوں کا اعتراف ہی کر لیتا، بجائے تمہارا ساتھ دینے کے میں ندامت کے احساس تلے دب کر تم سے دور دور رہنے لگا کہ کہیں تم میری کمزوری کو بھانپ نہ لو اماں کی بیماری کے دوران تم نے جس طرح ان کی خدمت کی اور ساتھ ہی اپنے پہلے بچے کو کھونے کا غم اور جسمانی تکلیف بھی سہی تھی مگر میں تم سے تسلی کے دو بول بھی نہ کہہ سکا اور اب بھی تم میری محدود آمدنی میں جس طرح کوئی شکوہ کیے بنا گزارہ کر رہی ہو اس کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ایک بار پھر اسی جسمانی اذیت سے گزرو اور بعد میں چھوٹے سے بچے کے ساتھ ہم سب کی ذمے داری اٹھاؤ۔''

''اپنے بچے کو جنم دینا اذیت نہیں اور نہ اس کی پرورش کرنا کوئی احسان ہے میں تو صرف یہ سوچ کر پریشان تھی کہ کہیں آپ کے اور ردا اور حسن کے کاموں میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی تو میں آپ کا سامنا کیسے کروں گی۔'' اس کی سادگی مدثر کا دل دکھا گئی۔

''ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے کے خوف سے دور ہوتے گئے مگر اب ایسا نہیں ہوگا اب اگر پیسوں کی تنگی ہو تو تم مجھ سے جی بھر کر لڑنا اور اگر میرے کپڑوں پر استری ہونے سے رہ گئی تو میں تم پر خوب گرجوں برسوں گا۔''

''پیسوں کی تنگی نہیں ہوگی، میں گھر میں کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھا لوں گی۔''

''اور میں اپنے کپڑوں پر خود استری کر لیا کروں گا اور منی کا فیڈر بھی بنا دوں گا۔''

''منی کا نہیں منے کا۔'' فاطمہ نے ٹوکا۔

''اور اگر اس مرتبہ بھی دونوں ہوئے تو۔۔۔'' مدثر کا لہجہ شرارت لیے ہوئے تھا۔

''تو ہم ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہیں۔'' اس نے دو بدو جواب دیا۔ ایک دوسرے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پہلی بار دل سے اور ایک ساتھ ہنسے تھے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناولٹ

# محبت کی شام

سدرۃ المنتہیٰ

''یہ کیا کررہی ہو؟'' اس نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے تھام کر پوچھا تھا۔

''محبت پر سے جمی گرد صاف کررہی ہوں۔'' اس نے شادی میں کھینچی گئی پہلی تصویر پر جمی گرد صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہماری محبت پر گرد جمی ہوئی ہے؟'' اس نے تصویر کا فریم اس سے لے کر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"محبت کو تو ہمیشہ ہی حالات کی گرد کا سامنا ہوتا ہے ڈیئر مگر یہ معمولی سی گرد محبت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، تسلی رکھو۔" اس نے فریم اس کے ہاتھ سے لے کر ریک میں رکھا اور اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی تھی۔

"وعدہ کرو، جب جب محبت پر حالات کی گرد جمے گی، اسی طرح اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرو گی، گرد جمنے نہیں دو گی..... گرد صاف کرلو گی۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت کا عہد لیا تھا۔

"گرد جمنے نہیں دوں گی، گرد صاف کرلوں گی وعدہ....." اس نے اس کی آنکھوں میں خود کو گم کرتے ہوئے عہد دے دیا۔

اسے پتا نہ تھا جو عہد محبت میں کیے جائیں..... وہ کڑی آزمائش مانگتے ہیں۔ کبھی انا، کبھی نظریات، خیالات اور اصولوں کی قربانی..... اس نے بھی اپنے نظریات، اپنے احساسات کی خاطر قربان کیے۔ محبت کو ہر جذبے پر ترجیح دی کیونکہ سب سے بلند ترین جذبہ محبت کا تھا اور جب اس نے اپنے احساسات کو ٹٹولا تو..... اس کے احساسات برف تھے۔ تمام جذبے خاموشی کی پوشاک اوڑھے سو رہے تھے۔ اس نے سوئے ہوئے جذبوں کو جگانے کی ناکام کوشش کر کے دیکھ لی تھی مگر ہوا کیا تھا..... وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہی جو کبھی نہ سوچا نہ کبھی چاہا..... جس کا اندازہ تک نہ تھا۔

اس سب کے بعد محبت پر ایسی گرد جمی کہ تمام فریموں میں مسکراتے عکس دھندلا گئے اور وہ گرد صاف کرنے کا عہد بھلا کر اسے بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ وعدے ٹوٹی پھوٹی زنجیروں کی طرح قدموں سے لپٹ گئے تھے اور محبت بے وفائی کا روپ اوڑھ کر تمام وعدوں کو ساکت کر گئی تھی۔

"نہ جانے انسان محبت میں عہد کیوں کرتا ہے اور اگر کرتا ہی ہے تو نبھانا کیوں نہیں سیکھ لیتا۔ وعدہ وفا کرنا شاید ہماری سرشت میں ہی نہیں ہے۔" اس نے اپنی وسیع النظری کی بنیاد پر کچھ جرم اپنے بھی کھاتے میں ڈالے اور اس کے ساتھ خود کو بھی سزا کے لیے تیار کر دیا۔ وہ محبت کے خلاف کیے گئے عہد کی پاسداری کا ارادہ کر چکی تھی۔ یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔

☆☆☆

اس نے اس کے چہرے پر کوئی تاثر دیکھنا چاہا اور ہمیشہ کی طرح اسے بے تاثر پایا مگر آج اسے اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے وہ جب بھی اس کی بے حسی محسوس کرتا تو حیران رہ جاتا، کیا چیز تھی وہ جس کے اندر احساس نام کی کوئی چیز نہ تھی اور اس کے بارے میں یہ سوچتے ہوئے نہ جانے کیوں اس پر رحم کھا بیٹھتا۔ شاید اس پر رحم کھانے کی وجہ اس کے حالات ...ہی تھے۔

اس کے حالات کا سوچ کر تو اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا، دل میں اور بھی گنجائش نکل آتی اس کے لیے اور وہ یہی سوچے بغیر اس کے لیے سرتاپا احساس بن جاتا۔ شاید وہ قدرتی طور پر کچھ زیادہ ہی حساس تھا۔ یہ تو وہ بھی کہتی تھی اور دیگر لوگ بھی۔ وہ تو اور بھی کچھ کہتی تھی..... بہت کچھ جبکہ اس نے تو ابھی کچھ نہیں کہا تھا، وہ لاشعوری طور پر ان دنوں کا کمپیرژن کرنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔

حالانکہ اسے پتا بھی تھا اس میں اور اس میں بہت فرق ہے مگر پھر بھی وہ اس چہرے میں کوئی چہرہ ڈھونڈنے میں کھو جاتا۔ اب بھی اس کی نگاہیں اس بے تاثر چہرے پر جمی تھیں جس چہرے پر زندگی کا کوئی رنگ نہ تھا، اس حال میں بھی جب وہ خود قابلِ رحم حالت میں تھا تو اس پر بھلا کیا رحم کھاتا۔



وہ چہرہ جسے کھوجنے میں اس نے اپنا آپ ان آنکھوں میں رکھ دیا تھا۔ ان آنکھوں میں اپنا عکس اس نے بار بار دیکھا تھا۔ وہی آنکھیں جنہیں کبھی نہ رُلانے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی، وہ آنکھیں جن میں فقط اس کا عکس تھا اور پھر اب یہ آنکھیں..... اجنبی آنکھیں..... نہ جانے ان آنکھوں میں کیا تھا، وہ سمجھ نہ پایا۔ ایک تو چہروں اور آنکھوں کی کہانیاں عجیب ہی ہیں وہ چہرے سے داستان چرانے کا ارادہ بدل کر میز پر اپنا چائے کا کپ یونہی بھرا ہوا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

چہرے جو کبھی دھوکا دے جاتے ہیں..... چہرے دل کا آئینہ ہیں مگر دل کا حال چھپانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ چہرے جو معصوم ہوتے ہیں..... اور دل..... اتنے سیاہ کالے..... دل میں عجیب سی کشمکش بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اندر آ کر دراز قد آئینے میں خود کو دیکھا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

اسے یاد آیا اس نے بہت دنوں سے شیو نہیں کی، اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ گال پچکے ہوئے لگ رہے تھے، آنکھوں کے گرد گڑھے سے پڑ گئے تھے۔ چہرہ سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ رنگت اتنی زرد زرد سی، آنکھوں میں رات بھر جاگنے کی وجہ سے تھکن اتری ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے بے ترتیب جو چند ماہ سے اس نے سیٹ نہیں کروائے تھے، چہرے سے ہاتھ گردن تک آیا، گریبان پر اٹک گیا غیر استری شدہ شرٹ جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے جو کل رات بے دھیانی میں اس نے پہن لی تھی جس میں اس وقت بھی بے پناہ سلوٹیں تھیں، کل وہ اسی حالت میں اسپتال گیا تھا۔

"ناشتا کیے بغیر ہی آ گئے ہو کیا.....؟" ڈاکٹر واحد نے اسے کہا تھا۔

"نہیں، دو سلائس تو لیے تھے شاید۔" اس نے کہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا؟

"شاید....." وہ ہنسنے لگا تھا..... اور اسے گھر جا کر آرام کرنے کی تلقین کی تھی۔ اب اسے سمجھ آئی تھی اس کی بات، وہ آئینے میں اپنی حالت پر خود سے افسوس کر رہا تھا۔

سامنے دیوار پر لگی تصویروں پر نظر پڑی..... ایک آئینے سے ہٹ کر دوسرے آئینے پر..... جن میں وہ زندگی سے بھرپور، ایک خوش شکل، ہنستا ہوا ہر فکر سے آزاد لگ رہا تھا۔ اسے احساس ہوا ساتھ میں وہ بھی تو تھی، ہنستی مسکراتی ہوئی..... اس کی زندگی..... اور پھر یہ زندگی..... اس نے پھر سے اِک نگاہ خود پر ڈالی اور آئینے سے ہٹا۔ خود کو تنکا تنکا جمع کرتے ہوئے وہ اپنے قدم گھسیٹتا ہوا کمرے کی جانب بڑھا مگر سامنے لگے اسٹینڈ پر رکھے فون کی گھنٹی نے اسے روکا۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری..... وہ فون کی طرف بڑھا اور ریسور اٹھایا۔

"ہیلو..... جی....." کتنی دیر بعد اس کی سماعتوں نے وہ آواز سنی تھی۔ وہ سانس روکے ساکت سا ہو گیا..... وہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ دوسری طرف اس کی آواز ابھری ہے..... صرف ایک لفظ..... اس نے اس کا نام لیا تھا۔ کتنے عرصے کے بعد وہ یاد کرنے لگا..... دوسرا لفظ..... وہ اپنا تعارف کروا رہی تھی۔

"میں ساحرہ اکبر....."

"حسن احمد تمہیں اگر یاد ہو..... تو..... وہ پہلی ملاقات..... جب میں نے تمہیں کہا تھا۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟"

"ساحرہ....." اس نے لمبی سانس خارج کی..... اس کا نام لیا تھا۔ ابھی وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ لوٹ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آؤ..... ابھی وہ کہنے والا ہی تھا کہ تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ ابھی وہ بتانے ہی والا تھا کہ اس نے کتنا یاد کیا ہے اسے، وہ اس سے دور ہو کر نہیں جی سکتا۔ وہ زندگی سے کٹ چکا ہے وہ احساس دلانا چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی زندگی اپنے ساتھ لے گئی ہے اب وہ صرف نام کو کھاتا پیتا ہے مگر ٹھیک سے نہیں..... اس کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ اس کا معدہ کوئی چیز ہضم نہیں کر پا رہا..... وہ خود سے اپنا علاج نہیں کر پا رہا..... اسے ابھی تک یہ عادت ہے کہ کوئی اور اس کا علاج کرے..... اس کا خیال رکھے، وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اسے اس کی بے حد ضرورت ہے لہٰذا وہ تمام باتیں ایک طرف رکھ کر اس کے لیے چلی آئے کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی ہے مگر اسے موقع ہی نہیں ملا وہ کہہ رہی تھی، اسے یاد دلا رہی تھی..... اور وہ ساکت کھڑا یاد کر رہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے حسن احمد تم نے کیا کہا تھا.....؟ تم نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ تم سے محبت کروں گا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمیشہ میری عزت کرنا کیونکہ عزت میرے نزدیک اتنی اہم ہے کہ جس پر میں اپنی جان..... اپنا مال، اپنی محبت بھی قربان کر سکتی ہوں..... مجھے دنیا کے سامنے کبھی بے عزت مت کرنا..... شوہر اور حاکم سمجھ کر خود کو مجھے رعایا مت سمجھنا..... مجھ پر محبت میں حکم ضرور چلانا مگر نفرت میں مجھے بے عزت مت کرنا۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تمہارے گاؤں کی بھیڑ بکری نہیں ہوں۔ مجھ سے ایسا سلوک مت کرنا جیسا سلوک تمہارے گاؤں میں ایک مجبور عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"مجھے یاد ہے..... کیا تمہیں یاد ہے کہ کبھی میں نے تمہارے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا ہو.....؟" وہ اتنی دیر میں پہلی بار بولا تھا۔

"تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے تھے..... کیونکہ میں تمہارے گاؤں کی عورت نہیں تھی جسے اپنے حقوق اور اہمیت کا نہیں پتا۔ تم ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے..... میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دیتی..... مگر..." اس کی سانس تھمی تھی۔

"مگر پھر تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے.....؟" وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔

"تم کس آس پر اب ہمارا کھوکھلا رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہو جبکہ تمہیں پتا ہے کہ میں تمہارے گاؤں کی مجبور عورت نہیں ہوں..... جن کے شوہر چاہے دس شادیاں کریں مگر وہ گھر نہیں چھوڑ سکتیں کیونکہ ان کا کوئی معیار نہیں ہوتا..... ان کو ماں باپ پناہ نہیں دیتے..... مجھے بھی ماں باپ کے گھر میں پناہ نہ ملے..... مگر میں کما سکتی ہوں..... میں اپنے لیے روٹی کا انتظام کر سکتی ہوں۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں تمہاری محتاج نہیں تھی، نہ ہوں کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی تمہارے گھر میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔" وہ اپنے تئیں اپنی بات مکمل کر چکی تھی۔

"تم اتنا سب کچھ کیوں کہہ رہی ہو.....؟"

"افسوس کہ اپنا حق لینے کے لیے مجھے اتنا سب کچھ کہنا پڑھ رہا ہے۔"

"اپنا حق.....؟" وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

"خلع کا....." اس کا لہجہ اس لفظ پر کچھ دھیما ہوا تھا۔

"تم پاگل ہو..... کیا کہہ رہی ہو تم.....؟" وہ دہاڑا اسے توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں تک سوچ سکتی ہے۔

"آہستہ بات کرو مسٹر حسن احمد..... ہاں، خلع کی بات کر رہی ہوں میں اگر تم مجھے طلاق....."



"مت لو یہ لفظ اپنے منہ سے....." اس نے ڈرے لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں روک سکتے تم مجھے..... یہ حق نہیں ہے تمہارے پاس..... میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اس لیے بہتر ہے کہ معاملہ صاف کرو..... وہ رشتہ جو اب صرف کاغذ تک محدود ہو گیا ہے میں اس کاغذ کے بل بوتے پر پوری عمر نہیں گزار سکتی، ہرگز نہیں....." اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا..... ایسا کبھی نہیں ہوگا..... سن لو تم۔"

"کیوں، کس لیے ایسا نہیں ہو سکتا.....؟ تم تمام حقوق استعمال کر سکتے ہو، میں کیوں نہیں.....؟"

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتا..... کسی صورت نہیں، چاہے تم کچھ بھی کر لو۔" وہ اسے قائل تو نہ کر سکا سو ضدی بن گیا۔

"کیوں نہیں کر سکتے..... تم نے کہا تھا ساحرہ میں تم سے بے وفائی نہیں کر سکتا..... تم نے کی۔ تم نے کہا میں دوسری شادی نہیں کروں گا..... تم نے وہ بھی کی، تم نے کہا تھا کہ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا، تم نے مجھ سے جھوٹ بولا، تم نے کہا تھا تم مجھے یہ سب کر کے تکلیف نہیں دو گے..... مگر تم نے مجھے تکلیف دی..... میرے ساتھ کھیل کھیلا..... دھوکا دیا اور اب تم کہتے ہو کہ تم ایسا نہیں کر سکتے..... حالانکہ تم تو کچھ بھی کر سکتے ہو حسن احمد..... تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔"

"تو تم مجھے سزا دینا چاہ رہی ہو؟" اس نے ہارے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"نہیں..... میں اپنی سزا سے رہائی چاہ رہی ہوں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"محبت تمہارے لیے قید ہے.....؟" وہ بے بس ہونے لگا۔

"محبت کا نام مت لو حسن احمد..... تم جیسوں کو اس جذبے کی کیا قدر۔" اس کا لہجہ پہلے جیسا کاٹ دار اور طنزیہ ہو گیا نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"میں نے تمہاری قدر نہیں کی نا..... تمہیں حق ہے مجھ سے لڑو..... مجھے کہو مگر ساحرہ پلیز تم بس خدا کے لیے یہ سب کرنے کی اب نہ گنجائش ہے نہ ہی ضرورت۔" اس نے قدرے بے رحمی سے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے ایموشنل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

"مجھے طلاق چاہیے ہر صورت..... جلد بہت جلد....." وہ اپنی بات مکمل کر چکی تھی۔ لائن ساکت تھی۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں ریسیور رکھا۔

"کیسی عورت ہو تم..... اپنا گھر اپنے ہاتھوں سے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔" اس نے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔ وہ اب رونا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی رو رہا تھا۔

اسے لگا اتنے دنوں سے جو سمندر اس کے اندر ہے وہ اب ایک طوفان کی طرح باہر آئے گا۔ بہہ نکلے گا..... اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے رگڑا، اس کے ہاتھ اپنے آنسوؤں سے تر تھے، وہ سامنے کھڑی خاموشی سے اسے روتا ہوا دیکھتی رہی۔ مگر زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اس پر رحم آیا تھا۔ اس کا جی چاہا بڑھ کر اسے سہارا دے، اسے رونے سے روکے یا اپنا کندھا اسے پیش کر دے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ جس خاموشی سے وہ اندر آئی تھی..... اسی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا فیصلہ پہلے سے زیادہ آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"کسی نااہل ڈاکٹر نے بے چارے مریض کو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غلط انجیکشن دے دیا آج سول اسپتال میں..... وہ تو شکر ہے بے چاری کی بچت ہوگئی، میں اور ڈاکٹر واحد پہنچ گئے تھے۔'' وہ ان کے ساتھ باہر آتے ہوئے افسوس سے بتانے لگی۔

''ہوگا کوئی ڈاکٹر حسن جیسا بدھو۔'' وہ ایک دم سے بول پڑی۔

''دیکھ رہی ہو تمہارے منہ پر تمہارے شوہر کو بدھو کہہ رہی ہے کچھ کہتی نہیں ہو اسے بہت ڈھیٹ ہوگئی ہے یہ..... میرا خیال ہے اس کی فوراً سے بیشتر شادی کردینی چاہیے..... میں بات کرتا ہوں انکل سے..... ہاں.....''

''تمہاری بددعائیں ویسے ہی رنگ لا رہی ہیں کوئی ضرورت نہیں ہے انکل وغیرہ سے بات کرنے کی سمجھے۔ خبردار جو انہیں کسی نے سپورٹ کیا بھی تو.....''

''بھئی حسن میں تمہارے ساتھ ہوں پارٹنر ہم دونوں ساتھ چلیں گے..... بہت ڈھیل مل گئی ہے اسے اب۔'' وہ اتنی دیر میں پہلی دفعہ بولی تھی ان کی نوک جھوک کو نظر انداز کرتے ہوئے۔

''کیوں دشمن ہوگئے ہو تم دونوں میری آزادی کے.....'' گاڑی تک پہنچ کر اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

''اے آگے میری بیوی بیٹھے گی میرے ساتھ سمجھیں!'' وہ دوسری طرف آکر اسے خبردار کرنے لگا۔

''جی نہیں، دو عورتوں کے ہوتے ہوئے آپ کی نہیں چلے گی، ہم دونوں آگے بیٹھتے ہیں آپ پیچھے ہو جائیں آرام سے۔'' وہ بڑے مزے سے بیٹھ گئی کہتے ہوئے۔

''کیا بچوں جیسی بحث ہے، حد ہے، حسن تم پیچھے آجاؤ، ہم پیچھے ہیں تم ڈرائیو کرو ویسے تمہیں گھر تک جانا ہے، ہمیں بیچ میں چھوڑتی جاؤ۔'' وہ اسٹیچ اسکوپ اور کوٹ پیچھے رکھتے ہوئے بیٹھ گئی اور انہیں ڈانٹنے لگی۔ کبھی کبھار دونوں کی فضول بحث سے وہ چڑ بھی جاتی تھی مگر یہی کمپنی کبھی اسے فریش بھی کردیتی، اسے یہ احساس ہی خوش کردیتا کہ وہ اس کی وجہ سے اس کی عزیز دوست کی اتنی کیئر کرتا ہے اور لحاظ بھی کرتا ہے۔

''ایک تو تم دونوں بھی نا!'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھی۔

''اب تم دونوں کم از کم میرے سامنے ایک دوسرے کو اتنے پیار سے مت دیکھا کرو۔ کچھ تو شرم کرلو بے شرموں.....'' اس نے مرر سے حسن کے تاثرات دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''کیوں جلتی ہو ہم دونوں سے، دیوانوں کی دعا لو بڑا اچھا اجر ملے گا ایک نیک بندے کی صورت میں۔'' اب وہ سامنے سے باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''مارکیٹ میں تم جیسا پیس میسر نہیں، ایک ہی تھا جو ڈاکٹر ساحرہ خرید کر لے گئی..... اب مجھے کوئی حسن صاحب جیسا سیدھا سادہ گھامڑ تو ملنے سے رہا۔''

''دیکھو بی بی قدر کرو میری، اسے بھی احساس ہے ایک تمہیں نہیں ہے۔'' اس نے ساحرہ کو جتایا۔

''سب ٹھیک ہے بس کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم ڈاکٹر نہ ہوتے تو.....'' اسے ہمیشہ یہی اعتراض ہوتا۔

''ڈاکٹر نہ ہوتا تو کوئلے والا ہوتا کیا بے چارہ.....؟'' وہ ہمیشہ کی طرح ٹپک پڑی۔

''کوئلے والا..... کیا مطلب.....؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔



''ارے یار مطلب وطلب کیا..... کوئلے کا مطلب راکھ ہی ہوتی ہے، موصوف دیکھنے میں بھی کوئلے، باتوں سے بھی اور اندر سے بھی کوئلے کا دل ہی لگتا ہے فٹ کیا ہوا ہے جناب نے..... اسے دیکھو تو زندگی میں کوئلے کے سوائے کچھ نہیں دکھتا ہر جگہ کوئلہ ہی کوئلہ..... اسے سنو تو تصور میں بھی..... حد ہے۔'' وہ موڑ کاٹتے ہوئے جھنجلا گئی۔

''یہ کوئلہ، کوئلہ کیا لگا رکھا ہے صاف صاف بتاؤ نا، کوئلہ مووی تو نہیں دیکھ کر آئیں؟'' حسن کو اس کی آدھی ٹوٹی پھوٹی بات سے ہمیشہ ہی چڑ ہوتی تھی۔

''ارے کل ایک امید وار گھر آئے تھے، آجاتے ہیں نہ جانے کہاں کہاں سے..... ووٹ ڈالنے؟'' وہ ہنس دیا۔

''حسن..... وہ کیا کہہ رہی ہے، تم سمجھ رہے ہو میرے خیال سے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اسے ٹوکنے لگی۔

''یہ پوری بات سنتا کب ہے، بولنا شروع ہوجاتے ہیں موصوف.....''

''تم پوری بات کرتی ہی کب ہو مائی ڈیئر سسٹر، وہ تو میں تمہاری بات شکر ہے تکمیل تک پہنچا دیتا ہوں ورنہ تمہیں تو آج تک تمہاری دوست بھی نہیں سمجھ سکی ہے۔''

''اصلاح کرنے کا شکریہ برادرِ محترم، آپ میری بات کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں جہاں تک میرے خیال نہیں جاسکتے، آپ کی زبان جاسکتی ہے۔'' وہ اس سے کہاں کم تھی۔

''میرے خیال سے ہم کسی کوئلے والے کا ذکر کررہے تھے امبر.....'' اس سے پہلے کہ وہ دونوں پھر سے شروع ہوتے اس نے یاددہانی کروائی۔

''ارے ہاں، وہ ابو کے دوست آئے تھے اپنے بیٹے کو لے کر ابو سے ملوانے۔''

''اصولاً تو تم سے ملوانا چاہیے تھا ابو سے کیوں.....؟'' وہ ٹپک پڑا۔

''خدانہ کرے وہ مجھ سے ملنے آئے، یقین کرو جتنی دیر بیٹھا رہا کوئلے کی داستانیں ہمارے گھر میں گونجتی رہیں، تھر کول کا کام ابھی شروع نہیں ہوا، تھر میں سب سے بڑا کوئلے کا ذخیرہ ہے۔ کوئلے پر کام نہ ہوا تو بجلی کا مسئلہ بڑھتا جائے گا۔ کوئلہ یہ کوئلہ وہ..... کوئلے کی خاصیتیں..... کوئلے کی تعریفیں..... اُف میں تو بور ہوگئی۔ کان لپیٹ کر اٹھ آئی اور ابو تو اس کے رنگ میں ایسے رنگے کے مت پوچھو، جب سے گیا ہے اس کے گن گا رہے ہیں آج کا بیدار نوجوان..... یہاں لوگوں کو روٹی کی پڑی ہے اور انہیں..... حد ہے یعنی کہ.....''

''اُف امبر اس نے..... مائیننگ پڑھا ہے ظاہر سی بات ہے۔ تم اس کے سامنے ہڈیوں اور زخموں کی داستان کھول دیتیں۔ اسے بھی پتا چلتا کہ ہماری ڈاکٹر امبر بھی کوئی چیز ہے۔'' اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے مشورہ دیا۔

''اور نہیں تو کیا، تمہاری قابلیت سے وہ بھی تو متاثر ہوتا، اب اسے کیا پتا کہ ڈاکٹر امبر کے ہاتھ انجیکشن لگانے پر ابھی تک کانپتے ہیں، سوئی کسی کو چبھے درد ہماری امبر کو ہوتا ہے، اسی لیے ہومیو پیتھک کے کورس کر کے لوگوں کو الو بنا رہی ہے۔'' وہ باقاعدہ ہنس دیا۔

''تم تو چپ رہو، بڑے قابل ڈاکٹر ہوتا۔ مریض اپنی کیفیت سمجھ جاتا ہے مگر تم نہیں سمجھ پاتے۔'' وہ کہاں چھوڑنے والی تھی۔

''سچ تو یہ ہے کہ تم دنوں ڈاکٹر کہلوانے کے لائق نہیں ہو، میرا بس چلے تو اس کے نام کے ساتھ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسائی اور تمہارے نام کے ساتھ کٹائی کا لقب لگا دوں..... بہت ناز ہے اپنی قابلیت پر محترمہ کو، محترمہ دھلائی اور صفائی۔"

"امبر..... یہ آگے کیا ہے رکو....." وہ سامنے چند لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر اسے روکنے لگی اور گاڑی رکنے پر فوراً نیچے اتری، وہ دونوں بھی گاڑی پارک کر کے اس کے پیچھے آئے۔

"اوہ مائی گاڈ، یہ تو بہت خون ضائع ہوگیا ہے۔ کوئی اٹھاؤ اسے۔"

"بی بی وہ سامنے آگئی، بکر ہوگئی..... میری غلطی نہیں بی بی....." ٹیکسی والا ڈرے ڈرے انداز میں وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

"اسے گاڑی میں ڈالو، اسپتال پہنچاؤ فوراً..... حسن جلدی کرو اسے اٹھاؤ' یہ خون ..... جلدی آؤ" وہ لڑکی کی ٹانگ پر دوپٹا باندھتے ہوئے پریشانی سے اسے ہلانے لگی۔

"مگر یہ ہے کون.....؟" وہ ابھی تک الجھا کھڑا تھا۔

"یہ وقت تفتیش کا نہیں، اس بے چاری کی جان بچانی ہے، جلدی کرو، اسے گاڑی میں ڈالو۔" وہ دونوں اٹھا کر اسے پچھلی سیٹ پر ڈالنے لگے۔

"جلدی کرو حسن، اسپتال چلو ابھی ہم زیادہ دور نہیں ہیں اسپتال سے..... امبر تم پیچھے بیٹھو اس کے ساتھ سنبھالو، دیکھو اس کی ٹانگ سے خون ابھی تک بہہ رہا ہے۔" وہ آگے بیٹھتے ہوئے عجلت اور پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ لڑکی نیم بے ہوش تھی اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات تھے۔

"جس نے ٹکر ماری وہ بھاگ گیا..... بات ہمارے گلے پڑ گئی....." وہ گاڑی ریورس کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"کس قدر بے حس ہو تم، ابھی تو اس بے چاری کی کیا حالت ہے..... خدا کرے زیادہ چوٹ نہ آئی ہو۔" وہ پیچھے اس طرف دیکھتے ہوئے ہنوز اسی لہجے میں بولی حسن کو جھڑکتے ہوئے۔

"اب تم دونوں لڑو تو مت..... میرے خیال سے اسے ہڈی تک چوٹ نہیں لگی، ضرب آئی ہے، جلدی کرو اسپیڈ بڑھاؤ حسن۔"

"اب کیا سو کی اسپیڈ سے چلاؤں ہماری ٹکر ہوگی تو ہمیں کوئی نہیں بچائے گا۔"

"بچانے والا خدا ہوتا ہے حسن، ہم کون ہوتے ہیں کسی کو بچانے والے۔"

"خدا کے لیے ساحرہ تم ہی چپ کرو، بس جلدی چلو۔" امبر اس کی ٹانگ کو پکڑے ہوئے فکر مندی سے کہہ رہی تھی، خون سے اس کے کپڑے بری طرح خراب ہو رہے تھے مگر اسے صرف یہ فکر تھی کہ وہ بچ جائے، لڑکی مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی اور اس کا سر سیٹ سے نیچے ڈھلک گیا، امبر کی چیخ نکل گئی۔ اس نے گاڑی جھٹکے سے روکی۔ وہ اسپتال پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

"ابھی اس کی ذہنی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے..... ہمیں انتظار کرنا پڑے گا اس کے کچھ بہتر ہونے کا۔" وہ کلینک سے باہر آتے ہوئے عجلت میں بتانے لگی۔

"مجھے تو لگتا ہے اس کے پیچھے کوئی بڑی کہانی ہے..... اس سے پوچھو یار اور جان چھڑاؤ اپنی فوراہی، عجیب سر درد پال بیٹھی ہو۔" وہ گاڑی تک آتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

"کیا مطلب فوراہی! یعنی... حد ہی ہوگئی..... اب وہ کچھ بہتر ہوگی تو ہی پوچھوں گی نا!"



"تو کیا ارادے ہیں تمہارے.....؟ فوراً نہیں تو کیا لٹکا کر رکھو گی؟"

"ہمیں آخر ضرورت کیا ہے فضول سر درد پالنے کی۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھو کم از کم اس کی ٹانگ کا زخم تو بھر جائے..... وہ بے چاری چلنے کے لائق تو ہو..... ایسے ہی نکال دوں اسے بے ساکھی پکڑا کر..... حد کرتے ہو۔"

"نہیں تو بیٹھ کر خوب تیمارداری کرو پہلے پھر جب خدمتِ خلق سے دل بھر جائے اور میرا خیال آجائے تو پوچھ لینا ان سے کہ محترمہ کہاں سے چل پڑیں تھیں اوروں کی زندگیاں خراب کرنے..... اپنا کوئی گھر ہے یا وہ بھی نہیں..... اور مرنے کا اتنا ہی شوق تھا تو تیسری منزل سے چھلانگ لگا دیتیں....." وہ بھرا ہوا تھا۔

"بہت بری بات ہے..... لگتا نہیں کہ یہ کوئی پڑھا لکھا مہذب انسان اس طرح کی بات کر رہا ہے۔ تمہیں تو مسیحا کی ڈیفینیشن ہی یاد نہیں ہوگی..... ڈاکٹر بن کر کیا کرلیا تم نے..... ڈاکٹر نما قسائی تو اور بہت مل جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ تمہارا نام بھی جڑا ہے۔" وہ کہاں چھوڑنے والی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا.....؟" وہ موڑ کاٹتے ہوئے اسے گھورنے لگا۔

"مطلب یہ کہ ایک بے چاری مجبور لڑکی، جس کی حالت پر تمہیں رحم نہیں آرہا....." وہ دوسری جانب رخ کر کے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"گاڑی سے ٹکرا سے ہم نے نہیں ماری تھی..... پھر بھی تم اسے ضد کر کے لے آئیں تو میں چپ رہا..... مگر تم خود سوچو کہ کوئی اجنبی جس کا کوئی اتا پتا نہیں، ہم اسے زیادہ دیر تک کیسے رکھ سکتے ہیں..... اوکے ہم نے ہیلپ کی..... مگر نیکی بعض اوقات گلے بھی پڑ سکتی ہے..... یہ نہ ہو کل ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔"

"اول تو یہ بات کہ نیکی صرف خدا کے لیے کی جاتی ہے۔ میں صرف یہ سوچ کر اپنی پوری نیکی ضائع کیوں کروں۔ کم از کم اس کی حالت کچھ تو بہتر ہو..... دیکھو تم نے دیکھا ہے نا کہ وہ کس قدر ڈری اور سہمی ہوئی ہے۔ اسے کوئی خوف گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ وہ بولنا چاہتی ہے..... اور وہ بولے گی..... بس تھوڑا سا انتظار..... اتنی جلد بازی سے تو کام اور خراب ہوگا۔ بس اس کا زخم کچھ بھر جائے تو بہتر ہے..... میں تو کہتی ہوں شکر ہے ہڈی کی چوٹ نہیں تھی ورنہ بیچاری چلنے سے بھی بیٹھ جاتی۔" وہ کافی فکر مند تھی۔

"بہر حال جو بھی ہو مگر جلدی..... اور پلیز کم از کم شام تک تمہیں گھر آجانا چاہیے..... آج کل اماں بھی ہیں..... اور ان کا تمہیں پتا ہے..... پھر یہ بھی سچ ہے کہ تم مجھے بہت کم وقت دینے لگی ہو..... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تمہارے پاس میرے لیے بہت کم وقت ہوتا ہے۔ وہ بھی جیسے تم مجھ پر احسان کر رہی ہوتی ہو..... بہر حال اگر وہ بھی نہ دو تو میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔" اصل بات اب زبان پر آئی تھی..... وہ اسے مسکرا کر دیکھنے لگی۔

"میں کوشش کروں گی تمہاری شکایت دور کردوں..... ویسے اس حساب سے اچھا ہے نا..... دیکھو تمہیں اماں کے ساتھ مل کر میری شکایتیں کرنے کا موقع تو مل جاتا ہوگا نا....." اب وہ اسے چھیڑنے لگی تھی۔

"اب ہر بات میں تم بے چاری اماں کو مت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھسیٹا کرو..... وہ بھی کچھ غلط تو نہیں کہتی نا....."

"اوہ..... ویسے وہ کیا، کیا کہتی ہیں..... میں بھی سن لوں..... یہ تو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم ان کی باتوں میں بہت آتے جا رہے ہو..... جبھی تو بات بے بات مجھ سے لڑنے لگے ہو....." اس نے مذاق مذاق میں احساس دلانا چاہا۔

"ہاں، میں تم سے لڑتا ہوں..... اور تم چپ کر کے بیٹھ جاتی ہو۔"

"اب ظاہر ہے میں تمہارے گوٹھ کی چھوکری نہیں کہ خاموشی سے سنتی جاؤں..... کم از کم تمہیں سچ تو کہہ دیتی ہوں۔"

"ویسے تم بار بار میرے گوٹھ کی طرف گولہ باری کیوں کرتی ہو، وہاں کی عورتوں کی سادگی تو انہیں سب میں ممتاز بناتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں ان کے چہروں پر کتنی معصومیت ہوتی ہے، ہر چالاکی سے پاک..... سچی اور کھری..... سادہ اور معصوم....."

"رہنے دو..... یہ سادگی نہیں کم علمی ہے اور تم لوگ یہی چاہتے ہو کہ وہ کم علم رہ کر تم سے مار کھاتی رہے تم لوگ صرف حاکم بن کر رہنا چاہتے ہو، عورت بیٹھی تمہیں پوجتی رہے۔ انتہا کی خود پرستی ہے یہ۔"

"ایک تو تمہیں بولنے کا موقع چاہیے..... کم از کم تمہارے معاملے میں ایسا تو نہیں، مان لو..... آٹھ سال ہو چکے ہیں مگر مجال ہے جو تم نے کبھی مانا ہو..... کبھی میری قدر کی ہو....."

"اب تمہارے سامنے بیٹھ کر ہر بات کا اقرار کروں کیا..... سمجھتی ہوں، اپنی بات نہیں کر رہی میں..... نہ ہی میں نے اپنے بارے میں تمہیں کبھی ایسا کچھ کہا بھی ہے۔ بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہو۔"

"اگر ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی تو تم کیوں چاہتی ہو کہ میں تمہاری تعریف کروں....." وہ ذرا خوش گوار انداز میں بولا۔

"میں نے کبھی کہا ہے تم سے؟" وہ حیران ہوئی۔

"کہتی نہیں..... چاہتی تو ہو نا..... پھر میرا دل کرتا ہے مگر تمہارا دل..... تمہارے دل میں احساسات نہیں..... صرف خون دوڑتا ہے۔"

"اچھا..... ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے دل کا معائنہ کر لیا بٹ کوئی بھی دوربین احساسات نہیں دکھاتی..... احساس تو محسوسات کا نام ہے۔"

"اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو۔"

"حالانکہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے..... ایسا کچھ نہیں، ایک تو تم بدگمان بہت جلد ہوتے ہو..... آٹھ سال میں، میں تمہاری بدگمانیاں دور نہیں کر سکی۔"

"تم بہت نان رومینٹک ہو..... شروع سے ہی۔"

"ہر کوئی ایسا نہیں ہوتا..... مجھے ہر بات کا اظہار نہیں آتا۔"

"تمہیں نہیں لگتا کہ کبھی کبھار کہہ دینا چاہیے۔"

"آٹھ سال کے اس ساتھ میں کیا تمہیں کوئی کمی لگی.....؟ کیا اب بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے حسن.....؟"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے....." وہ بات مکمل نہ کر سکا۔

"چند دنوں میں نہ جانے تمہیں کیا کچھ لگنے لگا ہے..... لگتا ہے اماں کی باتوں کا اثر ہے..... کبھی تو لگتا ہے وہ تمہیں مجھ سے باغی کر چھوڑیں گی۔"

"بے فکر ہو جاؤ..... میں اور میری ماں کم از کم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ہرگز نہیں..... چاہ کر بھی نہیں۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے ہنسا۔

"یعنی کہ کوششیں جاری ہیں..... شاید تمہیں..... میں تمہیں....."

"پلیز ساحرہ کوئی اور بات کرو۔" اس نے ایک دم سے بات کاٹ دی۔

"اچھا، تمہیں پتا ہے کل میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی....." وہ موضوع بدلنا چاہتا تھا۔

"کس سے.....؟"

"ارے یار، اسی لڑکی سے.....؟"

"ہیں..... کیا بات کی تم نے اس سے اس حالت میں حسن.....؟"

"ارے میں نے تو کچھ نہیں کہا بس اتنا کہ اگر تم گھر سے بھاگی ہو تو....."

"حسن تم نے یہ کہا اس بے چاری سے؟" وہ بات کاٹ کر فوراً افسوس سے بولی۔

"تو اور کیا کہتا میں اس بے چاری سے.....؟" وہ اسی کے انداز میں بولا۔

"کم از کم تمہیں اس طرح کہنا نہیں چاہیے..... بہت افسوس کی بات ہے، کیا سوچتی ہوگی وہ....."

"کم از کم مجھے تو یہی لگتا ہے..... پھر..... میرے اتنا کہنے پر چیخنے لگی..... جیسے میں نے کچھ دے مارا ہو اسے..... پورا اسٹاف جمع ہو گیا اس کی چیخوں پر بڑی مشکل سے نرس نے چپ کرایا اسے۔"

"اف..... تم بھی ناں..... اگر وہ ہوش میں ہوتی تو تمہیں کچھ دے مارتی اس بات پر اور پھر پورا اسٹاف تمہاری چیخوں پر جمع ہونا تھا۔"

"دیکھو مجھے یہی لگتا ہے، اب تم مانو یا نہ مانو مگر لکھ کر رکھ لو اس کی جو حالت ہے نا..... پھر وہ کچھ بتانا بھی نہیں چاہ رہی۔"

"دیکھو جب تک ہمیں ثبوت نہیں ملتا اور وہ خود بات نہ کرے تب تک ہم کوئی بھی ایسی رائے قائم نہیں کر سکتے۔"

"پھر میں اسے طریقے سے ہینڈل کروں گی، کم از کم تمہاری طرح نہیں کہ پورا اسٹاف جمع ہو جائے..... بلکہ کل تک ہو سکا تو اسپتال سے کلینک تک شفٹ کر دوں گی اسے وہاں پھر بھی ٹھیک ماحول ہوگا، اب سول اسپتال کے ماحول سے تو اچھا بھلا بندہ گھبرا جاتا ہے وہ تو پہلے سے ہی گھبرائی ہوئی ہے۔"

"اوکے، جو مرضی کرو مگر جلدی اور ہاں ایک بات تو میں تمہیں ابھی سے بتا دوں کہ کلینک سے گھر تک نہیں ایسا نہ ہو کچھ دن کے خیال سے تم ایسا سوچو..... کلینک سے ہی فارغ کر دینا ہے، میں کہہ رہا ہوں تمہیں۔" وہ اس کے ارادوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

"اُف حسن..... تم اتنے....." گاڑی کو بریک لگتے ہی وہ اسے افسوس سے دیکھنے لگی۔

"ہم گھر پہنچ گئے ہیں اور اب اماں کے سامنے یہ موضوع ڈسکس نہیں ہوگا..... انہیں معلوم نہیں ہے....." وہ گاڑی گیٹ سے اندر کرتے ہوئے اسے تنبیہ کرنا نہیں بھولا۔

"اترو اب..... کیا یہیں بیٹھنا ہے.....؟" اس نے اترتے ہوئے اس کا موڈ دیکھ کر کہا اور کوٹ بازو پر ڈالے اندر آیا اس کے ساتھ۔ اماں حسب معمول شروع تھیں۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور خود ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ سر جھٹک کر خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے ایک لمحہ بھی یہاں رکنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کوئی معمولی سی بات بھی بڑھ سکتی ہے سو احتیاط برتی..... اندر آ کر اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا اور پرس رکھ کر تھوڑا سا ریسٹ کرنے لیے لائٹ بند کر کے لیٹ گئی..... جیسے ہی اندھیرا ہوتا تھا اسے نیند آنے لگتی..... اور ساتھ میں ایک خیال بھی جو بہت دنوں سے پریشان کر رہا تھا۔ جسے پہلے پہل اس نے اندازہ اور غلط فہمی کا نام دے کر ٹالا بھی بہت تھا مگر اب لگتا تھا یہ اندازہ..... صرف اندازہ نہیں۔

☆☆☆

''کہاں ہو تم..... کب سے ٹرائی کر رہی ہوں..... کم از کم کال ریسیو تو کر لو، رنگ بیک کرنے کا وقت تو تمہارے پاس ہوتا نہیں ہے.....'' اس کے فون اٹھاتے ہی اس کی شکایات شروع ہو گئی تھیں۔

''ارے یار اسپتال سے ڈیوٹی دے کر آئی ہوں کلینک..... ابھی تو پہنچی ہوں مومنہ کو لے کر..... آج سے کلینک شفٹ کیا ہے اسے۔'' وہ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے تھکن زدہ لہجے میں بتانے لگی اس کی شکایات کو نظر انداز کرتے ہوئے۔

''ساحرہ کبھی اپنا خیال بھی کر لیا کرو تم..... رات حسن بھائی نے مجھے فون کر کے تمہارا پوچھا، تمہارا سیل بھی آف رہا پورا دن ان کی شکایات ٹھیک ہی ہیں۔''

''تم سب لوگوں کو مجھ سے شکایتیں ہیں تو میں کیا کروں.....؟ تم سب لوگ اپنا سوچتے ہو، میرا نہیں..... تمہیں یہ شکایت کہ تم سے ملتی نہیں..... بے خبر رہتی ہوں..... بدل گئی ہوں..... تمہاری ضرورت نہیں رہی..... اور بھی نہ جانے کیا کیا..... حسن کو صرف یہ چاہیے کہ چوبیس گھنٹے اس کی ملازمہ بنی رہوں، بچوں کی طرح بی ہیو کرتا ہے، گھر پہنچنے کے بعد پانی کا گلاس بھی اٹھ کر پینا اسے گوارا نہیں، مجھے تو لگ رہا ہے جیسے ایک بچہ پال رہی ہوں..... جو کبھی بڑا نہیں ہوگا، تمام عمر بچہ ہی رہے گا..... اب کم از کم اسے کچھ تو سمجھنا ہی چاہیے۔ ایک دو دن کیا کوتاہی ہوئی، اس کی شکایتیں شروع، پھر اماں تو سوال ہی پیدا نہیں کہ کبھی مجھ سے خوش ہو جائیں، کبھی انہیں میرے دیر سے اٹھنے پر اعتراض ہے تو کبھی کسی اور معمولی سی بات پر سب سمجھتی ہوں میں زچ کرنے کے بہانے ہیں.....'' بہت دنوں بعد اس کا دل کیا تھا ان سب کو لائن میں لگا کر خوب سنائے مگر جسے سنا سکتی تھی اسے سنا رہی تھی۔

''تم لوگوں میں سے کسی کو یہ احساس نہیں کہ میں بھی انسان ہوں..... تھک جاتی ہوں، شام کو واپس آتے ہی گھر دیکھو..... رات کا کھانا بناؤ..... صبح کے لیے کپڑے استری کر کے رکھو..... سوتے سوتے کتنی دیر ہو جاتی ہے..... اسے میرا تو احساس نہیں ہے کہ میں اتنا کرتی ہوں کم از کم ہیلپ اگر نہیں کروا سکتا تو احساس تو کرے نا..... مگر نہیں..... اسے تو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ مجھے چوبیس گھنٹے اس کے آگے حاضر رہنا چاہیے خادموں کی طرح جس طرح اس کے گوٹھ کی عورتیں ہوتی ہیں۔ اب وہ تو ورکنگ وومین نہیں، ہم پر تو سو ذمے داریاں ہیں۔'' وہ جب غصے میں آتی تو کہاں چپ ہوتی تھی۔

''اُف، ساحرہ..... کتنا سوچتی ہو..... اتنا سب سوچنے کے لیے وقت مل جاتا ہے تمہیں.....؟'' وہ لمبی سانس خارج کر کے ہنسی روک کر بولی۔

''کہہ دو اگر ایک بات بھی غلط کہی ہو تو.....؟'' اسے الٹا غصے آنے لگا۔

''دیکھو یار..... ایک بات ہے، اس کے گاؤں کی عورتیں ہم سے زیادہ مشقت کرتی ہیں..... میں تو دنگ رہ گئی، اتنے بڑے بڑے گھر..... ایک گھر میں



اتنے سارے لوگ..... پھر ان کا کھانا پینا..... گھر کی دیکھ بھال کا سارا انتظام، فصلوں میں الگ کام کریں..... مال مویشیوں کی الگ دیکھ بھال..... دیکھو تو کوئی چارہ کاٹ رہی ہے مشین میں، کوئی گھر بنا رہی ہے کچی مٹی جمع کر کے، دوپہر کو اتنی دھوپ میں زمینوں پر کام کر رہی ہیں، چلو زمیندار لوگوں کی بیویاں پھر بھی کچھ عیش میں ہیں مگر کسی بھی سہولت نہ ملنے پر بھی دن رات کی مشقت، بڑی بات ہے، ہمیں تو ہر طرح کی سہولت اور آزادی ہے..... ہماری زندگی تو ہر لحاظ سے بہتر ہے پھر حسن تو گریٹ آدمی ہے۔'' اس کے پاس اس کی بات کے خلاف مضبوط دلائل تھے۔

''بس بول چکیں..... حسن بھی مجھے اپنی بیوی کم خادمہ زیادہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے..... نیچر چاہے جتنی سوفٹ ہو مگر زمینداروں کا خون ہے اثر تو دکھائے گا نا..... تم نے کون سا ہر وقت اس کے خیالات ملاحظہ کیے ہیں۔'' وہ اپنے لیے جگ سے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے اسے جھڑکنے لگی۔

''یار، اب اتنا تو اس کا حق ہے..... تم پر پہلا حق اس کا ہے، دیکھو جو بھی ہو یہ سچائی ہے اسے تسلیم کرو کہ تم نے ضرورت سے زیادہ خود کو مصروف رکھ کر الجھا دیا ہے۔ گھر اور شوہر تو اولین ذمے داری ہے پھر بچوں کی بھی ذمے داری نہیں..... ان ماؤں سے پوچھو جو شوہروں کے ساتھ ساتھ درجن بھر بچے پالتی ہیں.....'' وہ بے ساختہ کہہ گئی تھی۔

''مانتی ہوں کہ محروم ہوں اس سعادت سے۔'' وہ پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے حد سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی..... اس نے اس کی کمزوری پر جو ہاتھ رکھا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ فوراً ہمیشہ کی طرح شرمندہ ہو گئی۔

''خیر ہے یار..... حقیقت ہے..... تسلیم کرنی چاہیے..... میں نے کچھ نہیں دیا اسے بقول اماں کے..... اور اب تو وقت بھی نہیں..... بقول اس کے۔'' وہ حسبِ معمول اس بات پر افسردہ سی ہو رہی تھی۔

''دیکھو خدا مہربان ہوگا تو کسی بات کی دیر نہیں۔''

''شاید میں اس قابل نہیں..... میں تو خدا کو راضی کرنے کا نسخہ ڈھونڈتی ہوں..... مجھ میں کیا کمی ہے امبر..... کیا میں ماں کہلوانے کے لائق نہیں.....؟'' اس کا دل بھر آیا تھا۔

''انتظار کرو ڈیئر..... امید تو زندگی ہے۔''

''کتنا انتظار امبر..... کتنا..... آٹھ سال تو ہو چکے اب تو..... حسن کو بھی.....''

''کیا حسن کو.....؟ اس نے کچھ کہا ہے تم سے؟'' وہ ڈر سی گئی۔

''نہیں امبر، ہر بات کہی نہیں جاتی..... مجھے لگتا ہے وہ مایوس ہو چکا ہے۔ اسے یہ کمی بہت محسوس ہوتی ہے اب..... میں دیکھتی ہوں..... محسوس کرتی ہوں..... وہ لاکھ اچھا سہی..... مگر..... خیر جانے دو..... تم بتاؤ کس لیے فون کیا تھا تم نے.....؟'' اس نے تھکتے ہوئے فوراً موضوع بدلا تھا۔

''بتاتی ہوں..... مگر تم بتاؤ..... اماں آئی ہوئی ہیں..... اُن کو تم نے کچھ کہتے سنا ہے کیا.....؟''

''اُن کے تیوروں سے تو یہی لگتا ہے کہ اب کی بار حسن کو راضی کر چھوڑیں گی..... بھلے وہ لاکھ انکار کرے..... مگر خواہش تو اس کے دل میں بھی ہوگی نا..... اس سے پہلے کہ وہ اپنی خواہش سے مجبور ہو..... مجھے خود اسے اجازت دے دینی چاہیے..... اگر وہ کہے گا تو مجھے زیادہ تکلیف ہوگی۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ساحرہ..... تم لوگ کوئی بچہ.....؟" وہ اس کی بات پر پریشان ہوکر کچھ سوچنے لگی۔

"نہیں امبر..... انہیں اپنا حقیقی وارث چاہیے..... اپنا خون، اپنی اولاد..... میں سمجھتی ہوں امبر..... مگر دل راضی نہیں ہوتا..... میرا حسن کے علاوہ دنیا میں ہے ہی کون..... ایک بھائی ہے جو پوچھتا بھی نہیں، میں اپنے آپ کو بعض اوقات بہت تنہا محسوس کرتی ہوں امبر....."

"میرے ہوتے ہوئے..... پھر حسن تمہارے ساتھ ہے اور رہے گا..... اور میرے خیال سے وہ تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے..... دیکھو وہ تمہیں کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا..... عشق کرتا ہے وہ تم سے، محبت تو دور کی بات ہے اور عشق کچا نہیں ہوتا..... اس پر بھروسا کرو یار۔"

"مجھے خود سے زیادہ اس پر بھروسا ہے..... بس تم دعا کرو امبر..... خدا کو کہو مجھے مزید مت آزمائے..... میں تھک گئی ہوں..... میں اپنے حسن کو کسی اور کو سونپ نہیں سکتی۔"

"تم فکر نہ کرو یار..... میرا دل کہتا ہے یہ خوشی تمہارے نصیب میں ضرور لکھی ہے، مجھ سے پوچھو کتنی منتیں مانی ہوئی ہیں میں نے۔"

"چلو کسی کی دعا کے صدقے ہی..... بس تم دعا کرو..... ہر نماز میں۔" اس نے التجا سی کی۔

"ارے پگلی میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں، اچھا سن تو سہی، میں کیا کہہ رہی تھی۔" اسے ایک دم سے یاد آیا۔

"ہاں بولو..... میں تو بھول گئی اپنی باتوں میں..... تم نے تو کھول ہی دیا آج مجھے کتنے دنوں کی بھڑاس تھی میرے اندر....." وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ مسکرائی تھی۔

"اب اس سے پہلے کہ میرا کریڈٹ ختم ہوجائے جلدی سے بات سنو میری، ابا جی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے چکر میں ہیں، تم لوگ کل آؤ پلیز انہیں سمجھاؤ..... میں تو تھک گئی ہوں..... میری نہ، نہ کا تو ان پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں..... روایتی باپ بن رہے ہیں۔"

"اگر اچھا ہے تو ٹھیک ہے یار..... ہاں کردو..... کیا مسئلہ ہے؟"

"واہ تم تو ابا سے بھی تکڑی (جلدی میں) ہو، حد ہے یار۔"

"اچھا، اوکے میں کہوں گی حسن کو۔ ہم آتے ہیں وقت نکال کر۔"

"ہرگز نہیں، لازمی آنا ہے اور ہاں سنو، ابا جی کی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت نہیں اور تم پلیز حسن....." رابطہ اچانک کٹ گیا۔

"ہیلو..... اوہ..... لائن کٹ گئی..... ہم آئیں گے فکر نہ کرو..... ہتھیلی پر سرسوں جما کر ہی آئیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے ٹیکسٹ لکھا اور تصور میں اس کا غصیلہ چہرہ دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحبہ..... مریضوں کو نمبر دے دیا ہے اندر لے آؤں؟"

"ہاں لے آؤ، اب میں فری ہوں۔" وہ سیل پرس میں ڈال کر سیدھی ہوبیٹھی..... دل سے جیسے بوجھ کم سا ہوگیا تھا۔

☆☆☆

"حسن کیا تمہارے دل میں کچھ ہے؟" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بہت سوچتے ہوئے آہستہ سے بول پڑی۔

"تمہارے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھنے لگا۔



"میرے علاوہ..... تمہاری خواہش..... تمہاری ضروریات.....؟"

"جو تم سے ہی وابستہ ہیں..... کیا تمہیں شک ہے؟"

"نہیں حسن..... مگر اماں بھی شاید ٹھیک کہتی ہیں..... دیکھو اگر تمہارا دل کہے تو تم کرلو....." وہ اپنے اوپر ضبط باندھ رہی تھی۔

"کیا کرلوں؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا جہاں صرف اور صرف ڈر تھا۔

"شادی....." اس نے بڑی ہمت کے ساتھ کہا تھا۔

"معلوم ہے کیا کہہ رہی ہو.....؟ کیا تمہارے لیے یہ سوچنا بھی آسان ہے؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا یار..... تم نے کہہ کیسے دیا۔"

"پھر یہ تو تمہارا حق ہے، میں تمہیں کیسے روک سکتی ہوں۔" اس نے نگاہیں چرائیں۔

"میں نے تمام حق تمہیں دے رکھے ہیں جو میں تم سے چھیننے کا تصور بھی نہیں کرسکتا..... میری اور اپنی زندگی مشکل نہ بناؤ پلیز..... آئندہ کبھی ایسی کوئی بات کہنا تو دور کی بات سوچنا بھی نہیں ہے۔"

"مگر پھر....." وہ بری طرح الجھی ہوئی تھی۔

"ہم انتظار کریں گے۔" وہ اسے امید دکھانے لگا۔

"کتنا..... کب تک؟" وہ یقین چاہتی تھی۔

"ہمیشہ..... تمام عمر....." اس نے اس کی آنکھوں میں ایک دیا رکھ دیا تھا روشنی کا۔

"تھک جاؤ گے.....؟" وہ خود تھکی ہوئی تھی۔

"تمہاری محبت ساری تھکن دور کردے گی۔" اس نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"تمہاری محبت میری زندگی ہے، مجھ سے زندگی کبھی مت چھیننا۔" اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے تو ساری تھکن دور ہونے لگی۔

"اور کبھی اس محبت پر شک مت کرنا..... ہمیشہ یقین رکھنا۔"

"میں نے تمہیں بہت کم وقت دیا ہے۔" اسے فوراً سے احساس ہوا تھا۔

"پہلی دفعہ ہے اس لیے معاف کرتا ہوں..... آئندہ نہیں..... میرا خیال رکھا کرو....." وہ آنکھ دبا کر مسکرایا شرارت سے۔

"کبھی تم بھی رکھا کرو....." اسے شکایت تھی جو سامنے آگئی۔

"رکھ تو رہا ہوں..... آٹھ سال سے اور ہمیشہ رکھوں گا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح عہد کیا۔

وہ دونوں ایک عہد میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ عہد جسے محبت کہتے ہیں۔

☆☆☆

"امبر..... امبر میں اس سے مل چکا ہوں، میں نے اس سے بات کی ہے، میں نے اس کی فیملی دیکھی ہے..... اس کا گھر دیکھا ہے، سب کچھ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ انکل کے دوست کا بیٹا ہے۔ وہ سب کچھ اچھی طرح سے جانتے ہیں اور پھر دیکھو انکار کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے، تمہارے پاس....." وہ ہر حالت میں اسے قائل کرنا چاہ رہا تھا، اس کی نظر میں وہ ہر طرح سے پرفیکٹ تھا۔

"حسن تم اس کا مزاج دیکھو، اس کی باتیں سنو، کیا اکھڑ مزاج اور ٹیڑھا بندہ ہے وہ..... تم مل چکے ہو..... تم نے بات کی ہے اور تم ہر طرح سے مطمئن ہو کر آگئے اتنی جلدی..... تم سب لوگوں کو بس مجھے رخصت کرنے کی جلدی ہے۔" وہ پوری طرح سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غیر مطمئن تھی۔

"کیا ہوا..... کچھ حل ہوا؟" وہ دونوں کے لیے کوک لے کر اندر آئی تھی..... اور دونوں کے موڈ دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

"وہی ضد ہے..... مرغی کی ایک ٹانگ..... اب تم ہی سمجھاؤ اسے یار..... میری تو ایک نہیں مانتی یہ۔" وہ اپنے حصے کی کوک لے کر اس سے کہنے لگا۔

"تمہیں کس بات پر اعتراض ہے امبر؟" اسے بھی اس کی ضد فضول ہی لگی تھی۔

"میں پیسی ناپسند کرتی ہوں....." اس نے انکار کر دیا، "ٹرے ہٹا کر..... یار تم نے ابا جی کو دیکھا ہے، اتنی جلد بازی..... وہ مجھ سے پوچھنا بھی نہیں چاہتے..... سب کچھ ایک دم سے طے کر بیٹھے ہیں..... پتا نہیں کیا نظر آ رہا ہے انہیں اپنے دوست کے بیٹے میں جو مجھے نظر نہیں آتا۔"

"ان کی نظر سے دیکھو تو سب کچھ نظر آئے گا۔" وہ اپنا گلاس لے کر بیڈ پر اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا....." وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے رخ پھیر کر بیٹھی تھی ناراضی سے۔

"یہی تو بات ہے کہ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔" وہ ساحرہ کو اشارہ کر کے مسکرانے لگا۔

"تو ہم انکل کو کہیں انکار کر دیا جائے مگر تم صرف ایک ٹھوس وجہ بتاؤ۔"

"کر دو میری بلا سے، حد ہے یار..... بلیک میلنگ کی....." وہ دونوں کے اشارے دیکھ رہی تھی۔

"تم جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو، ہم یہی چاہتے ہیں، دشمن نہیں ہیں تمہارے..... اپنا مائنڈ فریش کرو اور جو کنفیوزن ہے اسے دور کرو۔"

"یہ کنفیوزن پتا نہیں دور ہو گی بھی کہ نہیں۔" وہ چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔

"میرے خیال سے تمہیں اس سے ایک دفعہ بات کر لینی چاہیے..... بلکہ چاہو تو مل لو....." وہ اسے آسان سا حل بتا رہا تھا۔

"ایویں ہی میں بات کیوں کروں..... اسے کرنی ہے تو خود کرے۔"

"مطمئن وہ ہے، تم نہیں ہو اس لیے بات بھی تم ہی کرو، میرے خیال سے بلاوجہ کی ضد باندھی ہوئی ہے تم نے..... ریلیکس ہو کر سوچو۔"

"یار، تم لوگوں نے اس کی فیملی دیکھی ہے..... کیسے خیالات تھے اُن کے۔"

"وہ الگ گھر لے چکا ہے..... تم الگ رہو گی..... پھر جاب بھی زبردست ہے۔" میرے خیال سے انکار کی گنجائش تو نہیں ہے..... پھر بھی سوچو۔"

"تم لوگ سوچنے کا وقت تو دو مجھے..... ایک طرف ابا..... دوسری طرف اُن کے طرف دار۔"

"اچھا ٹھیک ہے..... سوچو اچھی طرح سے..... کوئی جلد بازی نہیں ہے۔ پلیز ساحرہ اس کی زندگی ہے، اسے فیصلہ کرنے دو۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے اٹھا..... چلو میں چلتا ہوں..... دیر ہو رہی ہے اماں گھر پر اکیلی ہیں..... تم یہاں رہو تو ٹھیک ہے۔"

"نہیں، میں بھی چلوں گی..... اب جو بھی سوچو ہمیں صرف اطلاع کر دینا۔"

"تم دونوں خفا ہو کر جا رہے ہو؟" وہ دونوں کو اٹھتا ہوا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"نہیں..... ہماری خیر ہے..... انکل اپنے کمرے میں اکیلے ہیں..... ان کے پاس جا کر بیٹھو..... اور آرام سے بات کرو، انہیں قائل کر دیا اُن کی مانو، یہ اب تم پر ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے



باہر نکلی۔

"یہ راضی ہے بس کنفیوز ہے، میں اسے کہتا ہوں اس سے بات کر لے ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ..... انکل کو میں ہاں کہہ آیا میں اس کے لیے برا تو نہیں سوچ سکتا۔" وہ دونوں دروازے کے باہر کھڑے تھے۔

"بہت خوب..... سازشی انسان....." وہ دروازہ کھولے سب کچھ سن چکی تھی۔ وہ دونوں کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے باہر نکلے۔

☆☆☆

"مومنہ تو اب چلنے لگی ہے، ٹانگ کا زخم بھی بہتر ہے..... ہے نا، بہتر ہے نا.....؟" وہ نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اسے حوصلہ دینے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر پہلی بار اس نے مسکراہٹ دیکھی تھی اور وہ خوش ہو گئی۔

"گڈ..... ابھی تو میں صرف مومنہ کا نام جانتی ہوں، پھر مجھے ایڈریس بتاؤ تاکہ میں آج تمہیں اپنے گھر پہنچا آؤں....." وہ پلنگ کے سرے پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"گھر....." وہ ایک لفظ کے بعد گہری خاموشی میں ڈوب گئی۔

"کیا مجھے نہیں بتاؤ گی؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟" وہ اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔

"کہیں نہیں....." اس کا سر جھک گیا تھا۔

"اِدھر دیکھو..... میری طرف..... گھر نہیں جانا۔" اس نے گردن نفی میں ہلائی، اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، وہ رو دینے کو تھی۔

"کیوں نہیں جانا؟" ساحرہ نے اس کا گال چھوا بچوں کی طرح..... وہ اسے اس وقت ایک سہمی ہوئی معصوم بچی لگ رہی تھی۔

"وہ..... مجھے ماردیں گے..... وہ ماردیں گے..... اسے بھی مار دیا..... مجھے بھی ماردیں گے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رو دی۔

"کسے مارا ہے؟ کیوں ماریں گے.....؟ مجھے بتائیں۔" وہ اسے خود سے لپٹا کر پوچھنے لگی۔

"ماردیں گے..... ماردیا....." وہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، وہ اسے خود سے لپٹاتے ہوئے تسلی دے رہی تھی، وہ چاہ رہی تھی کہ پہلے وہ خوب رو لے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔

☆☆☆

"مس امبر سے بات ہو سکتی ہے؟" لہجہ ٹھہرا ہوا اور دھیما تھا۔

"آپ اپنا تعارف کرائیں۔" وہ ابھی سونے کی کوشش ہی کر رہی تھی مسلسل بجتی بیل نے فون اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"آپ امبر ہیں نا؟" لہجے میں چہک تھی۔

"میں نے اپنا نہیں، آپ کا نام پوچھا ہے عشان صاحب۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"گویا آپ جانتی ہیں کہ میں نے فون کیا ہے، یعنی آپ کو میری کال کا لاشعوری طور پر انتظار تھا پھر بھی آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں..... گڈ۔"

"ہرگز نہیں..... مجھے حسن نے کہا تھا کہ آپ کال....." وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ گئی۔

"اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کال کروں، آپ بات کرنا چاہتی ہیں۔" لہجہ شرمندہ کر دینے والا تھا۔

"میں کیوں بات کروں گی..... آپ نے کال کی ہے آپ ہی بات کریں۔"

"تو گویا آپ سنیں گی..... ٹھیک ہے..... میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عشان احمد، اپنے ماں باپ کا لاڈلا چھوٹا بیٹا۔

"پلیز..... مجھے یہ سب نہیں سننا....." وہ سانس لینے کو رکا تو وہ ٹپک پڑی۔

"پھر آپ کیا سننا پسند کرتی ہیں..... مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، انکار کی کوئی تو وجہ ہوگی۔"

"میں آپ کو جوابدہ نہیں ہوں..... انکار کا ریزن میں صرف اپنے ابا جی کو بتا سکتی ہوں، ہر کسی کو نہیں اگر یہی پوچھنے کے لیے فون کیا ہے تو بائے۔"

"ارے رکیں..... پلیز..... امبر مجھ میں کیا برائی ہے۔"

"آپ میں کوئی برائی نہیں۔"

"کیا یہی ریزن ہے کہ مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے؟ اگر ہاں تو میں آپ کو اپنی ساری خامیاں بتاتا ہوں..... دیکھیے..... میں نہانے کے بعد تولیا بیڈ پر پھینک دیتا ہوں، پورے کمرے میں چیزیں بکھری پڑی رہتی ہیں۔ ریک میں کتابوں کی جگہ سینڈیز ہیں چونکہ میں کتاب پڑھتا نہیں..... اس کے علاوہ میرے پورے فلیٹ میں ادھر کی چیز ادھر..... اور صوفوں پر بکھری پڑی ہیں..... ڈسٹنگ کے معاملے میں کورا ہوں..... مگر کوکنگ میں انڈا اور ابلی ہوئی مرغی پکا لیتا ہوں..... یہ خوبیاں ہیں اور چند خامیاں۔" وہ نان اسٹاپ شروع ہوا تو ختم ہونے کا نام نہیں تھا۔

"آپ کو یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ بہت زیادہ بولتے بھی ہیں مگر تھینکس گاڈ کہ کوئلے کے علاوہ بھی آپ کسی اور خیال پر بول لیتے ہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"امبر آپ مجھ سے شادی کریں گی نا؟" حد درجہ معصومیت سے سوال کیا۔

"آپ سے کس نے کہا؟" اسی معصومیت سے جواب ملا۔

"میرے دل نے۔" اس نے لمبی سانس بھری۔

"میں نے تو نہیں کہا نا؟" وہ ہنس دی۔

"کہنے کی کیا ضرورت رہی اب..... دیکھیے امبر جب تک ہم شادی نہیں کریں گے..... اِک دوسرے کے ساتھ رہیں گے نہیں..... تو سمجھیں گے کیسے..... بھلا۔"

"ضروری نہیں کہ آپ کی شادی مجھ سے ہی ہو، دنیا میں اتنی لڑکیاں ہیں..... ساری..... آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں، ان پر نگاہ کیجیے میری فکر مت کریں..... بائے....." اس نے جھنجلا کر فون رکھ دیا۔ بیل پھر سے بجنے لگی۔

"اب کیا ہے؟" وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"ابھی سے اس انداز میں بات مت کیجیے خدارا..... ڈرتا ہوں....."

"عشان میں تو آپ کو خاصا سنجیدہ سا بندہ سمجھتی تھی..... مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ اتنا فضول بولتے ہیں، بہر حال مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے..... پلیز اب فون مت کیجیے گا۔" اسے شدید قسم کی نیند آ رہی تھی۔

"آپ پہلے ہاں کریں..... ورنہ میں ساری رات فون کروں گا۔"

"میں سیل فون بند کر کے سو جاؤں گی ویری سیمپل....." اس نے شانے اچکائے۔

"میں اس وقت گھر آ جاؤں گا ویری سیمپل۔" اس کے پاس حل تھا۔

"ہارن بجاتے رہنا..... میں گیٹ نہیں کھولوں گی، ویری سیمپل....."

"امبر اس وقت کس سے بات ہو رہی ہے بیٹا؟" ابا جی نے پاس سے گزرتے ہوئے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔



"آں..... وہ ابا جی کوئی نہیں....." اس نے فوراً فون کاٹا۔ "ویسے ہی....."

"سو جاؤ بیٹا دو بج رہے ہیں..... میں پانی لینے کے لیے باہر نکلا تھا۔" وہ تنبیہ کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ اس نے فون آف کیا اس سے پہلے کہ اس کی تیسری کال آتی اور سونے کی کوشش کی..... انکار اقرار میں بدل چکا تھا۔

☆☆☆

"تم اسے گھر لے آئیں..... میرے کہنے اور منع کرنے کے باوجود بھی..... مجھ سے بات تک نہیں کی تم نے....." وہ کھانے کی میز پر تو خاموش رہا مگر اندر آگ بری طرح بھڑکنے لگا۔

"حسن وہ بہتر تھی تو لے آئی۔"

"تو اسے اپنے گھر پہنچا دینا تھا..... مجھے بتاؤ اس کا گھر کہاں ہے، میں ابھی اسے چھوڑ آتا ہوں چلو میرے ساتھ۔"

"ابھی حسن.....؟" اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اسے کیسے قائل کرے۔

"نہیں، صبح ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔" لفظ چبا چبا کر ادا کیا گیا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بیڈ تک آئی۔ "آف لائٹ بند کر دو۔"

"ساحرہ مجھے جواب دو، یہ سب کیا ہے؟"

"حسن پلیز..... کچھ دنوں کے لیے..... میں سوچ رہی ہوں اسے دارالامان پہنچا آؤں..... اس کا کوئی گھر نہیں ہے۔" وہ اس وقت تفصیل بتانے کے موڈ میں نہیں تھی مگر اسے پتا تھا کہ جب تک اسے بتا نہ دے وہ چپ نہیں ہوگا۔

"حسن وہ لوگ اسے مار دیں گے..... میں اسے وہاں نہیں لے جا سکتی۔"

"وہ گھر سے بھاگی ہے؟" اپنے کپڑے ہینگ کرتے ہوئے وہ ٹھٹکا، اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

"ہاں، اس کی زبردستی اپنے بھائی کے وٹے سٹے میں..... شادی غلط لوگوں میں کی جا رہی تھی اور جس کے ساتھ وہ گھر سے نکلی تھی وہ اس کا بچپن کا منگیتر تھا، اس کا کزن بھی مگر رستے میں اس کو مار دیا گیا..... یہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگی تھی۔"

"گڈ..... اسے مار دیا گیا اور وہ رستے میں اسے چھوڑ کر بھاگ نکلی..... اس سے پہلے گھر سے بھاگنے کا بہانہ وہی تھا..... اس نے ایک فرضی کہانی گھڑ دی..... اور تم نے یقین کر لیا..... میں نہیں کر سکتا..... مجھے تو وہ فراڈ لگتی ہے اور تم اسے میرے گھر لے آئیں..... بہت اچھا کیا۔" وہ وارڈ روب سے اپنا نائٹ ڈریس نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ بند کی اور لیٹ گئی..... اب اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے یقین دلائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جو بھی ہے، اسے کل فارغ کر دو..... دارلامان لے جاؤ یا کہیں بھی۔'' وہ چیخ کر کے بیڈ کے ایک سرے پر آکر لیٹ گیا اور رکھائی سے بولا۔

''ہاں، اس کے ساتھ میں اسے بتاؤں گی کہ دیکھو ہم چاہے جتنے محلوں میں رہیں ہمارا آدھے سے زیادہ گھر خالی پڑا ہو مگر معذرت کے ساتھ ہمارے دل اتنے بڑے نہیں کہ ہم چند دن کسی بے سہارا کو ٹھہرا لیں۔''

''وہ بے سہارا نہیں..... اس کے ماں باپ ہیں..... وہاں چھوڑ دو۔''

''ہاں باپ! ایسے ہوتے ہیں ماں باپ.....؟ جو اسے جان سے مارنا چاہتے ہیں.....''

''ایسی ہوتی ہیں بیٹیاں جو یوں گھروں سے والدین کا نام روشن کرنے نکلتی ہیں۔ تمہیں تو وہ شروع سے اچھے گھرانے کی لگتی تھی نا..... ایسی ہوتی ہیں اچھے گھرانے کی لڑکیاں..... دھول جھونکنے والی۔'' وہ بری طرح بگڑ گیا۔

''کیوں مجبور کرتے ہیں وہ اپنی اولاد کو بغاوت پر..... بتاؤ..... اگر حقوق دیں اور خیال رکھیں تو وہ ایسا کیوں کرے..... دیکھو، ہم کوئی ایسی حرکت کیوں نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے والدین نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا۔ ہماری زندگی کے لیے بہتر سوچا، بہتر چاہا، بہتر کھلایا، بہتر پالا، ہم آج کامیاب انسان ہیں اگر والدین چاہیں تو بچے کیوں بگڑیں گے اور پھر وہ معصوم سی بچی تمہیں فراڈ لگتی ہے..... کتنے افسوس کی بات ہے، ہفتہ بھر سے وہ بے چاری ہماری نظروں کے سامنے بے بس پڑی تھی، ہم اسے فراڈ کیسے کہہ سکتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے..... میں زیادہ الجھنا نہیں چاہتا بس اسے دارلامان چھوڑ آؤ بحث ختم.....'' وہ دوسری طرف رخ پھیرے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

''حسن..... کیا ہم اسے چند دن تک یہاں نہیں رکھ سکتے..... کیا یہ گھر میرا نہیں ہے؟ کیا مجھے حق نہیں اپنے گھر میں کسی کو ٹھہرانے کا..... دیکھو، میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، ہمیں اس سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوگا اگر کچھ غلط ہوا بھی تو میں سنبھال لوں گی۔''

''مگر یہ چند دن..... ہفتوں..... اور ہفتے مہینوں میں نہیں بدلنے چاہئیں..... ورنہ میں خود اسے چھوڑ آؤں گا۔'' اس نے وارننگ دینا ضروری سمجھا حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ وہ کرے گی وہی جو سوچے گی اور اسے قائل بھی کرلے گی۔ بڑی بات یہ تھی کہ وہ اس سے بحث میں بھی نہیں جیت سکتا تھا۔

''تھینک یو ڈیئر.....'' اس کے سر سے جیسے بوجھ سا اترا تھا، اس کی اجازت ملتے ہی۔

''اب سر دبا دو پلیز.....'' وہ سیدھا لیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

''گلا نہ دبا دوں؟'' اسے شرارت سوجھی ہمیشہ کی طرح۔

''تم سے یہی امید کی جا سکتی ہے۔'' وہ مسکراہٹ روک کر اسے گھورنے لگا۔

''چلو کیا یاد کرو گے، دبا دیتی ہوں۔''

''کیا..... سر یا گلا؟''

''جو بھی کہو گے.....'' وہ ہنستے ہوئے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے سر دبانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔ اس نے اپنی چادر اور تکیہ اٹھایا اور نیچے کارپٹ پر آ گئی..... اس کے خراٹوں کے شور میں جو نیند آنے لگی تھی اس کے بھی اڑ جانے کا اندیشہ تھا..... وہ منہ لپیٹے سو تی بنی۔ صبح ناشتے پر ماں کا موڈ بے حد خراب تھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں





# بہنوں کی محفل

مدیرہ

عزیز از جان بہنو.....! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

اس وقت پاکستان میں شادیوں کا موسم ہے۔ عید کے فوراً بعد عید ملن پارٹیز کا زور اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ شادیوں کا ہوتا ہے۔ محلوں میں تو رنگ برنگی قناتیں لگی نظر آتی ہیں بلکہ بے حد خوب صورت شامیانے لگے ہوتے ہیں۔ مایوں کے پیلے رنگ میں، مہندی کے سبز رنگ میں، شادی کے میرون کلرز میں اور ان کی سجاوٹ اتنی شاندار ہوتی ہے کہ بندہ دیکھتا ہی رہ جائے۔ اسی طرح اس موسم میں آپ کو بڑے شہروں میں کوئی میرج ہال خالی نظر نہیں آئے گا۔ ہر ہال میں خوب صورت بنی سنوری دلہن نظر آئے گی کہ بیوٹی پارلرز ہر لڑکی کو خوب صورت بنا دیتے ہیں اور یہ ہر لڑکی کا حق بھی ہے کہ وہ خوب صورت دکھائی دے۔ گو اپنے آپ کو سجانا سنوارنا ہر لڑکی کو خود آنا چاہیے اور اس کے لیے ہزاروں روپے برباد کرنے کے بجائے اپنے کام میں لانے چاہئیں۔ یہ نکتہ کچھ کی سمجھ میں آ گیا ہے اور کچھ کو بعد میں آ جائے گا۔ مہنگائی کا طوفان جس تیزی سے اچھلتا ہوا آ رہا ہے اور سب ہی کو نقصان پہنچا رہا ہے اس لیے امید یہی ہے کہ دیر سے ہی سہی مگر عقل کے ناخن سب کو لینے ہی ہوں گے۔

٭ ٭ ٭

پاکیزہ کی معروف شاعرہ اور تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ کے تیسری بیٹی ہوئی ہے (ماشاء اللہ) مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ ہماری اس پیاری سی بہن نے جب اپنی بچی کی خوشی کی مٹھائی بانٹی تو اکثر لوگوں نے کہا کہ سعدیہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو اپنی تیسری بیٹی کی مٹھائی بانٹ رہی ہیں اور بعض لوگ ان کے ہاں مبارک باد دینے اس وجہ سے نہیں آئے کہ یہ خوشی کا مقام تھوڑی ہے جو مبارک باد دی جائے اور ایسے لوگوں میں پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ کسی کی خوشی میں شریک ہونا نیکی کے زمرے میں آتا ہے اور ہمیں اپنے ذہنوں میں لگے جالوں کو وقتاً فوقتاً خود ہی صاف کرتے رہنا چاہیے تاکہ اپنی زبان سے ایسی بات ہرگز نہ کی جائے جو کسی کو خوشی عطا کرنے کے بجائے دکھ دے۔

پاکیزہ کا آئندہ شمارہ محبت نمبر اور دسمبر کا شمارہ نئی مصنفات نمبر ہوگا۔ تمام نئی مصنفات سے استدعا ہے دلچسپ، گھریلو اور معاشرتی موضوعات پر اپنے مختصر افسانے ارسال فرمائیں۔ اپنے افسانے اور دیگر مراسلات بھیجنے کے لیے ہمارا ایڈریس آپ نوٹ کر لیجیے۔ اکثر بہنوں کے یہ بھی فون آتے ہیں کہ انہیں پاکیزہ میں ایڈریس نظر نہیں آ رہا۔ مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ 63-C فیز 2 ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ،



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراچی 75500۔ ہم سے رابطے کے لیے فون نمبر 021-36981952

پاکیزہ کے ابتدائی صفحے پر قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی شائع کیے جارہے ہیں۔ جو آپ سب کے لیے ایک آگاہی کا درجہ رکھتے ہیں۔

اور آیئے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درود ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ (ابھی پڑھ لیں)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

## ﴿مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں﴾

☆ ہماری مایہ ناز مصنفہ شکیلہ رفیق ان دنوں کینیڈا سے کراچی آئی ہوئی ہیں اور اب وہ سیر و تفریح کی غرض سے دس دنوں کے لیے ملائشیا اور سنگاپور جانے والی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ شاعرہ شگفتہ شفیق مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے کینیڈا روانہ ہوگئیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ نیویارک میں مقیم نامور شاعر مشیر الحسن طالب اور زیبی مشیر ایک پیاری سی پوتی کے دادا، دادی بن گئے ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ثمر خان، امریکا ایک پیارے سے بیٹے کی ماما بن گئیں۔ بیٹے کا نام آریان رکھا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار عائشہ سلیم، لاہور کا نکاح ہوگیا ہے اب یہ رخصت ہوکر سعودی عرب جائیں گی۔ انشاءاللہ (بے شمار دعائیں اور مبارک باد)

☆ ہماری پیاری سی شاعرہ شگفتہ شفیق نے ٹورنٹو سے ہمیں فون کرکے بتایا کہ ان کے اعزاز میں وہاں مستقل تقاریب ہورہی ہیں اور ان کی شاعری کو بے حد سراہا جارہا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ ان دنوں پاکیزہ کی مستقل قاری ارم ثاقب اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اپنی نند کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے نیویارک سے لاہور آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار کوثر خان، کراچی کے ہاں ایک پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ، تبصرہ نگار ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ جس کا نام انشراح رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد) سعدیہ ہما شیخ کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ان کی کم سن بیٹی حورالعین نے رمضان کے روزے رکھے۔ (ماشاءاللہ)

☆ محترمہ عذرا رسول کے بیٹے ذیشان رسول نے اس سال رمضان میں اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی۔ (ماشاءاللہ)

☆ مصنفہ اقبال بانو کے کم سن بیٹے ٹیپو نے بھی اس سال رمضان میں اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی بے شمار قاری بہنیں اس سال اعتکاف میں بیٹھیں، آپ سب کو بے حد مبارک باد۔



☆ ہمارا ناول محبت ہم سفر میری ان دنوں طباعت کے مرحلے طے کررہا ہے۔ اپنی کاپی بک کروانے کے لیے اس نمبر پر فون کیجیے۔ 042-37652546۔

☆ ہماری نئی کتاب انمول خزانے اور آزمودہ ٹوٹکے اور وظائف شائع ہوچکی ہے۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے فون کیجیے 042-37652546 یا پھر ہم سے رابطہ کیجیے اس فون نمبر پر 021-36981952

☆ ہماری طنز و مزاح کی نئی کتاب کھری کھری حاصل کرنے کے لیے علامہ عبدالستار عاصم سے اس نمبر پر آپ رابطہ کرسکتی ہیں 0333-4393422

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز نظیم، کراچی اپنی نئی کوٹھی میں بہت جلد شفٹ ہورہی ہیں۔ (ماشاءاللہ بہت ساری دعائیں)

☆ ہماری بے حد پیاری قاری بہن نگار حسین (جو ہوٹل آواری کراچی) میں جاب کرتی ہیں۔ ان کا نکاح انڈیا میں ہوا۔ دولھا شیراز یو کے سے انڈیا پہنچے اور انشاءاللہ تین ماہ بعد ہماری پیاری نگار حسین رخصت ہوکر انگلینڈ چلی جائیں گی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ مصنفہ خالدہ نسیم ان دنوں یو کے سے اپنے بیٹے کے پاس نیوزی لینڈ گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاءاللہ) ان سے متعلقہ دوسری نیوز یہ ہے کہ گزشتہ دنوں خالدہ نسیم نے عمرے کی سعادت حاصل کی ہے۔ (خالدہ نسیم آپ کے لیے بے شمار دعائیں ہیں)

☆ مسز پریسا احمد خان، کراچی شادی کے بعد پہلی عید بہت بہت مبارک ہو۔

☆ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی آپ کو اپنی بھانجی کاشفہ کی منگنی بہت مبارک ہو۔

☆ پاکیزہ کے مستقل قاری سید مظفر علی اور بیگم ثریا علی کی پیاری سی بیٹی صبا سرفراز علی کے ہاں پیارا سا بیٹا ہوا ہے۔ جس کا نام ریان علی رکھا گیا ہے۔ آپ سب کو بے حد مبارک۔

☆ انیلا قریشی، اسلام آباد ریڈیو سے روزانہ دوپہر تین بجے سے چار بجے تک دھنک کے نام سے پروگرام پیش کرتی ہیں۔ 5 ستمبر سے انہوں نے اس پروگرام میں طنز و مزاح کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کا نام ہمارے طنز و مزاح کے مقبول سلسلے جلترنگ سے متاثر ہوکر جلترنگ ہی رکھا ہے۔ جلترنگ کے پہلے پروگرام میں انیلا قریشی نے ٹیلی فون پر نہ صرف ہمارا انٹرویو لیا بلکہ جلترنگ کا ایک خاکہ بھی سنایا (انیلا آپ کی اس محبت کے لیے ممنون ہوں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز سین فیصل، لاہور کے ہاں گزشتہ ہفتے ایک پیاری سی بیٹی ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ دبئی میں مقیم مایہ ناز شاعرہ رخسانہ ریاض رخشی کی پیاری سی بیٹی عائزہ ریاض طالبہ ابن سینا اسکول دبئی نے اپنے اولیول کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ (ماشاءاللہ)

☆ اسلام آباد میں مقیم میری پیاری بھتیجی صفیہ سہیل، طالبہ آئی ایم سی جی نے اپنے فرسٹ ایئر انجینئرنگ کے امتحان میں اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔ (مبارک باد)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆ ہماری پیاری مصنفہ رضوانہ پرنس کی چار کہانیوں پر بنائے گئے ڈرامے جیو چینل سے زندگی کا بھاؤ بڑھ گیا ہے میں دکھائے گئے اور ناظرین کی ایک بڑی تعداد نے انہیں بے حد پسند کیا۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی ایک نئی مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد ان دنوں بستر علالت پر ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے آپ دعا کریں۔ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔

☆ پاکیزہ کی افسانہ نگار تسنیم منیر علوی، دبئی کے شوہر جناب منیر علوی ان دنوں شدید بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے آپ سے دعا کے لیے التماس ہے۔

☆ شاعرہ فریدہ خانم، لاہور ان دنوں بہت سے مشاعروں میں شرکت کر رہی ہیں اور بے حد داد پا رہی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ شگفتہ شفیق کو کینیڈا میں ہونے والے مشاعرے میں جناب تسنیم الٰہی زلفی نے بلایا تھا۔ شگفتہ ویزا دیر سے ملنے کے سبب مشاعرے میں تو شاید شرکت نہیں کر سکیں گی مگر وہ کینیڈا جا چکی ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز حمیدہ مجیب اور جناب مجیب الرحمٰن کی پیاری سی بیٹی اور بیگم اقبال خلیل کی لاڈلی پوتی ڈاکٹر ثنا مجیب کی رخصتی جنید ہمایوں کے ساتھ 10 ستمبر کو ہل ٹاپ لان، کراچی میں ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شبانہ وحید، پنجاب کے بیٹے کا نکاح سعودی عرب میں ہوا۔ شبانہ بھی ان دنوں جدہ گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ☆ ☆

ساجدہ حبیب، راولپنڈی سے۔ ”ہائی ٹی کی تفصیل میں محترمہ عذرا رسول کی تصویریں دیکھ کر ایک دھچکا سا پہنچا‘ وہ مجھے بے حد کمزور سی لگیں۔ معراج رسول صاحب کی علالت کی وجہ سے ان پر دوہری ذمے داریاں ہیں اس کا اثر ان کی صحت پر بھی پڑ رہا ہوگا۔ انجم سے میں نے فون پر بات کی تو انجم نے بتایا کہ وہ رجب کے روزے باقاعدگی سے رکھنے کی عادی ہیں اس وجہ سے آپ کو دبلی لگیں۔ اور جب عذرا رسول کا میرے پاس فون آیا تو ان سے بات کر کے مجھے نہ صرف تسلی ہوئی کہ اب ان کی صحت بالکل ٹھیک ہے بلکہ ان کی ہمت کی بھی قائل ہوگئی بے شک وہ تمام مصنفات کو بے حد عزت دیتی ہیں۔“ (جی ہاں)

شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”کل آپ سے فون پر بات ہوئی اور میں روزوں میں اس طرح تازہ دم ہوئی جیسے بریانی کی کوئی ڈش کھالی ہو۔ پاکیزہ جلدی ختم کیا تو سوچا تبصرہ بھجوا دوں۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں عید کے متعلق معلومات اور بہت اچھی نصیحتیں تھیں۔ ہمیشہ کی طرح یہ متاثر کن تھا۔ دین کی باتیں دل میں اثر پیدا کر دیتی ہیں۔ عکس سے ابتدائی ناول کی اٹھان اچھی ہے، کہانی منفرد ہے آگے چل کر اچھی رفتار پکڑ سکتی ہے ویسے بھی عمیرہ احمد کا نام ہی کافی ہے۔ شیشوں کا مسیحا، کرداروں کی بھرمار کی وجہ سے پسند نہیں آیا، اتنے زیادہ کردار ہوں تو لکھنے والا سب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا اور قاری بھی کنفیوز ہو جاتا ہے۔ راحت وفا کا ناول



ایک ننھی نیناں پسند نہیں آیا، زیادہ میچور تحریر نہیں ہے۔ مجھے سب سے زیادہ پسند جو تحریر ہمیشہ آتی ہے وہ عالیہ بخاری کی خوشبو کا سفر ہے۔ دل چاہتا ہے اس ناول کی قسط ختم ہی نہ ہو یہ بالکل نہیں لگتا کہ ہم کوئی افسانہ یا ناول پڑھ رہے ہیں۔ یہ سارے کردار بالکل عام سے کردار لگتے ہیں جو ہمارے آس پاس رہتے ہیں۔ سب سے پیارا کردار زارا کا ہے عالیہ کو کہیں اس کی اقساط بڑھالیں، یہ ختم ہو گیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ باقی شمارہ اچھا تھا بس ہر کہانی عید پر تھی جبکہ ابھی بھی آٹھ روزے رہتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں خالی پیٹ کہاں عید کے تذکرے اچھے لگتے ہیں اور ویسے بھی کوئی افسانہ متاثر کن نہیں تھا.... معذرت، سب سے اچھا اور ہمیشہ کی طرح متاثر کن جلترنگ رہا، تھن چکر بہت زبردست رہا۔ ایسی خواتین ہمارے اردگرد بہت سی ہیں جو اتنی چھوٹے سے سوال کا اتنا لمبا جواب دیتی ہیں کہ سوال پوچھنے والا بری طرح اکتا کر رہ جاتا ہے۔ روحانی مشورے بہت مفید سلسلہ ہے‘ انجم ڈیئر آپ کو اس سے بہت ثواب ملے گا اور لوگوں کا بھلا ہوگا۔“ (انشاءاللہ)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ”دین کی باتیں اور حضورؐ کے ناموں کی وضاحت اور معانی ایمان افروز ہیں۔ عکس اپنا رنگ جما رہا ہے مگر غالباً یہ عجیب و غریب کردار اور واقعات عمیرہ کی کہانیوں میں پہلی دفعہ شامل ہیں، دیکھیں آگے کس رخ چلتا ہے معاملہ۔ جوابی کارروائی فریدہ اشفاق کے معیار کی نہیں لگی۔ قربتوں کی دوری اچھا جا رہا ہے مگر عفان کو جو رضوانہ بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتی لگ رہی ہیں وہ مناسب نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اینہ اس کہانی میں کیسے فٹ ہوں گی یہ بھی میں سمجھ نہیں پا رہی۔ ہم سفر کو ذہن قبول نہیں کر رہا، ہماری کہانیوں کے ہیرو تو پھر بہت وسیع القلب ہوتے ہیں مگر اشعر کی والدہ نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا ذرا عجیب لگا۔ شیشوں کا مسیحا یوں تو سبق آموز اور دلچسپ ہے لیکن کردار بہت ہو گئے اب پھر کچھ نئے کردار متعارف ہوئے ہیں۔ باقاعدہ یاد کرنا پڑتا ہے۔ عید کا جوڑا، صلہ، ایک ننھی نیناں تو آپ کی حوصلہ افزائی اسکیم میں آتی ہیں سو کیا تبصرہ کیا جائے‘ ہاں سکینہ فرخ نے ایک گوارا تحریر دی ہے۔ نزہت جبیں نے مایوس کیا۔ عالیہ جی کے خوب صورت ناول کے اختتام کے انتظار میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں...... خیر میرے لیے تو یہ فائدے مند ہی ہے۔ عید دل، ہلکی پھلکی تحریر ہے۔ عید آئی ہے، اتفاقات سے بھری ہوئی حقیقت سے دور تحریر ہے۔ انجم اپنی شادی کی سالگرہ کی دلی مبارک باد لیٹ ہے مگر قبول کرو...... رضوانہ پرنس کو نزہت بہت مبارک ہو ویسے اتنا اچھا انٹرویو کرنے پر وہ اس سے زیادہ کی حقدار تھیں..... کیوں عذرا ڈیئر...... ویسے سچ کہو عذرا میں تمہاری یادوں میں بھی ہوں یا نہیں..... انجم نے بہت اچھی کوریج دی ہے۔ رضوانہ، نزہت اور شگفتہ کی منظر کشائی بھی اچھی تھی۔ انٹرویو کی سرخی بہ صورت نظم بھی اچھی لگی۔ خلوص، محبت، پیار اور دعاؤں سے بھری بہنوں کی محفل حسب معمول بہت دلچسپی سے پڑھی۔ نئی کتابوں سے آگاہی اچھا سلسلہ ہے۔ عظمیٰ کی نئی تحریر کا انتظار ہے۔ فرحت نسیم کی طرح پروفیسر عابدہ خان کی کمی مجھے بھی بہت محسوس ہو رہی تھی امید ہے اب وہ آتی رہیں گی۔ پاکیزہ ڈائری اور دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں۔ جلترنگ کے تمام خاکے ایک سے بڑھ کر ایک، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ..... اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو خاص کر پاکستانی مسلمانوں کو اپنے کرم سے نوازے اور صحیح معنوں میں ایک سچا مسلمان بنائے۔“ (آمین ثم آمین)

عظمیٰ آفاق سعید، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے تمام بہنوں کا بے حد شکریہ جنہوں نے پاکیزہ میں،



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امی کو اور بذریعہ خطوط مجھے عمرے کی مبارک باد دی۔ یقین کیجیے ہر، ہر جگہ پر آپ سب بہنیں مجھے یاد رہیں اور میں نے آپ سب کے لیے دعائیں کیں، اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے، آمین۔ اس وقت پاکیزہ میں سارے ناول ہی خوب دھوم دھام سے شائع ہو رہے ہیں۔ عمیرہ احمد ہم سب کی ہارٹ فیورٹ ہیں مگر ان کے ناول پر میں بعد میں تبصرہ کروں گی...... اس وقت مجھے جو ناول سب سے زیادہ پسند آ رہا ہے وہ شیریں حیدر کا ہے۔ اکثر بہنیں کہتی ہیں کہ وہ امربیل جیسا نہیں ہے تو واقعی اسے امربیل جیسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ شیریں آنٹی کا یہ ناول ایک حقیقی زندگی کی کہانی ہے جو ہمیں اپنے آس پاس چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ بہنوں کی محفل میں راحت وفا کے ناول پر تنقید کافی دکھائی دے رہی ہے۔ ایک طرف تو آپ سب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ نئی مصنفات کو جگہ دی جائے اور جب انہیں جگہ دی جاتی ہے تو توقعات کے پرچم بھی فوراً بلند ہو جاتے ہیں، راحت وفا کی قسطیں پہلے سے بہتر بھی ہو رہی ہیں اور کہانی بھی اپنا منہ کھول چکی ہے۔ میرا قطعی اپنا مشورہ ہے کہ نئی مصنفات کو اپنا ناول دس اقساط سے زیادہ نہیں لکھنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ بے شک دوبارہ لکھیں مگر اپنی کہانی کے ہر زاویے اور جزئیات پر گہری نظر رکھیں۔ عالیہ بخاری کے ناول پر کیا کہہ سکتے ہیں سوائے اس کے تسی گریٹ ہو۔ سیما مناف، صائمہ اکرم، ساجدہ حبیب، اقبال بانو، نگہت سیما، شوکت رانا الطاف اور فریدہ اشفاق کو...... پاکیزہ میں اپنی حاضری...... باقاعدگی سے دینی چاہیے کہ یہ سب ہماری بے حد خوب صورت رائٹرز ہیں۔'' (اس میں کیا شک ہے)

یاسمین رشید، کراچی سے۔ ''انجم...... ہائی ٹی میں کس قدر مزہ آیا تھا...... ایک چھوٹی سی تقریب کی یادیں ہمیشہ یاد رہیں گی اس کی کوریج بھی اچھی لگی...... عمیرہ احمد میری پسندیدہ ناول نگار ہیں اور عکس نہ صرف مجھے بلکہ میرے حلقہ احباب میں بھی میری تمام کزنز اور فرینڈز کو بے حد پسند آ رہا ہے۔ پلیز ہماری مبارک باد ان تک پہنچا دیں۔ عید کے حوالے سے دیگر تحریریں بھی پسند آئیں مگر ان میں بہنوں کی محفل...... سب سے اچھی لگی۔'' (اگر یہ محفل اچھی لگتی ہے تو تم اس محفل کے لیے ہر ماہ رائے کیوں نہیں دیا کرتی ہو)

خالدہ نسیم، یو کے سے۔ ''بچپن میں کبھی کبھی صبح کے وقت مجھے اور چھوٹے بھائی کو دودھ لینے دکان پر جانا پڑتا تھا، میرے ایک ہاتھ میں پیتل کا قلعی شدہ ڈول ہوتا تھا اور چند سکے اور دوسرے ہاتھ میں بھائی کا ہاتھ...... کیونکہ اکیلی لڑکی کا دکان پر جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔ اس وقت دکان پر کافی لوگ موجود ہوتے تھے۔ جو گرم دودھ پی کر کاموں پر جانے والے ہوتے تھے۔ دکان دار اپنے سامنے رکھے بڑے بڑے پیالوں میں دودھ ڈالتا تھا اور بڑے اسٹائل سے وہ ہاتھ کو پیالے کے ساتھ سے شروع کر کے ایک خاص بلندی تک لے جاتا تھا اس سے دودھ قدرے پھینٹا سا جاتا تھا اور اس پر موٹی جھاگ کی تہہ آ جاتی تھی جو بعد میں ملائی کی صورت لے لیتی تھی۔ دودھ کی سطح پیالے کے کناروں سے اونچی نظر آتی تھی گویا لبالب بھر کر چھلکنے کو تیار ہو۔ میری نظروں کے سامنے پاکیزہ رسالہ اسی دودھ کے پیالے کے مانند آتا ہے۔ اتنا کچھ کہ لبالب بھرا ہوا چھلکنے کو تیار۔ جھاگ کو ملائی بنتے دیکھ کر میں شروع کے صفحات، حدیث اور اداریہ پڑھتی ہوں۔ قرآن مجید کی آیات کے نمبر نوٹ کرتی ہوں میں صرف ترجمہ پڑھنا کافی نہیں سمجھتی، عربی پڑھ کر ترجمہ دیکھتی ہوں۔ للچائے دل کا کیا کروں گرم دودھ کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتی ہوئی بہنوں کی محفل میں گھس جاتی ہوں۔ کچھ صبر آنے پر اپنے آپ پر ہنس کر جلترنگ پڑھ کر مزید ہنستی ہوں پھر انگلی سے ملائی اٹھا کر منہ میں ڈالتی ہوئی عظمیٰ کی پاکیزہ ڈائری تک پہنچتی ہوں، دودھ کی صاف سطح آمنہ حماد کی منتخب شاعری کی سی لگتی ہے۔ شیریں دودھ کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پاکیزہ کی مصنفات کی تحریریں ہیں۔ آخری گھونٹ سندیسے اور شاعری میرا مطلب ہے منتخب اشعار اور کارنرز ہوتے ہیں ذرا زیادہ میٹھے اور پھر پیندے تہہ میں چند چینی کے دانے جو گھلنے سے رہ جاتے ہیں زبان پر رکھتے ہوئے ڈاکٹرز ولما رشوابے کی موٹاپا دور کرنے والی دوائیاں دیکھتی ہوں۔ آخر میں روحانی مشورے کی دعائیں پڑھ کر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہونے کی دعائیں مانگ کر آمین کہتی ہوں اور جب نئے سرے سے رسالہ کھولتی ہوں تو یہی احساس دوبارہ سے ہوتا ہے اور کتنا دودھ ہر ماہ پی جاتی ہوں کچھ پتا نہیں لگتا۔ تمام مصنفات کا شکریہ اچھی تحریریں دینے کا۔ عظمیٰ کو پیار اور دعائیں، عذرا رسول کو دعائیں، خدا تعالیٰ معراج رسول صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔'' (آپ کے ساتھ ہم نے بھی دودھ کا پیالہ پی لیا...... ملائی ہمیں بھی پسند ہے یا شاید تمام موٹے لوگوں کو اچھی لگتی ہے۔ بہرحال شکریہ)

شائستہ اعجاز، کراچی سے۔ ''اپنی پیاری دوست عذرا کی جانب سے دی گئی ہائی ٹی کی رپورٹ آپ نے بہت اچھی شائع کی ہے اور خود بھی اس کی روداد اچھی لکھی ہے...... واقعی وہ شام بے حد خوب صورت تھی اور ہماری یادوں میں ہمیشہ کسی مہکتے پھولوں کی طرح رہے گی۔ پاکیزہ کا ٹاپ کا ناول عمیرہ احمد کا ہے...... جس کا ایک ایک فقرہ...... پڑھنے والے کو مسحور سا کر رہا ہے۔ شیریں حیدر کا امربیل اچھا ناول تھا مگر یہ ناول اس جیسا نہیں رہا۔ جس کی وجہ کرداروں کی زیادتی ہے۔ راحت وفا سے معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ جتنی جلد ہو سکے آپ اس کو سمیٹ لیجیے...... کہ ہمیں بالکل بھی اچھا نہیں لگا...... عالیہ بخاری نے اچھا لکھا...... دیگر افسانے بھی پسند آئے۔'' (تبصرے کا شکریہ، شائستہ بہن آپ کی آرائیں پہنچائی جا رہی ہیں مگر ہر ایک کی پسند ناپسند مختلف ہوا کرتی ہے)

راحت، ٹانا والا سے۔ ''پاکیزہ میں دل کی بند شریانوں کا ایک نسخہ پڑھا تھا جو گلاب کی پتیوں کو نہار منہ کھانے کے حوالے سے تھا اگر کسی بہن کے پاس ہو تو وہ پاکیزہ میں انجم باجی کو بھیج دے تاکہ وہ مجھے جلد مل جائے۔'' (توجہ دیں)

صابرہ سلطانہ، کراچی سے۔ ''آپ نے پاکیزہ میں میرا خط شائع کیا، شاید اسی وجہ سے مجھے اس ماہ کا پاکیزہ جلدی مل گیا ورنہ بڑی مشکلوں سے ملتا تھا۔ یہ عید میرے لیے بہت سوگواری تھی کہ میری بہن رفیعہ سلطانہ کے انتقال کے بعد یہ پہلی عید تھی۔ پاکیزہ پڑھ کر اپنے دل کو بہلایا اور مجھے رضوانہ پرنس کی تصویر بے حد پسند آئی۔ کتنی پیاری اور معصوم سی ہیں جیسا لکھتی ہیں ویسی ہی اسمارٹ سی ہیں۔ مجھے ان کی تصویر سب سے زیادہ خوب صورت لگی۔ آپ باجی رضوانہ پرنس کو میرا محبت بھرا اسلام پہنچا دیں۔'' (رضوانہ بھی آپ کو بے حد دعائیں دے رہی ہیں)

نیر شفقت، کراچی سے۔ ''میں اپنی عید پنجاب میں منا کر کراچی آ گئی ہوں، عید کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ مجھے سارے ناول اور سب افسانے پسند آئے مگر جلترنگ کی تو بات ہی کیا ہے۔ یہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔'' (نوازش)

رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ''اگست کے پاکیزہ میں بہنوں کی محفل میں مجھے ویلکم کہنے کا شکریہ پھر ستمبر کے شمارے میں میری حقیر سی تحریر کو اہمیت دینے کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ رضوانہ پرنس ان خواتین





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے رول ماڈل ہیں جو حالات سے سمجھوتا نہیں کر پاتیں۔ عذرا رسول ایک باہمت صابر وشاکر خاتون ہیں، اس کا اجر انہیں ایک شریف النفس اور ذہین بیٹے کی صورت میں نوازا گیا ہے۔ شیرنی وا اِک شیر ہی کافی ہے۔ فصیحہ آصف خان کے چند الفاظ مضطرب کر گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس میوے سے نوازے جس کے ذائقے کا آپ کو علم نہیں۔ انجم انصار کو ایک آزمودہ ڈاکٹر کا نمبر بھیج رہی ہوں۔ ان سے رابطہ کریں۔ شرطیہ شفا آپ کی رگ رگ میں اترے گی ان شاء اللہ۔ عمیرہ احمد کا ناول شروع کرنے کا شکریہ انجم، میں نے سالہا سال کے بعد جب دوبارہ لکھنا شروع کیا تو اس میں عمیرہ احمد کے ناول اور ڈراموں کا بہت ہاتھ ہے، ان کے لیے بے شمار دعائیں۔ شیریں حیدر کا ناول شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، امرِ بیل کے مقام تک پہنچے گا۔ عظمیٰ آفاق، ویل ڈن کم عمری میں عمرے کی سعادت کی بہت بہت مبارک باد مجھے ہولے ہولے تمام رائٹرز کی پہچان ہو رہی ہے۔ ان سے گپ شپ، تعریف وتنقید چلے گی۔ انجم اگر آپ مجھے ایک مشورہ دینے کا حق دیتی ہیں تو غور کر لیجیے گا ورنہ انگور بھی قبول ہے۔ عظمیٰ نے دلہن نامے کو خوب صورت جواں دلہنوں سے سجایا بہت مزہ آیا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ عظمیٰ بیٹا ذرا ماضی میں جھانکیں۔ شاید عمر رسیدہ خواتین چند لمحوں کو جوانی پالیں اور پھر گولڈن جوبلی منانے والی خوش نصیب دلہنوں کی رگوں میں بھری دوپہر کی رمق دوڑ جائے۔ اس بارے میں سوچیے گا کیونکہ پاکیزہ کو ہر عمر میں خاصی اہمیت دی جاتی ہے پھر ٹمٹماتے ہوئے دلوں کو ضوفشانی کیوں نہ بخشیں؟ پی سی میں آپ سب کا مل بیٹھنا بہت بھلا لگا۔ میں صنفِ نازک کی اسی یک جہتی پر اس ذات کی کامیابی پر بھروسا رکھتی ہوں۔ ہماری خوشیوں اور دوستیوں کی ان محفلوں کا جواب نہیں۔ انہیں جاری وساری رکھیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

ثریا انجم، کراچی سے۔ "پاکیزہ پڑھنے کا آغاز جلترنگ سے ہوا۔ جلترنگ کی کھٹ مٹھی تحریروں نے دل موہ لیا اور پھر باقی کا پاکیزہ بھی رفتہ رفتہ اپنا رنگ جمانے لگا اور پھر پوری طرح چھا گیا جس کے لیے آپ اور آپ کی ٹیم مبارک باد کی حقدار ہے۔ اگست کا پاکیزہ عمیرہ احمد کی شمولیت کی وجہ سے کچھ اور نکھر گیا کیونکہ عمیرہ احمد بلاشبہ سب کی پسندیدہ رائٹر ہیں اب ان کی یہ نئی پہیلی ہم کس طرح بوجھتے ہیں یہ وقت ہی بتائے گا۔ عائشہ خان کی کہانی نے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہم جو رمضان اور عید کی تیاری میں بے تحاشا خرچ کرتے ہیں زکوٰۃ دینے سے کیوں کنی کتراتے ہیں۔ میمونہ خورشید کا ناولٹ اپنے منطقی انجام کو پہنچا یعنی برائی کا بدلہ برائی، اس کے علاوہ رزق بہت خوب صورت کہانی تھی، اس کے علاوہ کوئی افسانہ متاثر نہ کر سکا۔ سلسلے وار ناولوں میں ایک تھی نیناں بس پڑھ لیا، البتہ شیریں حیدر کا ناول بہت زبردست چل رہا ہے ہر بار اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ پاکیزہ کے مستقل عنوانات یوں تو سارے ہی اچھے ہیں مگر جلترنگ کا جواب نہیں اس کے علاوہ بہنوں کی محفل میں ہر بار جو آپ آیت کریمہ پڑھنے کی تاکید کرتی ہیں اس اصرار کے ساتھ کہ ابھی پڑھ لیں اس کا اجر آپ کو کتنا ملے گا اس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔" (بے شک اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے گمان سے بڑھ کر عطا فرماتا ہے)

شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ "ستمبر کا پاکیزہ کا عید مبارک نمبر بہترین رہا اور اداریہ تو بہت ہی پیارا اور دلنشین تھا۔ دین کی باتیں بھی بہترین اور آنحضرت محمد ﷺ کے اسمائے گرامی کا بیان بہت ہی خوب رہا۔ قیصرہ حیات نے خوب معلومات عطا کیں...... عکس کی دوسری قسط بھی بے حد پسند آئی۔ جوابی کارروائی دلکش افسانہ تھا۔ رضوانہ پرنس کا ناولٹ قربتوں کی دوری بھی خوب جا رہا ہے۔ غزالہ فرخ کا عید کا جوڑا آخر میں آنکھیں نم



کر گیا۔ غزالہ فرخ کو بیٹے کی شادی بہت مبارک ہو اور عمرے کی بھی دلی مبارک باد قبول کریں۔ قرۃ العین رائے کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ کیسی خوشی لے کر آیا چاند ..... پڑھ کر اس حسین شام کی دلکش پرچھائیاں آنکھوں کے آگے پھرنے لگیں ...... میری زندگی کی خوب صورت شاموں میں سے ایک تھی وہ شام...... بڑا لطف اور بہت مزہ آیا تھا اس دن ...... پاکیزہ ڈائری میں نورین طلعت عروبہ کی حمد باری تعالیٰ بہت ہی اچھی لگی سبحان اللہ۔ اس بار آپ نے ہم سب کو بہت ہی زبردست عیدی دی ہے بھئی جلترنگ کے بے مثال خاکے لاجواب رہے۔ میں سمجھ گئی، گھن چکر اور فنکار بہت ہی زیادہ پسند آئے۔" (شکریہ)

تانی چوہدری، آکسفورڈ یو کے سے۔ "سب سے پہلے تو آپ کو تمام اسٹاف کو اور تمام پڑھنے والوں کو عید مبارک ہو بہت بہت اور ان خوشیوں کے لمحات میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ اب آتے ہیں باقی باتوں کی طرف، آپی آپ سے نوشی نے بات کی تھی پاکیزہ بھیجنے کی تو مجھے ابھی تک پاکیزہ موصول نہیں ہوا۔ پے منٹ وغیرہ تو ہو گئی ہے لیکن ابھی تک پاکیزہ نہیں ملا۔ ابھی اور کتنا ٹائم لگے گا۔ پلیز کچھ بتائیں گی اور آپی میں بہت مشکل سے ٹائم نکال کر کچھ نہ کچھ لکھتی ہوں...... اس وقت بہت دکھ ہوتا ہے جب آپ کسی کالم میں جگہ نہیں دیتیں اور بن میں پھینک دیتے ہیں۔ پلیز ایسا مت کیا کریں۔ آخر میں پاکیزہ کی کامیابی اور ترقی کے لیے دعا گو ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ ہمارے پاکستانی عوام کو ان ظالموں سے نجات دے تاکہ ہمارے لوگ سکھ اور چین کی نیند سو سکیں۔ ہر خوف سے آزاد ہو کر زندگی گزاریں۔" (آمین)

ثروت شیخ، حافظ آباد سے۔ "میری طبیعت خراب ہے خاص طور پر گلا زیادہ خراب ہے بہنیں کر رہی مگر پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ اس کے تمام سلسلے اچھے لگتے ہیں۔ بہنوں کی محفل کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ پی سی کی روداد سادہ سے انداز میں اچھی لگی۔" (پیاری ثروت میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں جلد صحت کلی عطا فرمائے اور تم بھرپور انداز میں تبصرہ کرو)

رفیعہ ابدالی، کراچی سے۔ "بہت عرصے بعد اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں مگر لگتا ہے کہ آپ ہمیں بھول ہی گئیں ...... سالگرہ نمبر میں بھی ہمیں یاد نہیں کیا، ہمارا دل چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح ہر ماہ پاکیزہ میں ہمارا تبصرہ شائع ہو۔ عظمیٰ آفاق کو عمرے کی مبارک باد دیجیے گا۔ ہماری جانب سے مبارک باد دیجیے گا۔" (جی ضرور)

انیلا ناہید، لیہ سے۔ "ستمبر کا پاکیزہ پسند آیا...... ہائی ٹی کی رپورٹ آپ کے قلم سے بہت اچھی لگی۔ شکایت یہ کہ آپ نے اپنی واضح تصاویر کیوں نہیں دیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ بہت ساری تصویریں شائع ہوں جنہیں ہم بار بار دیکھیں...... سب کی تصویریں اچھی تھیں مگر جن کی تصاویر ہمیں بے حد اچھی لگیں ان کا نام رضوانہ پرنس اور ہما بیگ ہے۔ عظمیٰ کی تصویر بہت عرصے سے نہیں دیکھی وہ بھی پاکیزہ میں لگائیں اور راجیہ کتنی بڑی ہو گئی ہیں؟" (راجیہ ماشاء اللہ پانچ فٹ چھ انچ کی ہیں ...... قد میں عظمیٰ سے بڑی اور دیکھنے میں عظمیٰ کی بہن لگتی ہیں ...... دیگر باتوں کے لیے آپ مجھے فون کر لیجیے ...... پاکیزہ آپ کو اچھا لگتا ہے اس کے لیے ممنون ہوں)

سعدیہ سلیم، آسٹریلیا سے۔ "ستمبر کا پاکیزہ اے ون رہا ...... بہنوں کی محفل سے اسٹارٹ لیا اور سب کی خیریت معلوم ہوئی...... پاکیزہ ڈائری بھی چم چم چمک رہی ہے۔ میرا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ اس وقت میرے خیال کے مطابق عمیرہ احمد کا ناول ٹاپ پر ہے اور دوسرے نمبر پر عالیہ بخاری ہیں۔ بقیہ ناول بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک ہیں۔ جلترنگ پڑھ کرانجوائے کیا۔ کیسی خوشی لے کرآیا چاند...... ایک محبت بھری تحریر تھی۔‘‘ (نوازش)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔’’ عید کے شمارے میں مصنفات کی تصاویر کم لگیں مگر ہم نے بار بار تصویریں دیکھیں...... یہ رضوانہ پرنس تو بہت ہی خوب صورت ہیں۔ ہما بیگ بھی بہت اسمارٹ لگیں۔ سب نے ہی اپنے اپنے انداز میں لکھا اور خوب لکھا مگر ہم آپ کے انداز تحریر کے عادی ہیں...... آپ کی تحریر بے حد مشک سی ہوا کرتی ہے۔ عمیرہ کے ناول کی اٹھان بے حد خوب صورت ہے مگر ایک چھوٹی سی بات عمیرہ سے کہنی ہے کہ پاکیزہ ہمارے گاؤں میں رہنے والی بہنیں بھی پڑھا کرتی ہیں اگر وہ اس میں انگریزی کے الفاظ کا کم استعمال کریں تو نوازش ہوگی۔ اس ماہ شیریں حیدر کی قسط بھی بہت اچھی لگی اور عالیہ بخاری کا تو کیا ہی کہنا ہے...... بہت عمدہ ناول نگار ہیں۔ جلترنگ...... تو ہمارے ڈپریشن کو ختم کرتا ہے اس کو... پڑھتے ہوئے میں اکیلی بیٹھی ہنس رہی تھی تو میرا بیٹا شاہد مجھ سے کہنے لگا۔ کیا پڑھ کر مسکرا رہی ہیں تو میں نے اس کو جلترنگ پڑھنے کو دے دیا۔‘‘ (نوازش، ہاں آپ کی تعریف سن کر یہ رضوانہ پرنس اور ہما بیگ تو اب خوشی سے پھول کر کپا ہو جائیں گے)

مسز نزہت اشفاق، نارتھ کراچی سے۔’’ ستمبر کا پاکیزہ پڑھ کر لطف آیا۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ اللہ نظر بد سے بچائے...... اب پاکیزہ کے ٹائٹل پہلے کے مقابلے میں بہت اچھے آرہے ہیں۔ اداریہ بہت اچھا تھا۔ ناولوں کی اقساط، بہترینؔ افسانوں کا انتخاب اعلیٰ، کارنرز بہت اچھے لگے۔ جلترنگ پڑھ کر مزہ آیا۔ کیسی خوشی لے کرآیا چاند...... عید کے حوالے سے بھی اچھی تحریر تھی۔ میرا انتخاب پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ کون کیا کر رہا ہے جیسے شوبز کے چار صفحات ضائع کرنے کے بجائے...... ہر ماہ تین نئی رائٹرز کے انٹرویو یا ہر ایک کا کوئی سچا واقعہ جو صرف ایک ایک صفحے کا ہو۔ جو لوگوں کے لیے سبق بھی ہو...... تو اچھا رہے گا۔ بہنوں کی محفل ہر ماہ ٹاپ پر ہوتی ہے۔‘‘ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

پروین قاسم، کراچی سے۔’’ مجھے نہیں خیال کہ انجم تم نے مجھے یاد رکھا ہوگا۔ ہم تو پاکیزہ کے پرانے تبصرہ نگار ہیں۔ ستمبر کا پاکیزہ بہت پسند آیا۔ ٹائٹل بھی خوب صورت تھا۔ کیسی خوشی لے کرآیا چاند...... میں تم نے بے حد آسان مگر خوب صورت انداز میں نقشہ کھینچا کہ یوں لگا جیسے ہم نے بھی شرکت کرلی ہو۔ تصاویر سب ہی کی بہت اچھی تھیں مگر رضوانہ پرنس اور ہما بیگ بہت پیاری لگیں۔ اس ماہ کے افسانے، جلترنگ، انتخاب سب اے ون رہے۔‘‘ (پیاری پروین، تم کو کیسے بھول سکتی ہوں اور مجھے تو تمہاری بیٹی بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اب اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس سے کہنا کہ وہ بھی مجھے پاکیزہ کے بارے میں اپنی رائے دے)

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔’’ اس ماہ کا شمارہ ٹھاہ کرکے پسند آیا۔ عمیرہ، عالیہ اور شیریں کے ناولوں کی اقساط خوب بھرپور رہیں۔ بہنوں کی محفل کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ پاکیزہ میری فیملی میں بے حد مقبول بھی ہے اور محبوب بھی کہ اس میں ہماری خوشی، غمی کی خبریں بھی لگتی ہیں۔ انجم آپ کے ناول کی کمی محسوس ہورہی ہے، آپ کب لکھیں گی۔‘‘ (پیاری صفیہ اس وقت پاکیزہ کے تمام ناول اے ون چل رہے ہیں جنہیں ہمارے قارئین بے حد پسند کررہے ہیں فی الحال آپ ان سے لطف اندوز ہوں۔ میں بھی ناول لکھنے کا جب سوچوں گی تو ان شاء اللہ اسے پاکیزہ کے لیے ہی لکھوں گی)

میمونہ گل، سکھر سے۔’’ پہلے میرا عزت بھرا اسلام عذرا باجی تک پہنچا دیں۔ میں معراج بھائی کی کلی



صحت کے لیے بے حد دعا کرتی ہوں۔ ستمبر کا پاکیزہ ہمیں بروقت ملا...... اور ہمیں بے حد ہی پسند آیا۔ تمام مصنفات کو ہماری مبارک باد پہنچا دیجیے۔‘‘ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔’’ انجم باجی، کراچی کے حالات اللہ جلد ٹھیک کرے تو میں کراچی آؤں۔ یہاں فیصل آباد میں ہم میاں بیوی تقاریب میں شرکت کرتے رہتے ہیں اور ایک جیسے ملبوسات زیب تن کرنے کی وجہ سے نگاہوں کا مرکز ٹھہرا کرتے ہیں۔ ستمبر کا پاکیزہ اے ون رہا۔ سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک رہیں۔ کیسی خوشی لے کرآیا چاند...... آپ نے بہت اچھا لکھا۔‘‘ (نوازش)

مہ وش سمرن راجپوت، سیالکوٹ سے۔’’ سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا، آپ ہر مرتبہ ہی بہترین لکھتی ہیں لیکن ہر مرتبہ رسالہ کھولتے ہی لسٹ میں آپ کا نام نہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ محبت ہم سفر میری، وہ بھی عید کے بعد ملتا ہے۔ آپ پلیز اچھا سا خوب صورت ناول شروع کریں۔ عظمیٰ آفاق صاحبہ عرصے سے آگئی ہوں گی۔ ہماری جانب سے بے حد مبارک باد۔ پاکیزہ بڑے عرصے سے پڑھتے آرہے ہیں لیکن آپ کو سوائے ایس ایم کے لیٹر بھی نہیں لکھا لیکن آپ جس طرح سے بہنوں کی محفل میں ہر کسی کو پذیرائی اور محبت دیتی ہیں بہت اچھا لگتا ہے کہ کوئی ہے جو آپ کا اپنا ہے، آپ کو یاد رکھتا ہے، آپ کی محبتوں کا قرض ہم شاید ہی اتار پائیں۔ اللہ آپ کو صحت اور تندرستی دے۔ قربتوں کی دوری بہترین رہا، عکس شاندار لگا اور خوشبو کا سفر بے حد خوب صورت، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں اچھا رہا۔ بہنوں کی محفل اور جلترنگ اسی طرح جاری وساری رہنی چاہیے۔‘‘ (خوش آمدید، تبصرے کا شکریہ)

ساجدہ تنویر، ملتان سے۔’’ سب سے پہلے ایک شکایت ہے کہ میں گزشتہ تین ماہ سے خط بھیج رہی ہوں لیکن آپ شائع نہیں کرتیں اس بار پھر اس امید کے ساتھ کہ شاید آپ میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے شائع کردیں۔ عمیرہ کے ناول کی قسط پڑھ کر بہت مزہ آیا ویسے تو عمیرہ کا نام ہی کافی ہے لیکن اس میں تو انہوں نے بالکل ہی نئے موضوع کو منتخب کیا ہے۔ شیریں کا ناول بھی ٹھیک ہے جبکہ رابعہ نیازی کا افسانہ بھی کمال تھا۔ رابعہ نیازی کا رزق پڑھ کر اپنی ایسی غلطیوں پر شرمندگی بھی ہوئی جو ہم روزمرہ کی زندگی میں انجانے میں کر جاتے ہیں۔ بہت خوب صورت موضوع کا انتخاب کیا، جلترنگ نے بھی خوب ہنسایا اور میں سمجھتی ہوں اس دور میں تھوڑی دیر خوش رہنا ہی بہت بڑی نعمت ہے اور ہنسانا بھی ایک صدقہ ہے۔‘‘ (ساجدہ اس محفل میں خوش آمدید اس سے قبل آپ کا کوئی خط ہمیں نہیں ملا، آپ یقین رکھیے کہ آپ کا یا کسی بھی بہن کا خط ہمیں کتنی ہی تاخیر سے کیوں نہ ملے وہ اس محفل میں ضرور شامل ہوگا کہ یہ محفل آپ ہی لوگوں کی محفل ہے اور آپ سب بہنوں کے دم سے ہی جگمگایا کرتی ہے)

فریدہ فرح لاکھانی، آسٹریلیا سے۔’’ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی اور تمام اہلِ خانہ بھی اور پاکیزہ محفل بھی۔ میری مصروفیت کیا بتاؤں، اپنے شوہر کی بیماری سر کھجانے نہیں دیتی البتہ آپ ہر وقت میرے دل کے قریب ہیں۔‘‘ (پیاری فریدہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو کلی صحت عطا فرمائے، آمین آپ بھی مجھے بے حد یاد آتی ہیں)

رابعہ فیاض قادری، کراچی سے۔’’ ٹائٹل خوب صورت تھا ماننا پڑے گا اندر دلہنوں کی بھرمار تھی سب ایک سے بڑھ کر ایک دیکھ کر اچھا لگا۔ سب بہت خوب صورت لگ رہی تھیں، ایک نے اپنی شادی کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احوال میں لکھا کہ انہوں نے دو مہینے ہنی مون منایا تو بے ساختہ مجھ کو اپنا ہنی مون یاد آ گیا۔ ہم بھی تقریباً دو ماہ خوب گھومے پھرے تھے اور مزے کی بات پاکستان کے چاروں صوبوں میں گئے تھے لاہور، شیخوپورہ، اسلام آباد، پنڈی، مری، مردان، پشاور، خیر پور، کوئٹہ شامل تھے اور آخر میں یہ حال تھا کہ گھر اور گھر والے بے حد یاد آ رہے تھے خاص کر اپنا کمرا..... دل چاہتا تھا کہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائیں مگر جناب مزہ بہت آیا دراصل خاندان سے باہر کی بہو ہوں جبکہ ان کی دونوں بھابیاں خاندان کی ہیں اس لیے سب ان کو جانتے تھے۔ میرے شوہر چاہتے تھے کہ میں بھی سب سے ملوں اور ان کے لیے اجنبی نہ رہوں۔ ان شہروں میں اکثر اُن کے رشتے دار اور کچھ میں میرے رشتے دار بھی مقیم تھے۔ خوب آؤ بھگت ہوئی، وہ ایک آئیڈیل دور تھا اور ہم نے خوب انجوائے کیا ویسے بھی گھومنے پھرنے کے معاملے ہم میاں بیوی ایک جیسے ہیں یعنی جہاں موقع ملا وہاں نکل پڑے آوارہ گردی کرنے..... پچھلے سال بھی ناران، کاغان، جھیل سیف الملوک کی سیر کی تھی اور تب بھی تقریباً چھ سات شہروں میں گھومے تھے جبکہ علی صرف سال بھر کے تھے سب حیران ہوتے تھے کہ تم لوگ اتنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ کیسے گھوم لیتے ہو مگر وہ بھی ہماری ہی اولاد ہے ماں باپ کی طرح گھومنے پھرنے کا شیدائی..... میں سمجھتی ہوں انسان کو تھوڑی بہت تفریح ضرور کرنی چاہیے۔ خدا کی صناعی کو قریب اور غور سے دیکھیں۔ ہمارے پاکستان میں ایسی ایسی خوب صورت جگہیں ہیں کہ دل بے ساختہ سجدوں اٹھتا ہے سو تھوڑا بہت گھومنا پھرنا چاہیے۔ مجھے جھیل سیف الملوک دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ہمارے میاں کوئی خواہش ادھوری رہنے دیں، ایسا کہاں ممکن ہے سو آخر لے کر چلے ہی گئے اور بہت لطف اٹھایا۔ راستے اتنے خوفناک تھے کہ ہم ڈر بھی گئے۔ دوسرے خوب بارشیں..... یہ بولے آئندہ سوچ سمجھ کر جانے کی فرمائش کرنا اور ہم نے بھی سوچا واقعی موقع محل دیکھ کر نکلیں گے۔'' (پیاری رابعہ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے اور آپ شاد و آباد رہیں)

مہر عبدالجبار، کراچی سے۔ ''اس ماہ کا پورا پاکیزہ پسند آیا۔ مجھے اس کے تمام سلسلے وار ناول پسند ہیں۔ ذکیہ بلگرامی، عالیہ بخاری، قیصرہ حیات، اقبال بانو، عمیرہ احمد اور آپ کی تحریروں کی میں بہت بڑی فین ہوں۔'' (نوازش)

صبا ٹور، لیہ سے۔ ''پاکیزہ میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے۔ بہنوں کی محفل کے تمام خطوط میں بار بار پڑھتی ہوں اور بہنوں کی محبت اور چاہت سے بہت متاثر ہوتی ہوں۔ اس نفسا نفسی کے دور میں بہنوں کی آپس کی محبت دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ ستمبر کا پاکیزہ اے ون رہا۔ جلترنگ کا تو کیا ہی کہنا ہے۔ رضوانہ پرنس، ہما بیگ اور عذرا باجی کی تصویریں بہت اچھی لگیں۔'' (شکریہ)

✉ عمارہ مشتاق، راول پنڈی۔ ڈاکٹر خرم مشہور ڈاکٹر ہیں وہ پنڈی میں کلینک کرتے ہیں اور بہت ہی قابل ہیں۔ آپ ان سے اس فون نمبر پر رابطہ کر سکتی ہیں۔ 051-4842639

✉ انیلا، میمونہ گل، نسیم نیازی، لاہور۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اولاد کی نعمت عطا فرمائے۔ ہماری ایک بہن نے ایک ماہر گائنی ڈاکٹر روبینہ تو قیر کا فون نمبر بھیجا ہے، یہ راول پنڈی میں ہوتی ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کر سکتی ہیں۔ 051-596147

رابعہ انجم، چوکی سے۔ ''عمیرہ احمد کے ناول عکس کا پچھلے مہینے سے انتظار ہو رہا تھا سو انتظار کی



گھڑیاں ختم ہوئیں..... جلدی سے پہلی قسط پڑھ ڈالی۔ آغاز تو کہانی کا اچھا لگا آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو سیدھے بہنوں کی محفل میں پہنچ کر سانس لی چند سیکنڈ میں پوری محفل ٹٹول ڈالی لیکن ہائے رہا ہمارا نام موجود ہی نہیں تھا تو نظر کیسے آتا مایوس حال وہاں سے نکلے میں اکثر گنگناتی ہوں میں اپنا نام دیکھ کر تھوڑا حوصلہ ہوا کہ چلو کہیں تو جگہ ملی۔ جلترنگ نے ہمیشہ کی طرح خوب ہنسایا اللہ کے مہمانوں کی ذمے داریاں قیصرہ حیات نے بہت خوب لکھا، میں نے بھی اللہ کے فضل سے رمضان میں عمرہ کیا ہے اور بالکل ایسے ہی ہو رہا ہے۔ مسلمان خواتین کی بالکل صحیح عکاسی کی انہوں نے اب چلتے ہیں ناول کی طرف ایک گھی نیناں سپرہٹ جا رہا ہے باقی ناول بھی اچھے لگے۔'' (شکریہ)

نادی، راول پنڈی سے۔ ''آپی میں ایک گھریلو خاتون ہوں پچھلے سال ہی میری شادی ہوئی، میں نے کبھی میگزین نہیں پڑھے تھے، میری سہیلیاں مجھے بہت کہتی تھیں لیکن میرا خیال تھا کہ یہ فضول کام ہے۔ افسانے اور ناول پڑھ کر لڑکیوں کے دماغ خراب ہوتے ہیں اور وہ تخیلاتی دنیا میں کھوئی رہتی ہیں۔ اس بار میری سہیلی نے پاکیزہ لے کر بھیجا کہ پڑھ کر تو دیکھو۔ اس نے مجھے خاص طور پر کہا کہ عمیرہ احمد کا ناول اور رابعہ نیازی کا افسانہ پڑھو۔ میں نے عمیرہ کے ناول کی قسط پڑھی اور بہت اچھی لگی اور دل کیا۔۔۔ کہ ابھی ناول مل جائے اور میں پڑھ لوں لیکن مجھے اگلی قسط کا انتظار کرنا پڑے گا پھر رابعہ نیازی کا رزق پڑھا اور میں اتنی متاثر ہوئی کہ یقین کریں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ ہم کیسے رزق کی بے قدری کرتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ رزق پڑھنے کے بعد آپ کو اپنے جذبات لکھنے سے نہ روک سکی۔ آپی میرا خیال تھا کہ افسانوں میں رومانوی کہانیاں ہوتی ہیں لیکن عمیرہ اور رابعہ نے کمال کر دیا اور بڑے اچھے موضوعات کا انتخاب کیا خاص کر رابعہ کے رزق نے مجھے متاثر کیا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

ڈاکٹر زاہدہ پروین، لاہور سے۔ ''مجھے پاکیزہ پڑھتے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے ہیں اور حقیقت میں اس کی کہانیاں پڑھ کر میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ خصوصاً بہنوں کی محفل کا اپنا پن، یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ آپ کے روحانی مشورے بھی بہت مفید ہیں۔ اب دوسری وجہ کی طرف آتے ہیں۔ ابھی میں نے پورا رسالہ نہیں پڑھا پہلے قسط وار ناول شروع کیے اور ایک گھی نیناں پڑھ کر اتنی کوفت ہوئی دو دن تک رسالہ ہی نہیں کھولا۔ ایک تو اس کی کہانی ابھی تک اپنی گرفت میں نہیں لے سکی دوسرے کچھوے کی رفتار، ہر ماہ قسط آتی ہے مگر کہانی وہیں کی وہیں..... کوفت کا باعث تو یہ بھی ہے کہ اس میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے۔ بھئی اردو زبان میں کہانی لکھی جا رہی ہے تو اردو کے الفاظ استعمال کریں۔'' (آپ کی رائے بھجوائی جا رہی ہے)

شبانہ شوکت، حیدرآباد سے۔ ''پاکیزہ کا معیار بلاشبہ بہت اچھا ہو گیا ہے۔ مزید بھی اچھا ہو سکتا ہے اگر عالیہ حرا سے یا تو لکھوایا ہی نہ جائے یا پھر اچھے موضوع کی امید رکھ کر لکھوایا جائے۔ ٹیپکل میاں بیوی کی الجھنیں جن کا کوئی خاص سر پیر بھی نہیں ہوتا۔ دوسری تمام مصنفات کی ہمہ جہت تحریریں ایک طرف اور مذکورہ مصنفہ کی ایک طرف۔ سیریاز اض نیا نام، اچھی کوشش کہی جا سکتی تھی اگر مختصر تحریر ہوتی۔ بے جا طوالت نے بے انتہا بور کیا۔ فاخرہ گل بہت زبردست اضافہ ہیں ہمیشہ نئے موضوعات کے ساتھ آتی ہیں۔ مختصر کہانی میں کس قدر قیمتی پیغام، صرف بات ہی نہیں ہم جیسی چھوٹے چھوٹے بچوں کی شرارتوں اور بار بار کھانے پینے کی عادت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے عاجز آئی ہوئی مائیں بچوں کو بازار کی چیزیں دے کر جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایکسپائر ڈیٹ دیکھنے کی زحمت کیے بغیر۔ اضافہ فیصل کی مختصر مگر پیغام دیتی تحریر۔ اچھا اضافہ ہیں۔ میمونہ خورشید علی نے بہت مختلف اور زبردست اسٹوری لکھی۔ پہلے کے مقابلے میں بہت میچورٹی اور تنوع آ گیا ہے ان کی تحریروں میں اور ہر موضوع کو گرفت میں لینے کا ہنر بھی۔ رضوانہ پرنس اتنا اچھا لکھ رہی ہیں کہ میں حیران ہوں کہ وہ اتنا کم کیوں لکھتی ہیں۔ ہماری مصنفات کے انداز ہی نرالے ہیں۔ جن کے پاس موضوعات کی شدید کمی ہے وہ تو دھڑا دھڑ لکھے جا رہی ہیں اور جو اتنا اچھا اور مختلف لکھتی ہیں وہ قلم ہی برسوں میں اٹھاتی ہیں۔ آپ کے پاس یا تو کوئی منتر ہے یا خوش اخلاقی کا خزانہ کہ تقریباً تمام مصنفات کو آپ نے کھینچ لیا ہے۔" (گڑیا یہ صرف اللہ کا کرم ہے)

عروج ذکی آفندی، کراچی سے۔ "اس دفعہ پاکیزہ نے کمال کر دیا ہر افسانہ نگار کی تحریر دوسرے سے جداگانہ تھی موضوع سارے اچھے تھے۔ خاص طور پر عمیرہ احمد کی انٹری سے تو دھماکے ہی ہو گئے۔ عمیرہ احمد کا طرز تحریر بالکل جداگانہ ہے اور ان کی پاکیزہ میں تحریر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پہلی کہانی فیری ٹیل کی طرح تھی لیکن بہت مزہ آیا۔ شیریں حیدر سرپٹ دوڑے جا رہی ہیں۔ کہانیوں کے کردار کافی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور نئے نئے کردار متعارف ہو رہے ہیں اور یہی ایک بہترین رائٹرز کی خوبی بھی ہے کہ وہ کہانی کے کرداروں سے بھرپور انصاف کرے۔ گو کہ کردار بہت زیادہ ہیں لیکن پڑھنے میں مزہ آ رہا ہے۔ بس ذرا سا سنبھل کر لکھیں ہر عمر کی بچیاں پڑھتی ہیں میمونہ خورشید کی میں چاندنی نے تو اداس کر دیا آخر تک کہانی پر مصنفہ کی بھرپور گرفت رہی۔ خوشبو کا سفر اینڈ بھی اب دکھا دینا چاہیے۔ رزق افسانہ بہت ہی اچھا لگا اور یہ ہمارے ہر گھر کی کہانی ہے۔ جس طرح دال دلیہ کا زیاں ہو رہا ہے واقعی ہر کسی کو سوچنا چاہیے۔ جلترنگ میں شاباش بہت اچھا لگا کیا بتائیں کیا واقعی ایسا شادیوں میں ہوتا بھی ہے۔ بہرحال ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔" (نوازش)

سمرا شہ اصغر، لاہور سے۔ "آپ کی وجہ سے پاکیزہ جیسا معیاری میگزین پڑھنے کو ملتا ہے تو دل سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی ہیں فہرست میں عمیرہ کا نام دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ ناول پڑھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ بہت اچھا ناول اور منفرد موضوع پر ہے۔ پہلی قسط ہی ڈھیر سارا تجسس چھوڑ گئی اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ناولٹ میں میمونہ خورشید نے معرکہ مار لیا۔ اس بار افسانوں میں رابعہ نیازی کا رزق بھی بہت پسند آیا۔ بشریٰ کا افسانہ بھی ساون کا مزہ دے گیا۔" (شکریہ)

عظمیٰ عنبرین، ڈی جی خان سے۔ "کافی عرصے بعد آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ قیصرہ حیات صاحبہ کے کالم اللہ کے مہمانوں کی ذمے داریاں پڑھ کر دوبارہ لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ گناہ گار کو بھی اس سال اپنے گھر کا بلاوا بھیجا اور انشاء اللہ اسی سال یہ میرا پہلا سفر حج تو ہو گا مگر آخری نہیں۔ قیصرہ صاحبہ نے اپنی تحریر میں اللہ کے مہمانوں، خصوصاً پاکستانیوں کے لباس، اخلاق اور رویوں کا جو مشاہدہ کیا بطور پاکستانی مجھے بھی ان نادان پاکستانیوں کے عمل پر بے حد دکھ اور افسوس ہوا۔ اللہ سب کو ہدایت دے، میں قیصرہ صاحبہ کے ریفرنس سے ان کی اس تحریر کے کچھ اقتباسات ایک روزنامے میں بھیجنا چاہتی ہوں۔ نیت صرف یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آگہی ہو اور ہم لکھنے والے بہترین طور پر اپنے قلم کا حق ادا کر سکیں (جی ضرور) خوشبو کا سفر پر صائمہ اکرم اور پروفیسر عابدہ خان کی رائے سے انتہائی ادب کے ساتھ مجھے



اختلاف ہے۔ سمیعہ اور روما جیسے کردار ہمارے معاشرے میں اکثر جگہوں پر پائے جاتے ہیں ہم جیسے لوگ جو اسٹار پلس، ڈراموں اور فلموں سے کوسوں دور بھاگتے ہیں اور ٹی وی اگر دیکھتے بھی ہیں تو نیوز یا جیوگرافک قسم کے پروگرام کے لیے تو اس تحریر میں اکثر قارئین کے لیے دلچسپی اور سبق حاصل کرنے کا سامان موجود ہے۔ عظمیٰ آفاق سعید کو دوبارہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے پر بے حد مبارک باد۔ عمیرہ احمد کے ناول عکس پر فی الحال میرا تبصرہ محفوظ ہے۔ دو چار اقساط کے بعد رائے دوں گی۔ اس بار ہومیو کلینک مختلف اور منفرد لگا اور انجم آنٹی، ماضی میں جب میں پاکیزہ میں تبصرہ وغیرہ لکھا کرتی تھی تو کبھی کبھار دل میں آپ سے ناراضی محسوس ہوتی تھی کہ مجھے لگتا تھا آپ مجھے انگور بہت کرتی ہیں اب بہنوں کی محفل میں اگست کے شمارے میں آپ کا ابتدائیہ پڑھا تو وہ پرانی بات یاد آئی۔ آپ نے اتنے پیارے انداز میں بہنوں کی محفل کے آغاز میں جو تحریر کیا اس سے میری وہ بھولی بسری ناراضی ختم ہو گئی اور میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا کرے، بغیر حساب کتاب کے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ میری طرف سے بھی دعاؤں کی درخواست۔" (اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا کرم عطا فرمائے اور دونوں جہانوں میں خیر ہو)

فاطمہ یوسف، راولپنڈی سے۔ "اچھی بات کہنا بھی ایک صدقہ ہے، یہ جملہ میرے ذہن میں بار بار گونجا جب میں نے قیصرہ حیات کا اللہ کے مہمانوں کی ذمے داریاں پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نیکی کا حکم دینے کا فرماتا ہے اور یہ سعادت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے اور یہ تو نصیب کی بات ہے کہ کون سبقت لے جائے نیک بات کہنے میں، قیصرہ حیات جزاک اللہ۔ ایک ایک حرف میرے جذبوں کا اظہار تھا اور ایک ایک جملہ میرے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا یہی سب کچھ تو میں نے لکھنا چاہا کہنا چاہا مگر مجھے یہ لگتا تھا کہ میں دریا کو کوزے میں بند نہیں کر سکتی۔" (شکریہ)

گیتی آرا، کراچی سے۔ "اگست کے پاکیزہ میں اپنی تحریر دیکھ کر دل تو بے اختیار چاہ رہا تھا کہ فون پر آپ کا شکریہ ادا کروں اور ساتھ ہی منی آرڈر ملنے کا بھی لیکن آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ اس دور میں بھی ہمارے پاس فون کی سہولت اور آرام نہیں ہے، ہم مہینے دو مہینے میں کبھی بہن بھائی کے یہاں چکر کاٹتے ہیں تو وہیں سے اپنے جاننے والوں کو فون کر کے خیر خیریت پتا کر لیتے ہیں بہرحال ایک بار پھر ہم آپ کے بے حد مشکور ہیں کہ آپ نے ہمارے افسانے کو پاکیزہ کی زینت بنایا اب بات ہو جائے ماہ اگست کے شمارے کی۔ سب سے پہلے تو پیارے نبی ﷺ کے اسمائے گرامی کی صفات اور معنی ہماری معلومات میں ایک عظیم اضافے کا سبب بنے اور پھر عمیرہ احمد اور ان کے ناول عکس نے ہمیں چونکا کے رکھ دیا۔ ایک اتنا بڑا نام اور اب پاکیزہ میں دو دو ناول کے ساتھ واہ مزہ آ جائے گا۔ اب بات ہو جائے اس ماہ کے مختصر اور دلچسپ افسانوں کی عائشہ خان کا بس ایک لمحہ، رابعہ نیازی کا رزق آج کل کے اس بے راہ روی کے دور میں اپنے مذہبی جذبات اور اسلامی ہدایات کو اجاگر کرنے والی ایک بہترین تحریر تھی۔ جان ہے تو جہان ہے میں فاخرہ گل نے زندگی کے چھوٹے سے مگر اہم ترین مسئلے پر قلم اٹھایا اور خوب صورتی سے اس طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور احساس دلایا۔ فوزیہ فرخ کی ایک خوشی اور ہنسی ایک منفرد سی تحریر کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں تھا خوشیوں کے لمحے اضافہ فیصل کی دکھاوے اور فضول خرچی کے خلاف لکھی گئی ایک اچھی تحریر تھی۔ واقعی میں ہم اگر ان بناوٹی خوشیوں پر توجہ دینے کے بجائے بنیادی خوشیوں پر توجہ دیں تو ہماری زندگی کتنی سہل اور خوب صورت ہو جائے۔ انجم باجی کا جلترنگ تو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمیشہ سب پر سبقت لے جاتا ہے اور اس بار بھی لے گیا خاص کر خاکہ انداز ے خوب صورتی سے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔" (شکریہ)

☜ کلثوم ملک، لیہ سے۔ "پاکیزہ بے حد پسند ہے۔ میں ہاؤس وائف ہوں مگر پاکیزہ پڑھنے کا وقت ضرور نکالتی ہوں۔ عمیرہ احمد کا ناول مجھے بے حد پسند آرہا ہے اور بہنوں کی محفل تو بہت بہت اچھی لگتی ہے۔" (کلثوم بہن اس محفل میں خوش آمدید...... آپ کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں)

☜ عفت گلزار، لیہ سے۔ "باجی، مجھے صبا نور سے دوستی کر کے بہت اچھا لگا۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ پاکیزہ کی تمام تحریریں مجھے اچھی لگتی ہیں مگر عمیرہ احمد کا ناول اپنے مزاج سے مختلف ہونے کے باوجود بھی اچھا لگ رہا ہے۔ جلترنگ کے تمام خاکے پسند آئے ہاں عظمٰی آپی کا افسانہ کب آئے گا۔" (جلدی، انشاءاللہ)

☜ مسز شاہدہ پروین، کراچی سے۔ "پہلی مرتبہ کسی بھی مدیرہ سے رابطہ کر رہی ہوں ...... اس محفل میں محبت کی خوشبو ایسی نظر آتی ہے جو اس سے قبل مجھے کہیں نظر نہیں آئی کہ آپ کتنی محبت کرتی ہیں اپنی بہنوں سے...... کہ بے اولاد بہنوں کے لیے رمضان میں دعا تک کرا رہی ہیں اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ سب آپ نے خود کیا ہوگا۔" (شاہدہ اس محفل میں خوش آمدید...... آپ اس محفل میں شامل ہو ہی گئی ہیں تو آپ کو جلد ہی یہ بھی پتا چل جائے گا کہ میری بہنیں جتنی محبت مجھ سے کرتی ہیں اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھتی ہیں عمرہ کرنے جاتی ہیں تو میرے لیے طواف کرتی ہیں، عمرے کرتی ہیں، میں تو ایسا کچھ بھی نہیں کر پاتی مگر یہ ضرور ہے کہ محبت کا جواب صرف محبت ہی ہوا کرتا ہے، مجھے اپنی ہر بہن واقعی بے حد عزیز ہے)

☜ سدرہ رحمان، بہاول پور سے۔ "میں آپ کو بوا جانی کہہ سکتی ہوں مجھے اور میری بہن کو پاکیزہ بے حد پسند ہے اور سب سے زیادہ یہ محفل عذرا آنٹی کا انٹرویو بھی ہمیں بہت پسند آیا تھا۔ عمیرہ احمد کا ناول پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اتنے سارے ناول پڑھنے کے باوجود آپ کے ناول کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ جلدی ہی اپنے نئے ناول کے ساتھ آئیے گا۔" (پیاری سدرہ اس محفل میں خوش آمدید۔ تم مجھے بوا کہو، نانی کہو یا دادی کہو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... ہاں اب پاکیزہ میں تمہارا تبصرہ ہر ماہ آنا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے نا......)

☜ نسیم نیازی، لاہور سے۔ "عمیرہ احمد کے عکس کی دوسری قسط پڑھی آثار بتا رہے ہیں کہ یہ اسٹوری کچھ سسپنس اور خوفناک قسم کی ہوگی۔ عمیرہ کی پہلی تحریروں سے کچھ ہٹ کر ہے مگر پہلی قسط سے ہی قدم جمانے میں کامیاب رہی ہے۔ عالیہ کا ناول لگتا ہے کہ اب اختتام کی جانب گامزن ہے مگر روما کے ساتھ جو ہونے چلا ہے وہ کچھ ٹھیک نہیں ...... ہوسکتا ہے یہ سب ہوتے ہوتے کچھ اور ہو جائے کہ روما کی بچت ہو جائے بہر حال عالیہ کا قلم روما کی تقدیر... بدل سکتا ہے سو عالیہ روما کے لیے کچھ اچھا اچھا کرنا۔ عید کے حوالے سے ہلکے پھلکے افسانے لگے ہیں اس مرتبہ چونکہ رمضان میں ہر کسی کی زندگی کا قرینہ بدل جاتا ہے ٹائم ٹیبل ٹف ہو جاتا ہے ایسے میں پڑھنا لکھنا کم ہو کر رہ جاتا ہے مگر یونہی ورق گردانی میں ہلکے پھلکے افسانے پڑھ لیے جاتے ہیں۔ فریدہ اشفاق کی جوابی کارروائی میں نہ جانے انہوں نے عید کے حوالے سے کیا لکھنے کی کوشش کی میں تو سمجھ نہیں پائی سوائے لفاظی کے کہانی میں جان نہیں تھی اسی طرح معذرت کے ساتھ غزالہ فرخ کا عید کا جوڑا بھی کچھ خاص متاثر نہ کر سکی البتہ عذرا آفتاب کی صلہ متاثر کن رہی کہ کریم جیسے اور زری جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی یہ دنیا جنت



ہے، آٹے میں نمک کے برابر ہی صحیح مگر ایسے لوگ اب بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ عید آئی ہے رفاقت جاوید کی تحریر میں تھوڑی سی جان تھی عطیہ ہدایت اللہ کی میری عید سچے واقعے پر مبنی اک خوب صورت یاد لگی۔ رجب میں عمرے کا پروگرام بنا تو پھر پورے ماہ دھیان گیان کے سارے سلسلے اُدھر ہی لگے رہے شعبان خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں یوں گزرا جیسے میں دنیا میں نہیں ہوں، نہ دن کی خبر نہ رات کا پتا نہ تاریخ یاد نہ دن یاد پورے بیس دن ایسے ہی لگا نہ کوئی یاد نہ خیال نہ سوچ بس چند گھنٹوں کی نیند، دو ٹائم کا کھانا اور باقی کا وقت خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں رب کے حضور جھکے گزار دیا۔ پاکیزہ کے تمام ممبران جوق در جوق دعاؤں میں خود بہ خود آتے رہے اور یقین کریں مجھے یوں لگتا تھا کہ میں خود سے بڑھ کر دوسروں کے لیے دعا گو ہوں اور جب بھی اپنے لیے مانگنے لگتی تو تمام احباب خود بخود دعا بن کر ہونٹوں پر سج جاتے تھے۔ میری تمام تر زندگی کے سب سے خوب صورت دن اب وہاں سے لوٹی ہوں تو دل کی پیاس اور شدتوں پر ہے کہ اللہ ہر سال بلائے بار بار بلائے مجھے اور تمام اہل اسلام...... آتے ہی قیصرہ حیات کا اللہ کے مہمان پڑھنے کا اتفاق ہوا بہت سی باتیں سچ لگیں مگر کچھ لوگوں میں سارے پاکستانی شامل نہیں بہر حال واقعی ہم پاکستان کی پہچان ہوتے ہیں دوسرے ملک میں تو ہمیں اپنی پہچان کو فخر کا باعث بنانا چاہیے بہر حال حج اور عمرے کے لیے عبایا ہر پاکستانی عورت کے لیے لازمی ہونی چاہیے کہ یہ ضروری ہے ورنہ واقعی لان کے کپڑے اور دوپٹوں میں اڑتی قمیص کچھ اچھا تاثر نہیں کہ ہم پر اس گھر کی حاضری کے کچھ اصول لاگو ہوتے ہیں ادب کے احترام کے اور پردے کے جب ہم اس کے حضور حاضر ہوں تو کم از کم ہمارا لباس ایسا تو ہو کہ ہم پر فخر کیا جا سکے۔ تمام پاکیزہ ممبران کو عید مبارک۔" (آپ کی رائے سے میں سو فیصد متفق ہوں)

☜ حمیرا کلیم، ملتان کینٹ سے۔ "فصیحہ جی کا خط پڑھا... وہ یقیناً کسی اور حمیرا کے دھوکے میں مجھے پوچھ رہی ہوں گی اور جہاں تک وہ میرے بارے میں جاننا چاہ رہی ہیں تو میری ساری ایجوکیشن فیڈرل اسکول سے ہے اور میں ملتان کینٹ میں رہتی ہوں ویسے ہم دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ میری شادی کو بھی چھ سال ہو جائیں گے مگر اولاد نہیں ہے مگر خیر اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی کوئی بات نہیں۔ اس بار سرورق اچھا لگا خاص کر ماڈل کی لپ اسٹک زیادہ اچھی لگی ...... ہے نا عجیب سی بات۔ اداریہ اور دین کی باتیں پڑھ کر ناولز تک آئے۔ عکس زبردست ناول جا رہا ہے اصل کہانی سے جڑی جزئیات اور ایک ایک چیز کی منظر نگاری زبردست ہے ویسے جہاں تک بونے کی بدصورتی کا تعلق ہے بچی بات ہے مجھے بھی پڑھ کر افسوس ہوا کیونکہ مجھے بھی بونے کہانیوں اور کارٹون والے ہی پسند ہیں ایسے ڈراونے نہیں۔ قربتوں کی دوری میں روبی بہت ہی بری لگی مگر کہانی بہت اسٹرونگ جا رہی ہے بوریت نہیں ہونے دے رہی۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں میں کرداروں کی بہتات اس لیے زیادہ لگ رہی ہے کہ ماضی اور حال ساتھ ساتھ چل رہا ہے جو کسی واضح اسٹوری لائن کو سامنے نہیں لا رہا مگر تھوڑا سا ٹائم تو رائٹر کو ملنا چاہیے نہ کہ فوراً تنقید شروع کر دی جائے مگر مجموعی طور پر ناول بہت بوجھل اور افسردہ کر دینے والا ہے۔ ایک سی نیتاں، بہت ایوریج سا ناول ہے، امید ہے کہ آئندہ اقساط میں بہتر ہو جائے گا۔ خوشبو کا سفر میں شہوار پر ترس آیا کہ عورت محض شوہر کی تھوڑی سی توجہ چاہنے کے لیے کیسے کیسے قدم اٹھا لیتی ہے، اپنی عزت نفس کو بھی پس پشت ڈال کر مگر اس نے بھی یقیناً ٹھنڈے دودھ پر پھونکیں ماری تھیں جو آج یہ دن دیکھ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی ہے۔ افسانے سب ہی شاندار تھے۔ جوابی کارروائی مزے کی تحریر تھی کیوٹ سی کیسی خوشی لے کر آیا چاند کافی پُرلطف تھی مگر اس میں سب سے زیادہ دکھی کراچی کے حالات نے کیا۔" (یہ تو ہے)

محترمہ سمیعہ امجد شیخ، لالیاں سے۔ "بہت عرصے تقریباً دو سال کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، آپ کو تمام لکھنے والی بہنوں کو پاکیزہ اسٹاف کو ہمیشہ یاد رکھا مگر بوجہ مصروفیت بچوں کے شامل نہ ہو سکی لیکن پاکیزہ سے رشتہ تو ڑا نہیں پڑھتی ضرور رہی ہوں۔ میرے پیارے لختِ جگر کمپیوٹر سوری کمپیوٹر دور کے اتنے ایکٹو ہیں کہ انہوں نے مجھے خود کا ہوش بھلا دیا ہے اب جبکہ میری بیٹیوں اور ایک عدد اکلوتے بیٹے دھی کی اسکولنگ شروع ہو چکی ہے تو سوچا کہ یار تمام دن تو گھر میں گھن چکر بن کر پھرتے ہیں تو کیوں نا نجو آنٹی سے ہیلو ہائے کی جائے۔ عظمیٰ آفاق ماشاءاللہ بہت آگے جا رہی ہے اور امید ہے کہ اجیہ بھی اسی لائن میں آئے گی۔ عمیرہ کی تحریر عکس بہت اچھی کاوش ہوگی یقیناً، صائمہ اکرم کے بچوں کی تعداد کتنی ہو چکی ہے۔ بہت سی تبصرہ نگار بہنیں ہم سے بچھڑ چکی ہیں جیسے چاندنی عمران ان کا مجھے بہت دکھ ہوا خدا تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ میاں جانی کو میٹھی چاکلیٹ کھلا کر سلا دیا ہے اور خود جلدی سے لیٹر لکھ رہی ہوں اب میں پھر سے پہلے جیسی سمیعہ لاڈو بن کر آپ سے رابطہ کروں گی۔" (پیاری لاڈو سمیعہ..... میں آپ کے مزے مزے کے مراسلات اور چٹ پٹے تبصروں کی منتظر رہا کروں گی)

محترمہ فریدہ فری، لاہور سے۔ "افسانوں اور ناولٹ کی کیا تعریف کروں تمام کے تمام اتنے اچھے ہوتے ہیں کس کس کی تعریف کروں اگر اس میں نہ بھی لکھوں تو پورا رسالہ پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ کیسی خوشی لے کر آیا چاند اجم جی آپ کی تحریر پڑھ کر اچھا لگا تصویریں بھی سب کی اچھی ہیں شگفتہ جی ذرا موٹی ہو گئی ہیں پہلے نازک سی تھیں۔ میری عید..... عید آئی ہے، عید کا ناولٹ تو اتنا اچھا لگا پڑھ کر مزہ آگیا۔ شادی کا احوال غزالہ فرخ کے بیٹے کی شادی واقعی اسفند اور مینام کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی لگ رہی تھی۔ مینام نام بھی بے حد پیارا لگا غزالہ جی مبارک ہو۔ نزہت جبیں ضیا کا افسانہ واہ نزہت جی کیا لکھتی ہو کمال کا۔ صلہ ایک سبق آموز تحریر تھی۔ غزالہ فرخ کا عید کا جوڑا بھی خوب صورت تحریر لگی۔ ہم سفر تحریر تو رسالے کی جان تھی۔ فریدہ اشفاق کا افسانہ بھی بے حد پسند آیا۔ فریدہ خانم کی نظم مختلف بے حد اچھی تھی۔ عظمیٰ جی اس مرتبہ بھی آپ نے میری غزل نہیں لگائی تو آپ سے کٹی ہو جائے گی۔" (تبصرے کا شکریہ)

بہنوں کی محفل اب اختتام کو پہنچی۔ اجازت دیجیے، اس دعا کے ساتھ کراچی میں ہمیشہ امن و امان رہے۔ تمام مسلمان بہن بھائی ایک دوسرے سے اسی طرح محبت کریں جیسے وہ اپنے سگے بہن بھائیوں سے کرتے ہیں کسی کے گھر کا چراغ نہ بجھائیں..... یہ بچے پیدا ہوتے ہی جوان نہیں ہو جاتے۔ یارب العالمین ہر ماں کا کلیجا ٹھنڈا رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی، سماوی آفات تمام پریشانیوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے۔

آمین ثم آمین
دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

# پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

## حمدِ باری تعالیٰ

نام بھی تیرا عقیدت سے لیے جاتا ہوں
ہر قدم پر تجھے سجدے بھی کیے جاتا ہوں
کوئی دنیا میں مرا مونس و غم خوار نہیں
تیری رحمت کے سہارے پہ جیے جاتا ہوں
تیرے اوصاف میں ایک وصف خطا پوشی ہے
اس بھروسے پہ خطائیں بھی کیے جاتا ہوں
آزمائش کا محل ہو کہ مسرت کا مقام
سجدۂ شکر بہرحال کیے جاتا ہوں

شاعر: اقبال عظیم
مرسلہ: نور افشاں، شکارپور

## نعتِ رسول مقبول ﷺ

محمدؐ کی نگری میں جا کے تو دیکھو
مقدر ذرا آزما کے تو دیکھو
وہ سنتے ہیں سب کی مرادیں ہوں جن کی
ذرا اُن کو اپنی سنا کے تو دیکھو
جہاں پر فرشتے بھی سر کو جھکائیں
وہاں اپنے سر کو جھکا کے تو دیکھو
کمی کیا ہے اُن کے خزانے میں لوگو!
تم اپنا بھی کچھ لٹا کے تو دیکھو
وہ کملی میں اپنی چھپا لیں گے تم کو
محبت میں ان کی فنا ہو کے تو دیکھو

شاعر: فریدہ افتخار، پشاور

## حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عنقریب لوگوں پر دھوکے سے بھرپور سال آئیں گے۔ ان میں جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا۔ بددیانت کو امانت دار سمجھا جائے گا اور دیانت دار کو بددیانت کہا جائے گا رویضہ باتیں کریں گے۔"

کہا گیا "رویضہ (کا مطلب) کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "حقیر آدمی عوام کے معاملات میں رائے دیں گے۔"

ابن ماجہ (4036)
مرسلہ: فرزانہ جمالی، نواب شاہ

## حدیث نبوی ﷺ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جتنی سخت آزمائش اور مصیبت ہوتی ہے، ثانی بڑا اس کا صلہ ہوتا ہے اور خدا جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو ان کو مزید نکھارنے کے لیے، کندن بنانے کے لیے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے پس جو لوگ خدا کی رضا پر راضی ہوں خدا بھی ان سے راضی ہو جاتا ہے۔"

مرسلہ: رخسانہ امجد، ملکوال

## انمول موتی

☆ خدا کے نزدیک اچھا عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو۔

☆ جس طرح خاردار درخت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے کانٹوں کے اسی طرح امرا کی صحبت سے سوائے گناہ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ جو دوست سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے، وہ موقع ڈھونڈتا اور معقول بات سے بھی برہم ہو جاتا ہے۔

☆ جو کلام اپنے وقت میں کہا جائے وہ چاندی کی رکابی میں سونے کا سیب ہے۔

☆ چھت کے کونے پر رہنا جھگڑالو عورت کے ساتھ مشترک گھر میں رہنے سے بہتر ہے۔

☆ اللہ سے محبت کرنے والا انسانوں سے کبھی نفرت نہیں کرتا۔

☆ لکڑی کے نہ ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے اور چغل خور کے نہ ہونے سے جھگڑا تھم جاتا ہے۔

مرسلہ: تانی چوہدری، یو کے

## کیسے سجائیں اپنی عید

لوگ کہتے ہیں
عید آرہی ہے
اپنوں سے ملنے کی نوید آرہی ہے
خوشیوں کے رنگ لیے
چوڑیوں کی کھنک لیے
جھلمل جوڑوں کی جگمگاہٹ بھی ہے
دلوں میں امنگ اور ترنگ بھی ہے
کہ روزے داروں کا ہے یہ انعام عید
رب کے پیاروں کا ہے یہ انعام عید
میں نے مانا آرہی ہے عید
میں نے جانا عید آرہی ہے
اپنوں سے ملنے کی نوید لیے
مگر جن کے اپنے بچھڑ گئے
جن کے سپنے بکھر گئے
خوشیاں غم کی ردا اوڑھے ہیں
چوڑیاں ٹوٹ گئیں
رنگ جوڑوں کا اڑ گیا
دل میں اداسیاں ہیں، ویرانیاں ہیں
ترنگ نہیں زندگی میں، امنگ نہیں زندگی میں
مجھے
کوئی بتائے کیسے وہ منائیں عید
کیسے وہ سجائیں اپنی عید

شاعرہ: نسیم نیازی، لاہور

## ہمیشہ یاد رکھیے

☆ چلتے وقت خیال رکھو کہ تمہارے قدموں کی دھول سے کسی کی منزل گم نہ ہو۔

☆ ہر قہقہے کے پیچھے آنسو ہے اور آنسوؤں کے پیچھے زخموں اور آہوں کی جلن ہوتی ہے۔

☆ جہاں جاؤ وہاں اپنی خوشبو چھوڑ کر آؤ تاکہ لوگ آپ کو اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔

☆ کسی کو اتنا نہ چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ ہو سکے۔

☆ ساری بات تو تعلق کی ہوتی ہے اگر تعلق ہی ٹوٹ جائے تو شکایتیں کیسی۔

☆ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ ''حرام باتوں سے بچو سب سے بڑے عابد بن جاؤ گے۔''

☆ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تمہاری قسمت میں ہے اس پر راضی ہو جاؤ سب سے بڑے غنی بن جاؤ گے۔

☆ زیادہ نہ ہنسا کرو اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

☆ تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔



☆ اپنے والدین سے حسنِ سلوک کرو تمہاری اولاد تم سے حسنِ سلوک کرے گی۔

☆ جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

مرسلہ: مسز عشرت غفار، کراچی

## انٹرویو کارنر

پیارے پیارے قارئین! دیکھتی آنکھوں، سنتے کانوں آپ کو صبا کا سلام پہنچے۔ میں لیہ شہر کی مکین ہوں، مجھے اپنے شہر سے بے پناہ پیار ہے۔ میں نے 21 اکتوبر کو اس دنیا میں آکر پہلی سانس لی، پھر پہلی کے بعد دوسری دوسری کے بعد تیسری حتیٰ کہ سانس لینے کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بے حد حساس، سیدھی سادی اور پُرخلوص سی لڑکی ہوں لیکن مجھے ہمیشہ مطلب پرست، خودغرض اور لالچی لوگ ملے ہیں اسی وجہ سے میری کوئی دوست نہیں ہے۔ میں بہت اکیلی ہوں۔ شاعری سے کافی حد تک لگاؤ ہے۔ میری فیورٹ شاعرہ پروین شاکر ہیں اور فیورٹ رائٹر انجم انصار، صائمہ اکرم اور عمیرا احمد ہیں۔ خوشبو موتیا کی اور پھولوں میں گلاب پسند ہے۔ موسم بہار کا اچھا لگتا ہے۔ کھانوں میں سب کچھ پسند ہے کسی کھانے کو ناپسند کہہ کر اس کی بے حرمتی نہیں کرتی۔ گرمیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں البتہ سردیوں کی لمبی راتیں بہت پسند ہیں۔ گلوکاروں میں عابدہ پروین، میڈم نور جہاں اور لتا پسند ہیں۔ وائٹ کلر میرا فیورٹ ہے، اپنے مذہب اسلام سے بے حد محبت ہے۔ رسالوں میں پاکیزہ کے علاوہ کسی اور کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا، پاکیزہ میرا فیورٹ رسالہ ہے اور اس میں چھپنے والی ہر تحریر مجھے دل سے پسند آتی ہے، مجھے پاکیزہ کی ایڈیٹر انجم انصار سے بے پناہ پیار ہے۔ میری طرف سے آپ سب کو بہت بہت عید مبارک ہو، میری دعا ہے کہ اللہ پاک آپ سب کو ڈھیروں خوشیاں دے، آمین۔

تحریر: صبا نور، لیہ

## تیرے لیے

عید کی مہکتی رُت میں
لرزتے لبوں کی خاموشی
دعائیں تجھے اپنے حصار میں
رکھے گرچہ مجھے پرخزاں چھائی ہے
لیکن میرے نصیب کے سارے
سکھ تیرے شہر کی ہوا بن جائیں

شاعرہ: رابعہ انجم، چیچہ وطنی

## غزل

انا کو بیچ کر غیروں سے بھیک مت لینا
حرام رزق پہ ترجیح دینا فاقوں کو
جو دن میں سوتے ہی رہتے ہیں خوابِ غفلت میں
وہ رات بھر ہی گنا کرتے ہیں ستاروں کو
جو طعنہ وعدہ خلافی کا سب کو دیتے ہیں
کبھی نہ پورا کریں گے خود اپنے وعدوں کو
جو خوش نصیب ہیں وہ بھی غموں کے ماروں کو
کبھی خوشی کی دیں خیرات ان کے خوابوں کو
زمانہ چال قیامت کی چل گیا لیکن
رکھو گے بند جھلاکب تلک تم آنکھوں کو
سکھایا ہوتا ادب کا سلیقہ بچپن میں
شباب میں کیا سکھاؤ گے نوجوانوں کو
فرح رکھیں گے بھلا کیا حساب شہدا کا
خدا دے صبر کی توفیق اُن کی ماؤں کو

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، آسٹریلیا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## خوب صورت بات

ایک جوکر نے لوگوں کو ایک جوک سنایا تو سب لوگ بہت زیادہ ہنسے۔ اس نے وہی جوک پھر سنایا تو کوئی بھی نہ ہنسا تو پھر اس نے ایک بہت خوب صورت بات کہی۔ ''اگر تم لوگ ایک خوشی کو لے کر بار بار خوش نہیں ہو سکتے تو پھر ایک غم کو لے کر بار بار روتے کیوں ہو؟''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

## محبت

محبت بھاگ دوڑ نہیں ہوتی، طوفان نہیں ہوتی، سکون ہوتی ہے۔ دریا نہیں ہوتی، جھیل ہوتی ہے۔ دوپہر نہیں ہوتی، بھور سے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی، اجالا ہوتی ہے۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ یہ کیا ہوتی ہے کہ یہ بتانے کی نہیں برتنے کی چیز ہے سمجھنے کی نہیں جاننے کی چیز ہے۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

## آنی جانی شے

ٹیچرز بے چاریوں کی عزت ہی کیا ہے۔ ہیڈ مسٹریس نے محبت سے بات کر لی، وہ جھنڈے پر چڑھ گئیں۔ ان کی عزت و احترام کی گواہیاں دی جانے لگیں۔ خوشامدی ان کو سلام کرنے میں پہل کرنے لگے۔ ہیڈ مسٹریس نے کسی بات پر ڈانٹ دیا۔ عزت چلی گئی اغیار خوش ہو گئے۔ جتنی بے چاری ٹیچرز کی عزت آنی جانی شے شاید ہی کسی کی ہو۔

انجم انصار کی کتاب جلترنگ سے

مرسلہ: سمیرا مجاہد، صادق آباد

## سسرالی بریانی

اجزاء ایک عدد ساس، بارہ عدد، نندیں۔ دو جٹھانیاں۔ دو عدد، دیورانیاں۔ دو عدد، جیٹھ۔ دو عدد، دیور۔ ایک آدھ ان کا بچہ، حسب ضرورت۔ ایک عدد، سسر۔ اگر سسر نے دو شادیاں کی ہیں یا کوئی دوسری ساس بنانے کا سوچ رہے ہیں تو متوقع ساس کو بھی شامل کر لیں۔

ترکیب: سب سے پہلے دیگچی میں ساس کو ڈالیں اور گرم دیگچی میں اچھی طرح ملائیں یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ آٹھ نندوں کو باریک کتر کر اتنا باریک کاٹیں کہ ان کا کچومر نکل جائے۔ بے ہوش ساس کے ساتھ دیگچی میں ڈال دیں۔ جٹھانیوں اور دیورانیوں کو جیٹھ اور دیور کے ساتھ ملا کر اچھی طرح گرینڈر میں گرینڈ کر لیں جب سب مل خم نکل جائیں تو اس آمیزے میں تیز سرخ مرچ، گرم مسالا اور اچھی طرح نمک چھڑک کر دیگچی میں شامل کر دیں اور ڈھک دیں۔ تھوڑی دیر بعد دیگر نندوں کو شامل کر کے دم لگا دیں۔ سسر کو خوب صورتی سے کتر کر اوپر چھڑک دیں اور متوقع ساس کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔ مزے دار سسرالی بریانی تیار ہے۔

نوٹ: ہوشیار خبردار! ایسی بریانی کی ترکیب اگر مذاق میں بھی کسی سسرالی فرد کو سنا کر سنا دی تو یاد رکھیے گا آپ زندگی بھر مسکرا نہیں پائیں گی۔

ترکیب: سمیرا امجد شیخ، لالیاں

## ایک لڑکی کی دعا

''پاک پروردگار! میری شادی ایسے شخص سے ہو جس کے ہاتھ میں دماغ کی لکیر نہ ہو۔ اللہ جی! میں پناہ مانگتی ہوں ایسی شادی سے جس میں مجھے مصالحت آمیز زندگی گزارنی پڑے۔''

انجم انصار کی کتاب جلترنگ سے

مرسلہ: امینہ عزیز، سلانوالی

●●●



# میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆امینہ ..... کراچی، ملیر

دل میں عجیب طرح کی خوشیاں بکھر گئیں
وہ دل ربا سا شخص ہمیں جب کبھی ملا

☆شمیم رضا ..... لاہور

ایک مدت ہوئی تازہ ہیں تری یاد کے زخم
یہ نہیں اب کسی تریاق سے بھرنے والے

☆فرزانہ بلوچ ..... سندھ

ترا احسان ہے ہجرِ مسلسل بخشنے والے
نکھرتا جا رہا ہے فن میرا تیری سزاؤں سے

☆تانیہ امجد ..... کوئٹہ

ہم نے تو بہت اس میں بھی آزار اٹھائے
وہ ایک محبت جو محبت بھی نہیں تھی

حیرت ہے کہ اس وقت بھی تو ہی تھا ضروری
جس وقت مجھے تیری ضرورت بھی نہیں تھی

☆نائلہ واسطی ..... کراچی

اسی خیال میں گزری ہے شام درد اکثر
کہ درد حد سے بڑھے گا تو مسکرا دوں گا
تو آسمان کی صورت ہے گر پڑے گا کبھی
زمین ہوں میں بھی مگر تجھ کو آسرا دوں گا

☆علیزہ ..... پشاور

انتہا کوئی نہیں ہے ابتدا ہونے کے بعد
عشق کیا ہے جان لو گے مبتلا ہونے کے بعد
بس اسی امید پر پیشِ فنا خاموش ہیں
اک جہاں تعمیر ہوگا سب فنا ہونے کے بعد

☆ماریہ کوثر ..... کوٹ ٹاؤن

صدیاں تیری سمیٹ کے جو لے گیا قتیل
اب تیرے پاس لوٹ کے وہ پل نہ آئے گا

☆شاہین ..... سیالکوٹ

کہنا ہی چاہتے نہ تھے ہم تم کو لاجواب
سو سو جواب تھے تیرے اک اک سوال کے

☆عنبرین شاہ ..... لالہ موسیٰ

میرے عزیز! میرے درد کے سمندر میں
بس ایک لمحے کی خاطر اتر کے دیکھو تو

☆افشین ..... کیماڑی، کراچی

جس قدر میں نے مٹائے تری یادوں کے نقوش
دل بے تاب نے اتنا ہی تجھے یاد کیا

☆فریدہ فری ..... لاہور

ایسے نہ اپنی زلف کی زنجیر کر مجھے
میں آسماں کا چاند ہوں تسخیر کر مجھے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدت سے خستہ حال ہیں دیوارو در میرے
گرتا ہوا مکان ہوں تعمیر کر مجھے

☆مسرت افضل.....کوئٹہ

اِک نہ اِک دن کھل ہی جائے گا مزاجوں کا تضاد
آئینوں کو پتھروں کے روبرو کرتے رہو

☆رخسانہ جمیل.....حیدرآباد

چھونے سے قبل رنگ کے پیکر پگھل گئے
مٹھی میں آنہ پائے کہ جگنو نکل گئے
پھیلے ہوئے تھے جاگتی نیندوں کے سلسلے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے

☆ماہین حنیف.....کراچی

الجھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

☆لائبہ جاوید.....حیدرآباد

طوفاں کی اس ادا میں بھی کتنا خلوص تھا
ساحل تک آگیا ہے مجھے ڈھونڈتے ہوئے

☆جبیں رضا.....سرگودھا

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کردیا

☆تبسم ناز.....بھیرہ

قریۂ جاں سے جاتے جاتے وہ پرانا ٹھہر گیا ہے
یوں لگتا ہے اس موسم میں جی کا جانا ٹھہر گیا ہے
ممکن ہو تو شام کو اک دن ملنے کی تقریب کرو تم
کچھ دن کو اس شہر میں اپنا آب و دانہ ٹھہر گیا ہے

☆ایمان مشتاق.....لاہور

جسے یہ ضد تھی محبت میں فاصلہ نہ رہے
وہ کہہ رہا ہے کہ اب فاصلہ ضروری ہے

☆منیرہ احمد.....کراچی

وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو ہو بہو ہماری طرح

☆میمونہ نیازی.....کراچی

نہ جانے کون سی منزل پہ جاکے رک جائیں
نظر کے قافلے، دیوار و در سے گزرے ہیں

☆روبینہ حنیف.....کراچی

آج ہر آنکھ میں یوں اشک چمکتے ہیں وفا
شہر کا شہر ستاروں سے بھرا ہو جیسے

☆مہربانو.....کوئٹہ

کیسے نامانوس لفظوں کی کہانی تھا وہ شخص
اس کو کتنی مشکلوں سے ترجمہ میں نے کیا

☆حافظہ اقبال.....بہاول نگر

میں نے کوئی بیانِ صفائی نہیں دیا
بس چپ رہا تو خود ہی وضاحت سی ہوگئی

صائمہ شیخ.....حیدرآباد

بے کیف سہی بے رنگ سہی اک لہر تو اب بھی آتی ہے
دل لاکھ شکستہ ہو پھر بھی یادوں کا بھلانا مشکل ہے

☆فرحینہ ناز.....پشاور

جنہیں محسوس انسانوں کے رنج و غم نہیں ہوتے
وہ انساں بھی تو ہرگز پتھروں سے کم نہیں ہوتے

☆نیناں غلام مصطفیٰ.....حیدرآباد

کنجِ غربت میں کبھی گوشۂ زنداں میں تھے ہم
جانِ جاں جب بھی ترے آنے کا موسم آیا

☆پروین.....صدر کراچی

خیال ان کا بھی آیا کبھی تمہیں جاناں
جو تم سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ

●●●



# میرا انتخاب

آمنہ حماد

خوف کا ذائقہ زبان اور آنکھ میں ہمیشہ رہتا ہے اس کے ہاتھوں تنگ آکر انسان خوشامدی اور ڈرپوک ہوجاتا ہے۔ خوف نہ صرف شخصیت کو کھا جاتا ہے بلکہ روح بھی اس کی زد میں آکر کھوکھلی ہوجاتی ہے..... لیکن اگر خوف جذبۂ محبت میں ہو تو کچھ یہی رنگ نمایاں ہوتا ہے جو چراغ حسن حسرت کی اس غزل میں نظر آرہا ہے۔ اس کا انتخاب عالیہ صابری نے کراچی سے کیا ہے۔

## غزل

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش درد محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
امید وصل نے دھوکے دیے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

شاعری میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ عمدہ الفاظ کا چناؤ بہت کم شاعروں کا وتیرہ ہے احساسِ جمال شاعری کی ایک نمایاں خوبی ہے کشور ناہید کی شاعری بلاشبہ جذبوں اور احساسات کو ابھارنے کی شاعری ہے۔ اس کا انتخاب تہذیب فاطمہ نے کراچی سے کیا ہے۔

## غزل

وہ اجنبی تھا غیر تھا کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہوا نہ تھا
ہم کو تو احتیاطِ غمِ دل عزیز تھی
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا
دستِ خیالِ یار سے پھوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سوا نہ تھا
کچھ اس قدر تھی گرمیِ بازارِ آرزو
دل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا
کیسے کریں گے ذکرِ حبیبِ جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا
کچھ یونہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

شاعری ایک ایسا ہنر ہے جس کا ہر لفظ روح کی گہرائی سے نکل کر قرطاس پر بکھرتا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن پر ایسے نقش ہوجاتا ہے کہ پھر محو نہیں ہوتا۔ کچھ خیال کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتے..... کچھ ایسا ہی انداز احمد ذکی ضیا کی نظم میں نمایاں ہے۔ اس کا انتخاب نیر فہیم عطاری نے کراچی سے کیا ہے۔

## نظم

محبت میں کسی بھی بات کی قسمیں نہیں کھاتے
محبت تو فقط پیمان ہوتا ہے کہ دونوں
زندگی کے روز و شب کے درد کو
مل کر سمیٹیں گے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشی کا کوئی بھی لمحہ ہو
وہ مل کر گزاریں گے
کوئی پیمان ہو
وہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا
کہ دونوں میں سے کوئی ایک تو وعدہ نبھاتا ہے
نفی کرتا ہے اپنی ذات کی
خود کو مٹاتا ہے
محبت میں کسی بھی بات کی قسمیں نہیں کھاتے

شاعری ہو یا مصوری اس کے پیچھے ایک قدرِ مشترک جذبۂ عشق ہے..... وہ تصویر جو سوزِ دل سے بنائی جائے کبھی فنا نہیں ہوتی..... کچھ پالینے اور کھودینے کا احساس امجد اسلام امجد کی نظم میں نمایاں ہے..... اس کا انتخاب حرا مختار نے کراچی سے کیا ہے۔

## یہ اب جو موڑ آیا ہے

یہ اب جو موڑ آیا ہے
یہاں رک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے
کہ یہ اس راستے کا، دیکھنے کا، تولنے کا
اِک پیمانہ بھی ہے یعنی
یہ ایسا آئینہ ہے
جس میں عکسِ حال و ماضی اور مستقبل
بہ یک لمحہ نمایاں ہے
یہ اس کا استعارہ ہے
جو اپنی منزلِ جاں ہے
سنا ہے ریگِ صحرا کے سفر میں
راستے سے دو قدم بھٹکیں
تو منزل تک پہنچنے میں کئی فرسنگ کی دوری نکلتی ہے
سو اب جو موڑ آیا ہے
یہاں رک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے

زندگی میں جہاں محبت اور چاہت کی اہمیت ہے وہیں اظہار کے بغیر محبت کا تصور ممکن نہیں..... محبت سے حوصلہ پا کر کوئی دنیا فتح کر لیتا ہے اور کوئی ہار کر موت کو گلے لگالیتا ہے۔ جون ایلیا اپنی اس غزل میں کچھ ایسا ہی اظہار کر رہے ہیں اس غزل کو غزالہ نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

## غزل

ہم نے شکست کھا کے بھی ،ذکرِ وفا نہیں کیا
خود کو ہلاک کرلیا، خود کو فدا نہیں کیا
کیسے کہیں کہ اس کو بھی ہم سے کوئی لگاؤ ہے
اس نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا
مجھ کو یہ ہوش ہی نہ تھا تو مرے بازوؤں میں ہے
یعنی تجھے ابھی تلک میں نے رہا نہیں کیا
جانے تری نہیں کے ساتھ کتنے ہی جبر تھے کہ تھے
میں نے ترے لحاظ میں تیرا کہا، نہیں کیا
جو بھی ہو تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں، آپ نے کیا نہیں کیا
خیرہ سران عشق کا کوئی نہیں ہے جنبہ دار
شہر میں اس گروہ نے کس کو فدا نہیں کیا

محبوب کی قربت کی خواہش کسی حال میں فراموش نہیں ہوتی..... صدیوں پر محیط فاصلوں پر چند ساعتوں کی قربت بھاری ہوتی ہے۔ ایسی ہی حسرت اور تمنا کا اظہار سلیم کوثر اپنی نظم میں کرتے نظر آرہے ہیں..... اس نظم کو سمیرا ناراض نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

## بارِ امانت

تم تو کہتے تھے
ان جاگتے راستوں پر سرابوں کے ویراں افق
پھیلنے سے بہت پہلے لوٹ آئیں گے



وہ سے وہ زمانے کہ ہم پھر ملیں گے
ہوائیں درختوں پہ تازہ نصابوں کو تحریر کرنے لگیں گی
نئے نام لکھنے لگیں گی
در و بام پر دستکیں میری آواز میں
جب بدل جائیں گی تو پلٹ آئیں گی، وہ رُتیں
اور وہ
عنبر سے، ہم دوبارہ ملیں گے
انہی راستوں پر
جہاں وصل کی خوشبوئیں، بے کراں ساعتیں
مہرباں آیتوں کا بدل بن گئی ہیں
مگر اب تو وعدوں کی دہلیز پر جگمگاتے ہوئے
حرف بجھنے لگے، روشنی کے سبھی رنگ اڑنے لگے
اب زمیں اپنے سارے خزانے اگلنے لگی
آسمانوں کی چادر سے گردِ مہ و سال
دھرتی کے سینے پر گرنے لگی
مہرباں آیتوں میں لپٹنے لگی
اور در و بام پر دستکوں کے دھندلکے
اِک آواز بن کر ابھرنے لگے
اہلِ دل کی روایت بھی ہے
اور امانت بھی ہے
ناوکِ غم
اسے جسم و جاں کی تہوں میں چھپائے رکھو
اس روایت کو بارِ امانت سمجھ کر اٹھائے رکھو
پھر کسی نہ کسی دن پلٹ آئیں گے
وہ سے، وہ رُتیں، وہ زمانے
کہ ہم پھر ملیں گے

دکھ، درد، بے کلی اور چبھن نے جب لفظوں کا روپ اختیار کیا تو شاعری نے جنم لیا..... زندگی میں بعض لمحے ایسے آتے ہیں جب دل پر بوجھ بڑھ جاتا ہے..... ایسے میں شاعری مونس و غم گسار کی حیثیت سے ساتھ دیتی ہے۔ طارق نعیم کی یہ نظم بھی ایک ایسے ہی غم گسار کے روپ میں ہے۔ اس کا انتخاب صنم نے مری سے کیا ہے۔

## سوالوں کے سمندر میں ڈوبتی محبت

کبھی ڈوبے ہو تم جاناں محبت کے سمندر میں
سمندر جس کی گہرائی محبت جیسی ہو کر بھی
محبت سے بہت کم ہے
چلو چھوڑو سمندر کو
کسی دریا کی بابت پوچھتے ہیں ہم
کہ جس کی موج میں آ کر
خود اپنے آپ کو تم نے بھلا دیا ہو
کوئی وعدہ نبھایا ہو
کہیں ساحل کی گیلی ریت پر تم نے
کسی کا نام لکھا ہو
کوئی چہرہ بنایا ہو
چلو دریا بھی کیا
کوئی کہو اس جھیل کا قصہ
ان آنکھوں سے
کسی کی یاد کا کنکر گرایا ہو
پھر ان بنتے بگڑتے دائروں کے ختم ہونے تک
کوئی پیمانہ خود اپنے آپ سے جس کو چھپایا ہو
چلو اس کو بھی چھوڑو
یہ بتاؤ
کیا کبھی تم نے کسی کا ہجر دیکھا ہے
کسی کے دل میں اترے یا کسی کے دل سے
اترے ہو
کسی کی آنکھ میں
یا آنکھ کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے آنسو میں ڈوبے ہو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## چھنکتا ہاتھ

شادی سے قبل ہم نے کبھی چوڑیاں نہیں پہنی تھیں اس لیے اس کے جلترنگ سے بھی ہم قطعی ناواقف تھے۔ یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتے تھے اس لیے لباس میں بھی چیختے چلاتے رنگوں سے اجتناب برتتے تھے۔ چوڑی، مہندی سے بھی آشنائی نہ رکھی تھی۔ وہ شادی کے بعد پہلی عید تھی۔ چاند رات کو ہماری چھوٹی نند ہمیں چوڑیاں پہنانے لے گئیں۔ ایسی چکا چوند ہم نے پہلے کہاں دیکھی تھی۔ ہم تو چوڑیاں پہننے کے قائل ہی نہیں تھے۔ جیسے ہی ہم نے چوڑیاں پسند کیں۔ چوڑی والے نے ہمارا دایاں ہاتھ تھام لیا اور ہم لرز کر رہ گئے۔ غصے سے اسے دیکھا اور صدمے سے باجی کو کہ کسی طرح وہ ہمارے ہاتھ آزاد کرائیں مگر وہ تو یہ سب دیکھ کر بھی خاموش تھیں۔ تب شکایتی لہجے میں ہم بولے۔

''باجی..... گھر چلیں ہم نہیں پہن رہے۔'' اور ان سے جڑ کر کھڑے ہو گئے کہ چوڑی والا اکیلی لڑکی سمجھ کر کہیں آپے میں نہ رہا ہو۔

''ارے، ایسے ہی پہناتے ہیں چوڑیاں۔'' اور انہوں نے اپنی بغل میں سے باہر نکالا اور ہماری حالت دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ چوڑی والے نے لچھے سے چوڑیاں نکالیں۔ اپنی چوڑیوں کو دیکھ کر خود ہی واہ واہ کا نعرہ لگایا پھر بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں پھرا کر جانچیں جیسے کہ ان کا ایکسرے لمحے بھر میں کر لیا ہو اور آسودگی کی سانس بھر کر ہمارا ہاتھ دبایا ایک دفعہ..... دو دفعہ..... سہ دفعہ خدایا کیا کریں۔ رنگت پیلی پڑ گئی اور حالت غیر ہونے لگی کسمسا کر ہم نے اپنا ہاتھ کھینچا چوڑی ٹوٹ کر کلائی پر خراش بنا گئی۔

''ارے، ارے کیا کر رہی ہیں آپ؟ ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑیے۔'' اب وہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

''بھابی جلدی پہنیں ناں ابھی اور بھی چیزیں لینی ہیں۔'' ہماری نند ڈھیر سارے چوڑیوں کے سیٹ پسند کر کے علیحدہ رکھواتے ہوئے بولیں۔ وہ برا وقت کتنی مشکلوں سے بیتا یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اس کی ایک ایک ساعت پہاڑ جیسی تھی۔ وہ ہاتھ دبا دبا کر چوڑیاں پہناتا رہا اور ہم پسینے پسینے ہوتے رہے۔ وہ چوڑیاں پہنا کر ہاتھ تھام کر بولا۔

''کیسی اچھی لگ رہی ہیں کھن کھنا کھن کرتی ہوئی چوڑیاں۔ ایسا ملائم ہاتھ ہے کہ دو نمبر کی باتیں کس آسانی سے آ گئیں۔'' تب ہمارا دل چاہا کہ چار درجن چوڑیوں سے چھنکتا ہوا ہاتھ اس کے منہ پر دے ماریں اور اس سے پوچھیں کہ کتنی اچھی لگیں ہماری چوڑیاں..... چھناکا کھن کرتی ہوئی۔

## فن

پان کھانا ایک بہت بڑا فن ہے۔ ایسا فن جس کا شمار ہمارے فنونِ لطیفہ میں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کو ہر کوئی ہاتھ نہیں سیکھ سکتا۔ گویا یہ ایک ساز ہے جو ہر لے پر بجایا نہیں جا سکتا۔ میں زہرہ کو آدھے گھنٹے سے دیکھ رہی تھی انہوں نے ذرا سی پان کی کتر کھائی تھی اور وہ اس کو منہ میں نچائے چلی جا رہی تھیں۔ کبھی دائیں کبھی بائیں اور کئی دفعہ تو اگلدان میں پیک تھوک چکی تھیں مگر منہ پھر بھی بھرا کا بھرا تھا۔ الٹی کتر نہ ہوئی پتھر ہو گیا جو کسی صورت منہ میں گھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ پان کھانے کے بعد ان کے منہ میں پیک کی اس قدر بہتات تھی کہ بعض دفعہ ان کی بات صاف سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کتنی دفعہ تو وہ انگلیوں کو یو کی شکل میں گھما کر اپنی بہتی باچھیں پونچھ چکی تھیں اور ایک ہم اناڑی تھے کہ کبھی سادہ پان غلطی سے کھا لیتے تو حلق تک چھل جاتا اور چہرہ الگ سرخ پڑ جاتا اور میٹھا پان چاہے کتنا ہی گداز ہوتا نوالے کی طرح سیکنڈوں میں اس کو سنک جاتے۔

ایک دفعہ حرص میں پیک تھوکنے کو دل چاہا تو معلوم ہوا سارا پان ہی اگلدان میں چلا گیا ہے۔ گھر میں پٹاری ہونے کے باوجود ہمیں پانوں کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں۔ اتنا بھی علم نہیں تھا کہ سانچی پان اچھا ہوتا ہے کہ بنگلہ..... دیسی پان میں مزہ آتا ہے یا راجشاہی میں۔ ہم تو پان لگانے تک میں اس قدر پھوہڑ تھے کتھے اور چونے کا سنگم بھی متوازن نہ رکھ پاتے اور کھانے والے کو چونا لگا دیتے۔

ایک زہرہ بی تھیں پان کھانے کے دوران ان کو شربت پینا ہوتا، فالسے چکھنے ہوں، مزے سے پان دوسرے کلے میں دباتیں اور دوسری سائڈ سے خوب کھاتیں اور بعد میں پھر پان منہ میں منتقل کرنے لگتا۔ ایسا بھی ہم نے بارہا دیکھا تھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے سو گئیں دو گھنٹے کے بعد انھیں پان منہ میں پھر سے موجود..... بے دلی سے منہ میں گھمایا دو تین جماہیاں لیں اگلدان آگے کیا پان جتنا کھایا تھا اس سے چار گنا زیادہ تھوک دیا۔

''اے ہے..... باسی ہو گیا تھا۔ چلو منہ تازہ کر لیں۔'' یہ کہہ کر پاندان اپنی جانب گھسیٹ لیا۔

## شیر اور گیدڑ کی کہانی

''اللہ بچائے ہمارے میاں کے غصے سے تو..... غصے میں گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔'' رضیہ اپنے دکھڑے سنانے بڑی بہن کے ہاں آئی ہوئی تھیں کہ جب تک بھڑاس نہ نکلے دل ہلکا کہاں ہوتا ہے۔

''میری رضو، برا نہ مانا کر، دیکھ میاں کی گالی ہنس کر ٹالی سیانے..... یہی کہتے ہیں۔'' بڑی آپا بے پروائی سے سمجھا رہی تھیں۔

''ارے آپا، برا مانے میری جوتی پر انہیں پروا ہی کب ہوتی ہے۔ اب کل کی ہی بات ہے میاں جی کو آفس میں بڑی لعن طعن ہوئی، افسر نے کسی بات پر ڈانٹا تو گھر آ کر سارے کا سارا غصہ ہم پر اور بچوں پر اتار گیا۔'' اب رضیہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

''وہ کیسے؟'' بڑی آپا نے پوچھا۔

''جیسے دھوبی کم کپڑے کیوں دے کر گیا، تم نے پاجامہ واشنگ مشین میں کیوں دھویا، منی کی فیڈر کیوں نہیں مل رہی، چمچہ گندا کیوں ہو رہا ہے، یہ بار بار لائٹ کیوں جا رہی ہے، دروازہ بند کیوں ہے، دال اتنی پیلی کیوں ہے، نل میں سے پانی کیوں ٹپک رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔'' رضیہ تفصیل سے بتا رہی تھیں۔

''تمہاری نندیں کچھ نہیں سمجھاتیں بھائی کو..... اتنی ساری ہیں اور ہر وقت کرانا کاتبین کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح موجود بھی رہتی ہیں۔'' آپا حیرت زدہ تھیں۔

''ارے، وہ کیوں سمجھائیں گی۔ ان کو تو خوشیوں کی ڈرپ لگ رہی ہوتی ہے جب یہ مجھے باتیں سنا رہے ہوتے ہیں۔ کالی شکلیں خوشی سے لال ہو جاتی ہیں۔ جیسے ابھی ابھی خون چڑھوا کر آئیں ہوں۔'' رضیہ مزید بتا رہی تھیں۔

''اور بھائی وہ کچھ......؟'' آپا نے مزید کریدا۔

''ارے آپا یہ سب کرا دھرا بھائیوں کا ہی تو ہے۔ انہی کے نقشِ قدم پر ہمارے میاں چل رہے ہیں۔''

''واقعی......؟'' آپا حیران تھیں۔

''اور نہیں تو کیا۔ کل محمود بھائی نے اپنی بیوی صالحہ بھابی کو سب کے سامنے ڈانٹ دیا۔ اب ہمارے میاں کی تو مونچھیں نیچے ہو گئیں کہ بڑے بھائی شیر اور چھوٹے تو گیدڑ بن گئے ہیں بیوی کے سامنے۔ اسی وجہ سے آج کل وہ بھی شیر بنے ہوئے ہیں۔''

''چل کوئی بات نہیں کبھی کبھی الو بھی تو بن جاتا ہے۔'' بڑی آپا نے گویا تسلی دی۔

''کبھی بھی نہیں آپا اکثر۔'' رضیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے بھئی ماشاء اللہ کافی خصوصیات ہیں تمہارے شوہر میں تو پتا آج چلا ہے۔'' اب آپا بھی مذاق کے موڈ میں آ گئی تھیں اور کبھی میاں جی کو شیر اور کبھی گیدڑ کہہ رہی تھیں۔

## وارداتیں

وہ کم بخت بہت سوشل قسم کے ڈاکو تھے یا پھر بے حد چالباز تھے...ورنہ چلتر تو تھے ہی۔ ان کا واردات کرنے کا طریقہ بڑا مضحکہ خیز اور انوکھا تھا۔ لوگوں کو یوں لوٹتے تھے کہ وہ ان کی رپورٹ تک نہیں کر سکتے۔ اکثر لٹنے والوں کا بارہا یہ دل چاہا تھا کہ ان کی کم از کم ایف آئی آر تو درج کرا ہی دی جائے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور احباب کو ہی لوٹا کرتے تھے یا پھر شاید ابھی ان کا ہاتھ صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے سسرالی رشتے دار تھے اور مجھے ان کی ذات سے دُہرے تو کیا تہرے نقصانات پہنچے تھے، اس لیے بھی میں اپنے میاں کو اکثر سمجھایا کرتی تھی کہ دیکھیے اگر کسی نے ان کو اس طرزِ عمل سے باز نہیں رکھا تو آئندہ کو یہی لوگ شاہراہوں پر دلیری سے ڈکیتیاں کرتے پھریں گے پھر ایک آدھ دفعہ کی بات ہوتی تو کوئی نظر انداز بھی کر دیتا مگر یہ تو ان کا روز مرہ کا معمول بن چکا تھا۔

پہلی دفعہ جب ہماری جیب کٹی تب انہوں نے اپنے نئے مکان پر میلاد کیا تھا۔ سارے عزیز، دوست مٹھائی کے ڈبے، ہار پھول لے کر گئے ہی تھے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اس میلاد میں انہوں نے اپنے لڑکے کے پاس ہونے کا رنگ بھی بھر دیا تھا۔ پاس ہونے کا قضیتا سنا تو مہمانوں کی اکثریت کے چہرے اتر گئے۔ کیا تھا اگر وہ کم بخت فیل ہو جاتا۔ خوامخواہ ہی کسی کی پانچ سو سے جیب کٹی تو کسی کی ہزار سے۔ گھر بھی انہوں نے کالے کوسوں پر بنایا تھا۔ پیٹرول کے بھی علیحدہ پانچ سو روپے خرچ ہوئے جو کسی گنتی میں ہی نہیں تھے پھر اُن کی لڑکی کی منگنی کی تقریب تھی جس ہی سب کے کرنسی کے لفافے منگنی کی دلہن کو دیکھتے ہی یوں پکڑا دیے تھے جیسے کھانا کھانے سے قبل ادائیگی کر دی ہو۔ بے تکی رسموں، فلک شگاف گانوں سے ان کے صرف گھر



کے لوگ ہی خوش ہو رہے تھے۔ مہمان تو تالیاں بھی یوں بجا رہے تھے جیسے اپنا غصہ دکھا رہے ہوں۔ کھانا کھلانے سے قبل انہوں نے پھر شطرنج کی ایک چال چل دی کہ اپنے چھوٹے پوتے سے کیک کٹوا کر اس کی سالگرہ کا اعلان کر دیا اور سب مہمان اپنے پرس یوں کھولنے لگے جیسے میان میں سے تلوار نکال رہے ہوں۔

ہمارے خاندان کا برسوں سے دستور تھا کہ رمضان میں سب کے ہاں ایک ایک دفعہ افطار پارٹی ضرور ہوا کرتی تھی مگر جب ان کا نمبر آیا تو جا کر پتا چلا اس دن انہوں نے اپنے دو چھوٹے نواسوں کی روزہ کشائی بھی ٹھونس لی تھی جس دن ان کے لڑکے کی مہندی تھی اس رات انہوں نے اپنے چار پوتوں کا عقیقہ بھی کر لیا۔ جو مہمان یہ سوچ کر گئے تھے کہ مہندی کا کھانا مفت میں کھا کر آئیں گے انہیں وہ خاصا مہنگا پڑا تھا۔ اب ان کی ساس کی برسی کا بلاوا آیا رکھا ہے اور میرا دل ان کے ہاں جاتے ہوئے یوں ہول رہا ہے کہ کہیں وہ اس میں اپنی شادی کی سلور جوبلی کا اودھم مچا کر میری کرنسی پر ہاتھ صاف نہ کر دیں۔

•••

## عنبر کی ڈھولکی



تیرے بابا نے ہارے ہیں بول۔ بیٹی چاہے شاہ کی ہو یا فقیر کی کون روک پایا ہے۔ اس سے میٹھی شے کیا ہو سکتی ہے پر اس کی ۔۔۔ ڈولی ہی والدین کی اولین خوشی ہے۔ میرے تیرے سے آج مجھے آیا میرے ابا کے گھر، میری امی نے آج مجھے بھیجا ہے ایس سو... میں نے بھی اپنی لاڈلی کی وداعی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلے تو ماں ہی شگن کا دوپٹا پہنا کر کلائیوں میں چوڑیاں سجا کر آنچل کی اوڑھ میں چھپے شرمائے چاند کو دیکھ کر من ہی من میں نہ جانے کتنے ارمان اپنے دل میں بسا لیتی ہے۔ کتنی دعائیں لبوں پر آ کر قبولیت کی منتظر ہوتی ہیں۔ میرے مولا اس کو وہ سب دے جس کی وہ خواہش کرے۔ کوئی چاہ ادھوری نہ رہ جائے۔ باقی تو نصیب کی بات ہے صرف والدین ہی اپنی بیٹی کے لیے چاند سورج ستارے توڑ کر اس کے آنچل میں سجا سکتے ہیں۔ دل کی ہر دھڑکن اپنی بیٹی کی خوشیوں اور چاہتوں کے لیے مولا کے آگے دعا گو ہوتی ہے۔

کاہے کو بیاہی بدیس

تحریر: ہما حبیب، کراچی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# کون کیا کر رہا ہے

مہتاب حسان

## جاوید شیخ

پاکستان فلم انڈسٹری کے سنیئر اداکار اور ہدایت کار جاوید شیخ نے پاکستان میں انڈین فلموں کی نمائش پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور پاکستان فلم سنسر بورڈ کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ میں انڈین فلموں میں کام ضرور کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے اپنے کلچر کو فراموش کر دیا ہے۔ انڈین فلموں میں ایسے نامناسب مناظر موجود ہوتے ہیں جنہیں فیملی کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھا جا سکتا، انہوں نے کہا کہ میں سوچتا ہوں کہ ہمارا معاشرہ کس طرف جا رہا ہے، ہم کیا کر رہے ہیں، آخر کوئی پالیسی تو ہونی چاہیے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو انڈیا میں دکھایا جا رہا ہے اس کو ہم بھی پاکستان میں دکھانا شروع کر دیں۔ انڈیا کا تو اپنا کلچر ہے ان کو یہ سب زیب دیتا ہوگا لیکن یہ ہمیں زیب نہیں دیتا، انڈین فلموں پر پاکستان کے دروازے کھولنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انڈین فلموں کا جو کلچر ہے وہی ہم بھی دکھائیں، ان کا کہنا تھا کہ مجھے خوشی ہوئی کہ فلم دبلی بیلی اور تیرے بن لادن کو پاکستان میں بین کیا گیا کیونکہ ایسی فلمیں پاکستان میں نہیں لگنی چاہئیں، جو ہمارے معاشرے کو خراب کریں۔ جاوید شیخ کا کہنا تھا کہ وہ کئی انڈین

فلموں میں کام کر رہے ہیں اور کئی ڈائریکٹرز کے ساتھ فلموں کی بات چل رہی ہے۔ میں کوئی غیر اخلاقی کام نہیں کرنا چاہتا نہ کروں گا جس سے میرے ملک کا نام بدنام ہو۔

## میرا

اداکارہ میرا کو پرائڈ آف پرفارمنس ملنے کے اعلان پر جہاں ان کے پرستاروں نے خوشی کا اظہار کیا ہے وہاں فلمی حلقوں نے اپنی گہری تشویش ظاہر کی میرا کو یہ خبر اُن کے والد سرور شاہ نے انہیں فون پر دی، میرا یہ اعزاز ملنے پر بہت خوش ہیں ان کا کہنا تھا کہ انہیں یہ اعزاز ان کے پرستاروں کی وجہ سے..... ملا ہے، ناقدین نے میرا کو پرائڈ آف پرفارمنس ملنے پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ میرا نے فلم انڈسٹری میں کون سا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ انہیں یہ ایوارڈ دیا جاتا۔ ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایوارڈ دیتے ہوئے میرا سے بڑی اداکاراؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس بارے میں اداکارہ ریما کا کہنا تھا کہ میں کیا کہوں۔ عوام ہی کچھ کہیں گے، میں پھر بھی انہیں مبارک باد دیتی ہوں، یقیناً حکومت کو میرا میں کوئی ایسی خوبی نظر آئی ہوگی جو اُن کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ہدایت کار و سنگیتا نے کہا کہ کیا پاکستان

کا دوسرا مطلب ہے کہ حقدار کو حق نہ ملے؟ میرا نے میری فلم کھلونا سے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور لگتا ہے کہ اسے کھیل ہی کھیل میں یہ ایوارڈ مل گیا ہے۔ حکومت نے فنونِ لطیفہ کی دیگر شخصیات کو بھی اعزازات سے نوازا، ان میں اداکار جاوید شیخ، ساحرہ کاظمی، نعمان اعجاز، صبا حمید، محسن گیلانی، سکینہ سموں، منصور ملنگی شامل ہیں، ان فنکاروں کو ملنے والے اعزازات اپنی جگہ ٹھیک ہیں اور شکر ہے کہ انہیں اپنی زندگی میں ہی یہ ایوارڈ مل گئے۔

## نور

نیر سے نور نے بہت چپ چاپ انداز میں 32 سالہ بزنس مین عون چوہدری سے دس یا بارہ انتہائی قریبی لوگوں کی موجودگی میں نکاح کیا ان کا حق مہر 25 لاکھ رکھا گیا۔ نور نے وکرم اور فاروق مینگل سے دو شادیوں کی ناکامی کے بعد عون چوہدری سے شادی کی ہے، نور نے اپنے والد شیرار کو اپنا غم گسار بنا رکھا تھا اس لیے جب والد کا انتقال ہوا تو نور کو چپ لگ گئی اور اسی لیے والدہ چاہتی تھیں کہ نور غم کی اس کیفیت سے نکلے، اس کے لیے ہم ٹی وی کا مارننگ شو بہت حد تک مددگار تھا مگر نور کا غم اس سے بھی کم نہ ہوا چنانچہ امیدواروں کی لمبی لسٹ میں سے انتہائی چھان پھٹک کے بعد عون چوہدری سے معاملات طے کرنے کے ساتھ ہی قاضی جی سے نکاح پڑھوا دیا گیا۔

## ریما خان

عید الفطر پر ریلیز ہونے والی فلمیں ریما خان کی لو میں گم، روشن ملک کی نومینشن، فیصل بخاری کی بھائی لوگ اور سید نور کی جگنی کنفرم ہیں۔ جبکہ جرار رضوی کی سن آف پاکستان پرنٹس تیار نہ ہونے کے باعث اب عید الفطر کے بعد ریلیز ہوگی، لو میں گم فلم میں ریما خان کے ساتھ ساتھ ندیم، معمر رانا، جاوید شیخ، نبیل خان اور جوئی لیور شامل ہیں۔ فلم میں نغمہ نگار خواجہ پرویز مرحوم کے تحریر کردہ چار گانے شامل کیے گئے ہیں، جو اُن کی زندگی میں لکھے گئے آخری گانے ہیں ان گانوں میں بھارتی گلوکارہ شریا گھوشال نے 'میری آنکھوں میں سا جا' اور انڈین گلوکار شان نے 'جادو بھری تیری نظر' راحت فتح علی نے 'رہا میرے حال دا محرم توں' گایا ہے۔

## علی ظفر

پاکستانی پاپ سنگر علی ظفر گلوکاری کے ساتھ ساتھ اداکاری میں بھی تیزی سے مقام بنا رہے ہیں، علی ظفر کا کہنا ہے کہ پاکستان فلم انڈسٹری کا حال اتنا برا نہیں جتنا لوگ کہتے ہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ اچھا کام کریں اور اچھی فلمیں بنائیں کیونکہ گھٹیا اور بدمعاش طرز کی فلمیں تو بھارت میں نہیں لگیں گی، عید کے موقع پر بھارت میں پاکستانی فلم 'بول' کی نمائش ہو رہی ہے، یہ اچھی فلم ہے لہٰذا وہاں لگ رہی ہے اس سے پہلے 'خدا کے لیے' لگی تھی۔ پاکستان میں بھارتی فلموں کی نمائش شروع ہوئی تو اچھے سینما بھی بننے لگے اب راول پنڈی، لاہور اور کراچی میں اچھے معیاری سینما بن رہے ہیں اور سینما کلچر پھر سے شروع ہو گیا ہے اس کلچر کو تشکیل پانے کے لیے دو تین سال درکار ہیں۔ عید الفطر پر سلمان خان کی باڈی گارڈ آ رہی ہے اسی وقت بھارت میں 'بول' ریلیز ہو گی، ان کا کہنا تھا کہ اگر انڈسٹری کو بحال کرنا ہے تو ہمیں اپنی سوچ سے فلمیں بنانی ہوں گی۔ فلم 'بول' نے گیارہ روز کا بزنس کیا ہے آپ اچھی فلمیں بنائیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھی فلم تبھی بن سکتی ہے جب ہم انڈین فلم کو کاپی نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ بہت زیادہ ہے، اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، ہمارے لوگوں کو ان جیسے مواقع ملیں تو زبردست کام ہو سکتا ہے، میوزک ہی ایسی چیز ہے جو پاکستانی کلچر کی نمائندگی کر رہا ہے۔ آج بھی انڈیا میں شاہ رخ خان اور سلمان خان کے دفاتر میں چلے جائیں تو وہ لوگ میوزک سن رہے ہوتے ہیں، نصرت فتح علی خان، راحت فتح علی خان، عاطف اسلم، عابدہ پروین نے کوالٹی دی ہے اور اپنے آپ کو منوایا ہے اسی لیے وہ وہاں گا رہے ہیں۔ وہاں ان کو عزت اور پیار ملتا ہے۔ آرٹسٹ کو سیاست سے دور رکھنا چاہیے، آرٹ کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

## ریشم

اداکارہ ریشم نے پاکستان فلم انڈسٹری کے.... ہنرمندوں اور ٹیکنیشنز میں لاکھوں روپے تقسیم کیے۔ ریشم



نے رمضان المبارک میں فلم انڈسٹری کے غریب افراد میں 10 لاکھ روپے تقسیم کیے اس موقع پر ان کی بڑی بہن بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ ریشم کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ رقم تقسیم کر کے کوئی کارنامہ نہیں کیا بلکہ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم لوگ ایسے مواقع پر ان لوگوں کو یاد رکھیں، ان کا کہنا تھا کہ تین لاکھ روپے عبداللہ کادوانی، چار لاکھ روپے خود سے اور تین لاکھ روپے ایک ایسے شخص کی طرف سے تقسیم کیے ہیں جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ باری اسٹوڈیو کے اردگرد کے علاقے میں...... بہت سے ایسے لوگ آباد ہیں جو فلم انڈسٹری سے وابستہ رہے ہیں اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ریشم نے تو اپنا فرض ادا کیا لیکن ان لوگوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ جن لوگوں نے اس انڈسٹری سے اپنا نام اور دولت کمائی ہے، وہ ان مواقع پر ان بے بس اور غریب لوگوں کو یاد رکھیں اور ان کو بھی خوشیوں میں شریک رکھیں۔ بلکہ یہ ہم سب کا فرض ہے۔

## ریکھا بھردواج

صوفی اور ہندی فلموں کی گلوکارہ ریکھا بھردواج کا کہنا ہے کہ موسیقی انجان لوگوں کو بھی آپس میں جوڑ دیتی ہے اور یہ تعلق کبھی کبھی خوب صورت رشتوں میں بھی تبدیل ہو جاتا ہے، نمک عشق کا، رانجھا رانجھا اور سسرال گیندا پھول جیسے مقبول گیت گانے والی ریکھا کا کہنا ہے کہ آج ہم انٹرنیٹ کے ذریعے بہت سارے لوگوں سے جڑ جاتے ہیں، ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنے پاکستانی مداحوں کے حوالے سے کیا ہے انہوں نے کہا کہ خوشی ہوتی ہے جب موسیقی آپ کو نامعلوم لوگوں سے جوڑ دیتی ہے اور وہ تعلق خوب صورت رشتوں میں تبدیل ہو جاتا ہے ویسے تو ریکھا ایک بار ہی پاکستان آئی ہیں لیکن ان کا پاکستان سے رشتہ بچپن سے جڑ گیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے والد موسیقی کا شوق رکھتے تھے انہوں نے دہلی میں اردو کی تعلیم حاصل کی تھی ان کے سب سے اچھے دوست احسان صاحب تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ 1976ء میں جب میں بہت چھوٹی تھی تب احسان صاحب کے بیٹے اور ان کے دوست ہندوستان آئے میں نے ان سے کچھ نغمے سیکھے وہ ان سے جڑنے کا ایک طریقہ تھا، ریکھا خود 2006ء میں کارا فلمی میلے میں شرکت کرنے کے لیے کراچی آئی تھیں جہاں ان کے شوہر اور ہدایت کار وشال بھردواج کی فلم اومکارا دکھائی گئی تھی، اس کے علاوہ گلزار صاحب کے افسانوں پر بننے والی سیریل کہانی سانس لیتی ہے کا ٹائٹل سونگ بھی میں نے گایا تھا۔ مہدی حسن، راشد خان، نور جہاں اور فریدہ خانم ریکھا کے پسندیدہ گلوکار ہیں جبکہ کالج میں انہوں نے نور جہاں کے گانے گا کر کئی ایوارڈز بھی جیتے، احسن کی آشا کے پروگرام میں انہوں نے صنم ماروی کے ساتھ مہو آباد میں اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا، ریکھا قوال مہر علی اور شیر علی کے ساتھ بھی گانا چاہتی ہیں۔



## ودیا بالن

ودیا ملن لتھریا کی 'داؤرٹی پکچر' کر رہی ہے، اس فلم میں ودیا کا کردار ایسا ہے جو کرینہ، کترینا اور پریانکا وغیرہ شاید خوشی سے قبول نہ کرتیں، وہ اب ایک ایسی اسٹیج پر آ گئی ہے کہ اسے شاہ رخ خان، عامر خان، سلمان خان اور اکشے کمار یا ان جیسے کسی ٹاپ اسٹار کی ضرورت نہیں' وہ نصیر الدین شاہ اور ارشد وارثی کے



ساتھ بھی ہٹ فلمیں دے سکتی ہے، دا ڈرٹی پکچر نومبر میں ریلیز ہو رہی ہے لگتا ہے ودیا چھا جائے گی، اپنی اداکاری کے حوالے سے ودیا کا کہنا ہے کہ خود کو بہتر سمجھنا میرا کام نہیں، اس کا فیصلہ لوگ کر سکتے ہیں۔ ہاں الگ ضرور ہوں۔ جب ڈائریکٹر یہ سوچ کر میرے پاس آتے ہیں کہ میں مختلف ہوں اور کسی دوسری اداکارہ کی طرح کام نہیں کروں گی بلکہ ہر طرح کے کردار میں فٹ نظر آنے کی کوشش کروں گی۔ جب آپ کچھ الگ کرنے کی چاہ رکھتے ہیں تبھی پا اور نو ون کلنگ جیسا کام سامنے آتا ہے۔ ودیا کا کہنا تھا کہ جب پا ریلیز ہوئی اور میں نے ممی کے ساتھ تھیٹر میں فلم دیکھی تو فلم ختم ہوتے ہی ممی نے گلے لگا لیا اور کہا کہ میں تمہیں آرو کی ماں کے رول میں اس طرح تصور نہیں کر رہی تھی لیکن تم نے تو مجھے بھی بھلا دیا کہ میری بیٹی ہو فلم دیکھ کر یوں لگا ہے تم بس آرو کی ماں ہو اور کچھ نہیں۔ اب تک کے ایکٹنگ کیریئر میں مجھے اس سے بڑا کامپلیمنٹ کوئی اور نہیں ملا۔ داؤرٹی پکچر میں ودیا ایک گلیمرس کردار ادا کر رہی ہیں اس کردار کے بارے میں ودیا کا کہنا ہے کہ اس میں سلک سمیتا کا کردار اصل ہے۔ یہ کردار ادا کرتے ہوئے میں نے کوشش کی ہے کہ کہیں سے وگر نظر نہ آؤں آپ سیکسی اور وگرسین میں بال برابر فرق پا سکیں گے، تاہم اس کے لیے بہت کنفیوزڈ اور نروس ہوں اور بے صبری سے دیکھنا چاہتی ہوں کہ پبلک کا کیا فیڈ بیک آتا ہے۔

## کترینا

کترینا اپنی بھولی بھالی باتوں کی وجہ سے اکثر پرابلم میں آ جاتی ہیں اس کے لیے یہی اچھا ہے کہ کم بولے بلکہ میڈیا کے سامنے تو بولے ہی نہیں، اسٹار کے منہ سے آواز نکلی نہیں کہ میڈیا والے لے اڑتے ہیں بے چارہ اسٹار صفائیاں دیتے دیتے تھک جاتا ہے۔ جیسا کہ حال ہی میں کسی انٹرویو کے دوران کترینا نے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ ہاف برٹش اور ہاف ایشین ہے تو کیا ہوا، کانگریس کے راہول گاندھی بھی تو ہاف ایشین اور ہاف اٹالین ہیں، پھر تو سیاسی ٹھیکے داروں نے کترینا کے اس بیان کو آڑے ہاتھوں لیا، اس بیان کے اگلے دن کترینا کو خفیہ کال موصول ہوئی جس میں کہا گیا کہ راہول جیسی عظیم شخصیت سے اپنا تقابل نہ کرے ورنہ سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے، کترینا پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا اور کہا کہ بیان کو غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس نے ایسی بات نہیں کی، ادھر کانگریس کے منیش تیواری سے کترینا کے بیان پر تبصرے کو کہا گیا تو ان کا جواب تھا کترینا کیف کون ہیں؟

●●●




Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# سندیسے

## پاکیزہ بہنیں



### احسان

اللہ اور رسول کا فرمان مانیے
تب جا کے آپ خود کو مسلمان جانیے
قسمت سے مل گئی ہے غلامی رسولؐ کی
اس کو خدائے پاک کا احسان جانیے
روشن کو آسرا تو شہہ انبیاءؐ کا ہے
اس کی نجات کا بھی سامان جانیے

مرسلہ: تسنیم چوہدری، یو کے

### وہ لوگ

☆ وہ لوگ کسی کے نہیں ہوتے جو دوست اور رشتے کو لباس کی طرح بدلتے ہیں۔

(حضرت علیؓ)

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

### جسے آنکھوں سے

میں ہوں وہ منجمد دریا جسے سورج پہ چلنا ہے
میں وہ سیل رواں ہوں جسے آنکھوں سے بہنا ہے

مرسلہ: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

### رابطہ کرے

پُرخلوص
پُرمحبت
اپنی سکھی کا خیال کرنے والی
جو تحفے تحائف کی طالب نہ ہو
ایسی دوست چاہیے
جو بہن جیسی ہو

مرسلہ: صبا نور، لیہ

### دلہن

چاندنی اِک
دلہن
گھر سے جاتے سے
سب کو بھول جانا چاہتی ہے
مگر وہ آنسو تا حیات
یاد رہتے ہیں

تحریر: رقیہ مہر اعوان، راولپنڈی

### نمبر

ٹیچر: وہ کون سی عورت ہے جسے ہر وقت پتا ہوتا ہے کہ میرا شوہر کہاں ہے؟

سردار: بیوہ عورت۔

واہ بھئی واہ...... اج تے سردار نمبر لے گیا۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

### تو

سب دو دن کی چاندنی یہ امارتیں یہ وزارتیں
مجھے اس فقیر کی شان دے نہ جس کی مثال دے
میری سحر تیرے سلام سے میری شام تیرے نام سے
تو جسے چاہے عروج دے تو جسے چاہے زوال دے

مرسلہ: روبینہ گل، ہری پور

### محبت تنگ کرتی ہے

فسانے گزری راتوں کے
نگاہوں میں لکھے ہوں گے
تیرے بستر کی سب شکنیں
کہانی کیا سنائیں گی
یہی حالات ہیں جن سے
عداوت تنگ کرتی ہے
میرے ہاتھوں کی ریکھائیں
تیری مرضی سے بنتی ہیں
میرا ہر نقش چاہت کا، تجھے آواز دیتا ہے
ابھی پھولوں کے موسم ہیں
دلوں کی رہنما ہو کر
وفورِ شادمانی میں
عجب سے ڈھنگ کرتی ہے
محبت تنگ کرتی ہے
ڈبو کر مئے کے پیالوں میں
وہ اذنِ بے کشی دے کر
کسی کی یاد سے مہکے
وہ صحنِ دل کو خوشبو سے
مہکتی دلکشی دے کر
لہو کے سنگ کرتی ہے
محبت تنگ کرتی ہے

شاعرہ: ہما شاہ، بہاول نگر

### غزل

ہوسکتا ہے تم کو بھی ہم جیسی محبت ہوجائے
آنکھوں میں ہی پوجنے کی تم کو بھی عادت ہوجائے
راتوں کو پہروں جاگو تم بھی اور تاروں کو بیٹھے گنا کرو
کھانے پینے کا نہ ہوش رہے بال بنائے مدت ہوجائے
گھنٹوں خود کلامی کرو ہر آہٹ پر تمہارا دل دھڑکے
ہمارے جذبے سمجھنے کی کاش تم کو قدرت ہوجائے
طویل سجدے کرو اور مانگو دعائیں رو رو کر
اے خدا! ہم جیسی اُن کی بھی عبادت ہوجائے
میں بن پیے بہک جاؤں خوشبو کی طرح مہک جاؤں
ہوسکتا ہے اُن سے بھی کبھی کوئی ایسی شرارت ہوجائے
میں ساری عمر پوجا کروں من جھکے پلک تکتی رہوں
فقط اِک بار اُن کے من آنگن میں ٹھہرنے کی اجازت ہوجائے
ان کی ہوجائے نظرِ کرم پتھر دل ہوجائے نرم
یا پھر شمائلہ ہم کو ہی ان سے عداوت ہوجائے

شاعرہ: شمائلہ سہیل جاوید، کراچی

●●●





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# خوش ذائقہ

## پاکیزہ بہنیں

### بھنا گوشت

اشیا: گوشت، (بکرے کا) ا کلو۔ پیاز بڑے سائز کی، دو عدد۔ دھنیا پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، ڈھائی چائے کا چمچ۔ گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ قصوری میتھی، ایک چائے کا چمچ۔ کٹی سیاہ مرچ، 1/2 چائے کا چمچ۔ سفید زیرہ پسا، 1/2 چائے کا چمچ۔ نمک حسب ضرورت۔ دہی، ایک کپ۔ ادرک، لہسن، دو کھانے کے چمچ۔ گھی یا تیل، ایک کپ۔ ادرک، ہری مرچ، ہرا دھنیا گارنش کے لیے۔

ترکیب: گوشت کو پہلے بوائل کرلیں، ایک ابال آنے کے بعد پانی پھینک دیں پھر تھوڑے مسالے ڈال کر پانی ڈال دیں اور اتنی دیر بوائل کریں کہ گوشت گل جائے۔ پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ برتن میں گھی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیں گھی گرم ہوجائے تو پیاز ڈال کر براؤن کریں پھر گوشت ڈالیں، ادرک لہسن کا پیسٹ ڈالیں۔ لال مرچ، دھنیا، گرم مسالا، دہی، پسا زیرہ، نمک کالی مرچ کٹی ہوئی، قصوری میتھی ڈالیں اور اچھی طرح بھون لیں جب اچھی طرح مسالا اور گوشت بھن جائے تو ہرا دھنیا، ہری مرچ اور کٹی ہوئی ادرک ڈالیں۔

طارم مہدی، کراچی

### گلاوٹ کا قیمہ

قیمہ، (گائے، بکرا، مرغی) ایک کلو۔ پپیتا، (تھوڑا سا پکا ہوا) تین کھانے کے چمچ۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ، تین کھانے کے چمچ۔ ثابت مرچ، بھون کر پیس لیں، دو کھانے کے چمچ۔ بھنا پسا بیسن، دو کھانے کے چمچ۔ گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ دہی، ایک کپ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تیل، 1/2 کپ۔ پیاز، بڑی دو عدد باریک کاٹ لیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں، پیاز کے لچھے۔

ترکیب: قیمے میں دہی، پپیتا، ادرک، لہسن کا پیسٹ، لال مرچ، دھنیا، زیرہ، گرم مسالا، نمک اور بیسن سب ڈال کر مکس کرلیں اور دو سے تین گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ برتن میں تیل ڈال کر چولھے پر رکھیں۔ تیل گرم ہوجائے تو پیاز ڈال کر براؤن کرلیں اور ساتھ ہی قیمہ ڈالیں اور اچھی طرح بھون لیں جب قیمہ تیل چھوڑنے لگے تو اتار لیں۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا، لیموں اور پیاز کے لچھوں سے گارنش کریں، پراٹھے یا چپاتی کے ساتھ تناول فرمائیں۔

شازیہ افضل، کراچی

### مچھلی کے کباب

اشیا: مچھلی، ایک کلو۔ گھی، ایک پیالی۔ پیاز، آدھا پاؤ۔ دہی، آدھا پاؤ۔ بادام، ایک بڑا چمچ۔ کھوپرا، تل، خشخاش، ایک بڑا چمچ۔ سرخ مرچ، ایک بڑا چمچ۔ ادرک اور لہسن، دو چھوٹے چمچ۔ ہلدی، نصف چھوٹا چمچ۔ نمک، دو چھوٹے چمچ۔ ہری مرچیں، پانچ عدد۔ ہرا دھنیا، آدھی گٹھی۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔

ترکیب: سب سے پہلے مچھلی دھو کر ٹکڑوں میں کاٹ کر ان میں پسا ہوا مسالا، ادرک، لہسن، نمک، ہلدی لگا کر دو پیالی پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیں۔ جب مچھلی گل جائے اور خشک ہوجائے تو اتار کر مچھلی کے سارے کانٹے نکال دیں اور پھر اسے سل پر باریک پیس لیں۔ مسالا (بھون کر پیسا جائے تو اچھا ہوگا) مچھلی اور دہی ملا کر گولے بنائیں ایک فرائی پین میں گھی گرم کرکے ان کبابوں کو بادامی تل لیں۔

دانیہ شیخ، لاہور

### زعفرانی کوفتے

اشیا: قیمہ باریک بغیر چربی کا، آدھا کلو۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، آدھا پاؤ۔ گھی، ایک پاؤ۔ ادرک، آدھا چھٹانک۔ لہسن، آٹھ جوے۔ چنے بھنے ہوئے، نصف چھٹانک۔ خشخاش، نصف چھٹانک۔ ہرا دھنیا، حسب ضرورت۔ ہری مرچ، حسب ضرورت۔ گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ زعفران، چوتھائی چائے کا چمچ۔ کیوڑہ تھوڑا سا۔

ترکیب: قیمہ آدھا ابال لیں اور کچا قیمہ اور ابلا قیمہ ملا کر باریک پیس لیں۔ اس میں نمک، مرچ، گرم مسالا، چنے اور خشخاش سب باریک پیس کر ملالیں۔ پیاز باریک لچھے دار کاٹ لیں اور ادرک، دھنیا، پودینہ، ہری مرچ باریک کتر کر سب کو ملا کر رکھ لیں۔ اب پسا ہوا قیمہ لے کر اس کے گول یا چپٹے کوفتے بنائیں اور ان کے بیچ (پیٹ) میں یہ مسالا بھردیں اور پردہ لگا لپیٹ دیں تاکہ ٹوٹیں نہیں۔ اب یہ کوفتے گھی میں سرخ کرلیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ کر گھی میں تل لیں باقی سامان کا شوربہ تیار کرلیں تو اس میں زعفران، کیوڑے میں ملا کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی کوفتے دیگچی میں رکھ کر چند منٹ کے لیے ڈھانپ دیں۔ پندرہ منٹ کے بعد اتارلیں۔

فوزیہ مشتاق، حیدرآباد

### سبزیوں کے سیخ کباب

اشیا: گاجر، 500 گرام۔ بھٹے کے دانے، 250 گرام۔ آلو، 250 گرام۔ مٹر، 150 گرام۔ سیم کے دانے، 250 گرام۔ ادرک، 50 گرام۔ لہسن، 50 گرام۔ ہری مرچیں، 50 گرام۔ نمک اور سرخ مرچ، ایک ایک چائے کا چمچ۔ ڈبل روٹی کا چورا، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: بھٹے کے دانے، آلو، سیم کے دانے، گاجر اور مٹر ہلکا سا ابال لیں۔ پھر ٹھنڈا کرکے آپس میں اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب اس میں نمک، سرخ مرچ، ڈبل روٹی کا چورا، لہسن، ادرک اور ہری مرچ ملادیں اور اچھی طرح تمام اجزا کو آپس میں مکس کریں۔ اب آپ سیخ پر لگائیں اور کوئلوں پر سینک لیں اگر آپ چاہیں تو ان کبابوں کو تل بھی سکتی ہیں۔ جب کباب تیار ہوجائیں تو کٹے ہوئے لیموں اور پیاز کے ساتھ گرم گرم نوش کریں۔

عمیرہ خان، کوئٹہ

### کریمی پوٹاٹو سیلڈ

اشیا: چکن، ایک پاؤ بغیر ہڈی۔ گھی (تلنے کے لیے) ایک پیالی۔ آلو، آدھا کلو۔ بند گوبھی، آدھا پھول۔ ہری پیاز، دو عدد۔ انڈے، دو عدد۔ کریم، ایک بڑا چمچ۔ دودھ، ایک پاؤ۔

ترکیب: سب سے پہلے ایک پاؤ چکن بغیر ہڈی کی لے کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں اور گھی میں تل لیں۔ آدھا کلو آلو لے کر انہیں کیوبز کی شکل میں کاٹ کر نمک ڈال کر پانی میں ابال لیں۔ بند گوبھی اور ہری پیاز باریک کاٹ لیں۔ انڈوں کو ابال کر کاٹ کر رکھ لیں۔ پھر ان سب چیزوں کو مکس کرکے اس کے اوپر کریم اور دودھ ڈال دیں۔ مزے دار سیلڈ تیار ہے۔ خود بھی کھائیں اور مہمانوں کو بھی پیش کریں۔

بانیہ، کراچی





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# روحانی مشورے

ادارہ

## شوگر سے بچاؤ کے آزمودہ نسخے

(۱) دار چینی ، سونف، ثابت دھنیا تینوں چیزیں ہم وزن لے لیں یعنی جتنی دار چینی لیں اسی کے برابر سونف اور دھنیا لیں۔ تینوں چیزیں توے پر ہلکا سا بھون کر گرینڈر میں پیس کر شیشی میں رکھ لیں۔ اس شیشی پر یعنی اس سفوف پر 41 بار سورۂ فاتحہ اول و آخر گیارہ گیارہ بار درود ابراہیمی پھونک کر رکھ دیں۔ ناشتے سے پہلے ایک چائے کی چمچی کھالیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتا کرلیں۔ آپ کی شوگر انشاءاللہ نارمل رہے گی۔ وہ لوگ جن کو نئی نئی شوگر شروع ہوئی ہو ان کے لیے تو یہ بہترین نسخہ ہے بغیر کسی دوا کے وہ انشاء اللہ ٹھیک رہیں گے۔

(۲)۔ اصلی عرقِ گلاب کی ایک شیشی لے لیں۔ اس پر کثرت سے درود ابراہیمی پڑھ کر دم کریں۔ صبح نہار منہ آدھے گلاس پانی میں دو چمچے عرقِ گلاب کے ملا کر پی لیں۔ انشاءاللہ آپ کی شوگر ضرور ٹھیک ہوگی کہ اس نسخے کی کسی ..... دین دار شخص کو بشارت ہوئی تھی، جس سے اس کی شوگر ٹھیک ہوگئی تھی۔ ہمیں یہ نسخہ ہماری ایک قاری بہن نے اس وجہ سے بتایا کہ اسے معلوم ہے کہ انجم باجی اسے آگے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بتائیں گی۔

(۳)۔ دانہ میتھی ایک چھٹانک کے قریب صاف کرکے باریک پیس کر ایک شیشی میں رکھ دیں۔ اس سفوف پر 41 بار سورۂ فاتحہ اول و آخر گیارہ، گیارہ بار درود ابراہیمی دم کرکے صبح نہار منہ ایک چائے کی چمچی کھائیں۔ ضرور افاقہ ہوگا۔

(۴)۔ ناشتا، کھانا اور رات کے کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر ایک مٹھی بھنے ہوئے چنے چھلکے سمیت کھالیں۔ اس سے شوگر اور کولسٹرول دونوں میں افاقہ ہوگا۔

(۵)۔ کالے چھولے صاف کرکے سارا دن بھگودیں۔ رات کو ایک کپ پانی میں ایک مٹھی کالے چھولے جو سارے دن بھیگے رہے تھے۔ اسے فریج میں رکھ دیں۔ صبح نہار منہ تین بار سورۂ فاتحہ پڑھ کر کپ کا پانی پھینک کر جتنے چنے کھا سکتے ہیں کھالیں۔ کچھ دیر بعد ناشتا کریں۔ شوگر کے مرض میں افاقہ ہوگا۔

(۶)۔ شوگر کے لیے دعائے خیر

رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ؕ

ترجمہ: اے میرے رب! مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچا نکالنا اور عطا کردے مجھ کو اپنے پاس سے حکومتی مدد۔

(سورۂ اسرائیل، آیت نمبر 80)

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد تین بار یہ دعا اول و آخر درود ابراہیمی کے ساتھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیں۔ چالیس دن تک کریں۔ آپ کی کتنی ہی زیادہ شوگر کیوں نہ ہو اس دعا کے طفیل نارمل ہوجائے



گی، انشاءاللہ۔

(۷)۔ دانہ میتھی، کلونجی برابر لے لیں یعنی اگر آدھا کپ دانہ میتھی لیں تو آدھا کپ کلونجی دونوں کو ملا کر ایک شیشی میں رکھ لیں۔ اس پر 41 مرتبہ سورۂ فاتحہ اول و آخر درود ابراہیمی پڑھ کر دم کردیں۔ صبح نہار منہ آدھی چائے کی چمچی یہ دانے چبالیں۔ اس کے بعد ناشتا کریں۔ انشاءاللہ 40 دن کے اندر اندر آپ کی شوگر نارمل رہے گی۔

## شوگر کے مرض کا آسان ترین علاج

جس کسی کو شوگر جیسا مہلک مرض لاحق ہوگیا ہو اور کسی قسم کی دوا وغیرہ اسے فائدہ نہ دے رہی ہو تو اسے اس عمل سے فیض یاب ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے سورۂ اخلاص تین مرتبہ اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود پاک پڑھ کر مریض پر دم کریں۔ دن میں تین مرتبہ یہ عمل دہرائیں انشاءاللہ اس مرض سے نجات مل جائے گی۔

## بواسیر، شوگر، بلڈ پریشر

(۱) یامالکُ یا قدوسُ روزانہ بعد نمازِ فجر 33 مرتبہ اول آخر درود پاک کے ساتھ درود پاک 7+7 مرتبہ دونوں اسم اعظم ملا کر 33 بار پڑھنے ہیں۔ مٹی کے ایک کورے پیالے میں پانی رکھ کر بعد از نمازِ فجر درود پاک کے ساتھ ایک تسبیح اسم اعظم یا مالک یا قدوس پڑھ کر دم کریں اور سارا دن یہی پانی استعمال کریں۔ مدت 21 روز کے بعد انشاءاللہ چھٹکارا مل جائے گا۔ نماز کی پابندی لازمی ہے۔

(۲) اگر یاباریُ کے ساتھ یامحیُ ملا کر کیا جائے تو اس کے اثرات اور بھی قوی ہوجاتے ہیں۔ جس کو شوگر ہو اسے چاہیے کہ یاباریُ یا محیُ 1100 مرتبہ روزانہ پڑھے درود پاک 11+11 مرتبہ اول و آخر پڑھیں اور پانی کا ایک گلاس سامنے رکھ لیں مقرر تعداد میں پڑھنے کے بعد اس پانی پر دم کریں اور وہی پانی سارا دن پئیں اور مزید پانی ملاتے رہیں۔ مدت 40 دن انشاءاللہ بگڑا ہوا لبلبہ درست ہوکر کام کرنا شروع کردے۔ جتنے زیادہ یقین کے ساتھ کریں گے اللہ تعالیٰ جلد شفا عطا فرمائے گا۔ جنھیں شوگر ہو وہ خالص گندم کے 10 کلو آٹے میں ایک کلو کالے چنے بھونے ہوئے پسوا کر اس آٹے کی روٹی پکا کر کھائیں۔

## شادی ہونا جب مسئلہ بن جائے

رشتے آتے ہیں، دیکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں اور پھر واپس پلٹ کر نہیں آتے۔ ایسا تو اب اکثر گھرانوں میں ہو رہا ہے مگر شادی طے کرنے کے بعد بھی اکثر لوگ بھاگ رہے ہیں دراصل خوب سے خوب تر کی تلاش نے لوگوں کو پاگل بنا رکھا ہے۔ وہ لڑکیاں جن کی شادی کسی مسئلے سے کم نہیں یا وہ لڑکے جن کی من پسند شادیوں میں خواہ مخواہ کے روڑے اٹک رہے ہوں۔ وہ سب اس روحانی علاج سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آپ سب عشا کی نماز کی ادائیگی کے بعد ایک سو گیارہ مرتبہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر 189 اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود ابراہیمی پڑھیں اور اپنے لیے دعا کریں کہ بہتر سے بہتر جگہ پر آپ کی شادی ہو۔ چلتے پھرتے ..... وضو بے وضو ہر وقت یاوہاب کا ورد کریں۔ آپ دو رکعت نمازِ حاجت برائے شادی بھی کسی وقت ادا کرسکتے ہیں۔ یہ عمل کم از کم تین ماہ تک کریں۔ انشاءاللہ آپ کی مراد برآئے گی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

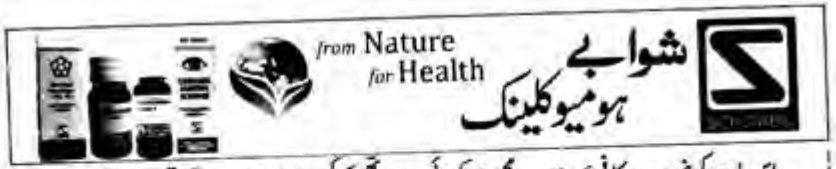

# شوابے ہومیو کلینک



from Nature for Health

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

## ہومیو پیتھی ایک جدید سائنٹیفک طریقہ علاج ہے!

کیا یہ سستا/ موثر/ آسان اور بیماریوں میں مستقل طور پر شفا دینے والا علاج ہے؟ کیا اس میں موذی و مہلک بیماریوں کا علاج ہے؟ اس علاج میں صحت یابی جلد ہوتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات یقیناً آپ کے ذہنوں میں گردش کر رہے ہوں گے یا کریں گے جب آپ لفظ ہومیو پیتھی سنیں گے۔ قبل اس کے کہ ہم آپ کو ہومیو پیتھی کے بارے میں کچھ بتائیں بہتر ہوگا کہ آپ اس کی خصوصیات کو سمجھیں اس کے بعد آپ اچھی طرح سمجھ سکیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ علاج کیوں دیا۔ اس کی خصوصیات و افادیت کو سمجھنے کے لیے ایک بیمار آدمی کی ذہنی کیفیات کا اندازہ کریں کہ وہ اپنی بیماری سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا چاہتا ہے۔

1۔ دوا بے ضرر ہو یعنی اس کے کسی بھی قسم کے کوئی ثانوی (Secondary) یا بد اثرات (Side Effects) نہ ہوں۔

2۔ دوا کھانے میں اچھی ہو نہ کہ کڑوی کسیلی یا بدذائقہ۔

3۔ اس کی مقدار بھی قلیل ہو اور کھانے کا طریقہ بھی سہل ہو۔ ہر وقت ہر جگہ استعمال کی جا سکے۔

4۔ ہر تکلیف (مثلاً سر درد، ہائی بلڈ پریشر، نیند کی کمی، بے چینی وغیرہ) کے لئے علیحدہ علیحدہ دوا کے بجائے صرف ایک دوا ایسی ہو جو تمام شکایتوں کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

5۔ دوائیں ارزاں ہوں تاکہ ہر کوئی بلا تکلف فائدہ اٹھا سکے۔

6۔ نشتر زنی اور عمل جراحی (operation) سے جہاں تک ممکن ہو بچا جا سکے اور صرف دواؤں کے ذریعے علاج ممکن ہو جائے۔ (ناسلور، ناک کا گوشت، رسولی، گردے، پتے کی پتھریاں، وغیرہ)۔

7۔ بیماری کا بار بار اعادہ نہ ہو۔ یعنی ایک دفعہ مکمل شفایاب ہونے کے بعد پھر وہ مرض دوبارہ پلٹ کر نہ آئے۔

8۔ موروثی بیماریاں نہ صرف دور ہو جائیں بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ان سے بچایا جا سکے۔

9۔ ایمرجنسی اور فرسٹ ایڈ کے طور پر بھرپور کام کرتی ہوں (درد سر، بلڈ پریشر، دل کے درد وغیرہ)

10۔ اور سب سے اہم بات مرض سے جلد سے جلد چھٹکارا دلائے۔

اب ذرا حقیقت سے اور خالص انسانی نقطہ نظر سے جائزہ لیں اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ کون سا طریقہ علاج ایسا ہے جو کہ ایک مریض کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق ہوتا ہے؟ یقیناً بغیر کسی تعصب کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

''ہومیو پیتھی اور صرف ہومیو پیتھی ہی وہ آسان، سادہ، فطری (natural) بے ضرر، ارزاں اور جامع طریقہ علاج ہے جو ایک بیمار کے معیار پر پورا اترتا ہے اور اس کو مکمل، جلد، نرم طریق پر مستقل شفا سے ہمکنار کر دیتا ہے۔''

یہ ہومیو پیتھی کی عموی تعریف ہے۔ اب آپ لفظ ہومیو پیتھی پر غور کریں۔ یہ دو لفظوں کا مجموعہ ہے ''ہومیو'' اور ''پیتھی''۔ ''ہومیو'' کا مطلب یکساں (Similar) اور ''پیتھی'' کے معنی علاج کے ہیں۔ اس لیے ہومیو پیتھی علاج بالمثل ہوا۔ علاج بالمثل کو سمجھنے کے لیے آپ کو میں ایک سچا واقعہ بتاؤں جو اس طریقہ علاج کی دریافت کا باعث بنا۔

براعظم یورپ کے ملک جرمنی کے شہر لیزگ کا ایک ماہر و معروف ڈاکٹر کرسچن فریڈرک سموئیل ہانمن نے دیکھا کہ مروجہ علاج (ایلو پیتھک) انتہائی تکلیف دہ اور دوائی کھلانے کے بعد اس کے بد اثرات (Side Effects) بہت شدید ہوتے ہیں اور مریض کا مرض یا تو دب جاتا ہے یا پھر دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے اور بعض اوقات تو موت تک واقع ہو جاتی ہے۔ وہ اس بات سے بھی خائف تھے کہ ہم جو بھی ادویات استعمال کرتے ہیں اور مرض کی جو بھی توجیہات بیان یا پیش کرتے ہیں وہ بے معنی، بے اصولی اور بغیر کسی تحقیق کے صرف قیاس آرائیوں اور اندازوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جب انتہائی توجہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا علاج کرنے کے باوجود ان کی پیاری بیٹی موت کے منہ میں چلی گئی تو ڈاکٹر ہانمن نے اپنی چلتی ہوئی پریکٹس چھوڑ دی۔ یہ 1785 کا زمانہ تھا۔ ہانمن کیونکہ ماہر لسانیات بھی تھے لہٰذا پریکٹس چھوڑنے کے بعد انہوں نے ترجموں کا کام شروع کر دیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ بیماری جس طرح قدرت کی طرف سے آتی ہے تو شفا کے لیے بھی قدرتی طریقہ ہوگا۔ یہاں

SCHWABE


## ٹوکن
## برائے شوابے ہومیو کلینک
نومبر 2011

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:






Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اللہ نے ان کی مدد کی۔ یہ 1790 کی بات ہے جب وہ پروفیسر کیولن کی میٹریا میڈیکا کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہے تھے۔ اس میں ایک جملہ ''سنکونا کی چھال کونین) (Quinine/cinchona/ peruvain 'bark) لرزہ کے (ملیریا) بخار میں کام آتی ہے'' ہانمن کے دماغ میں ہلچل مچا دی کہ پروفیسر کیولن نے یہ بات کیسے لکھ دی؟ اس کی صداقت کو جانچنے کے لیے ان کے دماغ میں ایک عجیب ترکیب آئی کہ کیوں نہ سنکونا کی چھال کو صحت مند انسانی جسم پر استعمال کریں تو شاید اصولِ علاج کا کچھ علم ہو سکے۔ انہوں نے سنکونا کے چھلکے کو خود کھانے کا فیصلہ کیا اور روزانہ آدھ اونس سنکونا کا چھلکا کھانا شروع کر دیا۔ 20 روز تک کوئی قابلِ ذکر علامت پیدا نہیں ہوئی، 21 ویں دن ملیریا بخار کی علامات نمودار ہونا شروع ہو گئیں اور جب اس کو کھانا چھوڑا تو پھر وہ اپنی اصل حالتِ صحت میں واپس آنا شروع ہو گئے۔ اس تجربے کو مختلف وقفوں کے بعد 2 مرتبہ مزید دہرایا اور جب ہمیشہ ایک جیسی کیفیات پیدا ہوئیں تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ

اول: پروفیسر کیولن کی یہ بات کہ سنکونا کی چھال لرزہ کو شفا بخشتی ہے بالکل صحیح ہے۔

دوم: یہ تندرست انسان میں ایسی ہی علامات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جیسا کہ بیماری میں۔ اس کے بعد مزید 6 سال تک وہ مختلف ادویات کو اپنے جسم پر آزماتے رہے اور ان اثرات کو نوٹ کرتے رہے اور بالآخر ان طویل صبر آزما اور جاں گسل تجربات و مشاہدات کے ذریعے ایک ایسے نتیجے پر پہنچے جو ہومیو پیتھی کی بنیاد بنی۔

اپنی اس تحقیق کو انہوں نے 1796 میں Hufeland's Journal میں بعنوان Ona new principal for Acertaing the Curative Properties of Drugs (ادویات کی شفایابی کی خاصیتوں کے اصول) میں انہوں نے ہومیو پیتھی کا اصول علاج بیان کیا کہ ''ادویات صرف انہی امراض کو شفا بخشتی ہیں جو کہ وہ ایک تندرست انسان میں وہی مصنوعی (ادویاتی) مرض پیدا کر سکیں''۔

اس کو ڈاکٹر ہانمن نے Similia Similibus Curentur or Let Likes be cured By like کا نام دیا۔ یعنی جو مرض اس وقت بیمار آدمی میں ہے وہ اسی وقت ٹھیک ہو سکتا ہے جبکہ اسے ایسی دوا دی جائے جو کہ اس سے پہلے ایک صحت مند انسان میں ویسا ہی ادویاتی مرض پیدا کر چکی ہو۔

اس نظریہ کی بڑی مخالفت کی گئی کہ انہیں لیپزگ چھوڑ کر کٹھن ہجرت کرنا پڑی لیکن مردِ حق نے باطل نظریات کے آگے سر نہ جھکایا وہاں وہ اس کی کامیاب پریکٹس کرنے لگے۔ لیکن ایک مشکل یہ پیش آئی کہ بیماری تو ٹھیک ہو جاتی تھی لیکن دوا کے اثرات باقی رہ جاتے تھے۔ اس مشکل کو بھی انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے اپنے تجربات کی روشنی میں حل کر دیا۔ انہوں نے ادویات کو بنانے کا ایک خاص طریقہ Potentisation متعارف کرایا کہ اس میں دوا کی مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے جو عام سی مائیکرو اسکوپ سے نہیں دیکھی جا سکتی لیکن اس کی شفایابی قوت کئی گناہ بڑھ جاتی ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لیے یہاں ایک بہت عام چیز نمک' جی ہاں کھانے کا نمک NaCl سوڈیم کلورائیڈ جو عام طور پر ڈریس میں نمکیات کی کمی دور کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن جب اسی کو پوٹنٹائز کیا جاتا ہے



تو اس کی شفایابی کا ایک عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سر کے بالوں سے لے کر پیر کے ناخن تک باکمال دوائی بن جاتی ہے۔

## ہومیو پیتھی میں نظریہ بیماری اور نظریہ شفا

طب کی دنیا میں یہ ڈاکٹر ہانمن تھے جنہوں نے یہ باور کروایا کہ انسان جسم اور روح کا مرکب ہے۔ روح وہ چیز ہے جو پورے جسم کو کنٹرول کرتی ہے اور یہی سب سے پہلے بیمار ہوتی ہے، جسم آخر میں۔

روح لطیف اور غیر مادی ہے اس کی غذا بھی غیر مادی ہے (مثلاً نماز، روزہ، اللہ کا ذکر اچھی سوچ اچھے خیالات اور اچھے کام ان سب چیزوں سے یہ تر و توانا ہوتی ہے جبکہ فکر، غم، غصہ، افسوس، غلط سوچ اور غلط کاموں سے یہ متاثر ہوتی ہے)۔ قوتِ حیات جو اس کی ایک شکل ہے متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا اظہار پہلے بے چینی، گھبراہٹ، نیند کی کمی اور بعد میں خارش تیزابیت وغیرہ کی شکل میں علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ بغیر کسی دوا (ہومیو پیتھک) جاری رہے تو پھر بیماری جسم پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جسم کی ساختی و فعلیاتی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ جس طرح روح ایک غیر مادی ہے اسی طرح بیماری بھی لہٰذا اس کو درست کرنے کے لیے ہمیں جس دوا کی ضرورت ہوگی اس میں ایسی قوت ہو جو اس غیر مادی بیماری کو دور کرے۔ ہومیو پیتھک دوا جس کو پوٹنٹائز کر کے اس کی غیر مادی شفائی قوت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے وہ قوتِ حیات کی مدد کرتی ہے کہ وہ اس بیماری کے خلاف کام کرے جو کہ جسم میں گھس آئی ہے اور اس طرح بار بار دوا کے دہرانے سے قوتِ حیات طاقتور ہو جاتی ہے اور بیماری کمزور اور بہت جلد ایسا موقع آتا ہے کہ بیماری جسم سے دفع ہو جاتی ہے اور قوتِ حیات واپس اپنی اصلی حالت میں لوٹ آتی ہے اس طرح جسم کمزور نہیں پڑتا اور اسی وجہ سے بیماری کا بار بار اعادہ بھی نہیں ہوتا۔

SCHWABE

## طبی مشورے

### چہرے پر بال اور لیٹ ماہواری

میری عمر 32 سال ہے میں خلع یافتہ ہوں اور دوسری جگہ شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ماہواری 10 سال سے ایک مہینا آتی ہے اور 2 مہینے نہیں آتی جس کی وجہ سے میرے جسم خاص طور پر چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں جب نکالوں تو خون نکلتا ہے اور جگہ کالی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے کسی پارٹی میں نہیں جا سکتی، مہربانی کر کے کوئی اچھی دوائی بتا دیں جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی دکھی بہن کی فریاد ہے۔ میرا مسئلہ ضرور شائع کریں۔ (سمیرا۔ لاہور)

جواب: اللہ آپ کو صحت دے آمین۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Carb 200 کے 5 قطرے ہفتے میں ایک دفعہ لیں جبکہ روزانہ Pulsatilla 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ اور Oleum Jec30 کے بھی 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں ایک گھونٹ پانی میں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

### قد اور جسم پر بال

مسئلہ میری بچی کا ہے جس کی عمر ساڑھے نو سال ہے۔ میری بچی کے پورے جسم پر بال ہیں، پیدائش کے وقت رُواں تھا جوں جوں بڑی ہوتی گئی کالے اور لمبے بال ہو گئے۔ ٹانگوں پر رانوں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بال ہیں، زیادہ بازو پر ہیں اور گھنے بھی جو کہ بچی بھی اب محسوس کرتی ہے۔ میری بچی کا دوسرا مسئلہ قد کا ہے۔ (یاسمین مسعود۔ اسلام آباد)

جواب: یاسمین مسعود صاحبہ آپ اپنی بچی کی غذا کا خیال رکھیں' اس کو متوازن غذا دیں ورزش کرائیں یا کھیل کود کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Calc Carb 200 کے 4 قطرے تھوڑے سے پانی میں ایک دن چھوڑ کر دیں اور اسی کمپنی کی دوا Acid Phos 30 کے 5 قطرے تھوڑے سے پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں 3 ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

## دل، جوڑوں کا درد اور پراسٹیٹ

میں پاکیزہ کا دیرینہ قاری ہوں اور بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ شوابے ہومیو کلینک جرمنی کے متعلق پاکیزہ کے گزشتہ شمارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ایک Expert Panel of Homoeo Physicians پر مشتمل ہے جس میں انتہائی تجربہ کار ڈاکٹرز شامل ہیں تاکہ وہ لوگوں کی ہر وقت صحیح رہنمائی کر سکیں' پیچیدہ امراض کے سلسلے میں اور تشخیص صحیح ہو سکے اور صحیح ادویات انہیں میسر آ سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی کاوش کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے۔ آمین۔ میرے بھی صحت سے متعلق مسائل ہیں جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ آپ ان کو Study کر کے بیماری کی صحیح تشخص کریں گے اور مجھے پراسٹیٹ (Prostate) کی تکلیف ہے میں اس ملک یعنی برطانیہ میں رہتا ہوں۔ میری دوسری بیماری Arteriosclerosis ہے۔ ایک اور صحت کی پرابلم یہ ہے کہ مجھے Mild-Arthritis ہے۔ گردوں کے اطراف میں اور کندھوں میں اور یہ درد جگہ بدلتا رہتا ہے' Hip کی طرف بھی اور کولہوں کی طرف بھی Travel کرتا ہے۔ اور کلائیوں کے جوڑوں میں بھی درد اور اینٹھن ہوتی ہے۔ (ایچ ایم سرے انگلینڈ)

جواب: محترم جناب ایچ ایم صاحب ورزش کو معمول بنائیں ایسی غذا کا استعمال کریں جو مرغن نہ ہوں (Lowfats) اور کم نشاستہ والی Low Carbohydrate کی ہو Low Protein بھی ہو آپ کے لیے سبزیاں اور فروٹس بہتر رہیں گے۔ دالیں اور چاول بھی لے سکتے ہیں۔ پانی کا استعمال بھی کم از کم 8 گلاس روزانہ کریں۔ جو ادویات آپ استعمال کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی یہ ادویات ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔ Prostakan کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں جبکہ Aurum Jodatum PTK 13 کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ چبا کر کھائیں اور Rhustox-200 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر روز صبح لیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk